تحذیر المسلمین

عن

کید الکاذبین

افادات

حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب

رحمۃ اللہ علیہ

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ
زمر ۱۸-۱۷
کتابخانه عقیده
www.aqeedeh.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿١﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢﴾ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣﴾

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿٥﴾

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿٦﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ

عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿٧﴾

یہ کتاب، عقیدہ لائبریری

(www.aqeedeh.com)

سے ڈانلوڈ کی گئی ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحذیر المسلمین

عن

کید الکاذبین

تالیف

حضرت العلامہ مولانا اللہ یار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مدنی کتب خانہ

گنپت روڈ لاہور ۲

تعداد — ۵۰ سو صرف

پرنٹرز — عاشق عارف پرنٹرز لاہور

ہدیہ — ۴۸ روپے

ناشر — مدنی کُتب خانہ لاہور ۲

کتب حوالہ

۱۔ الملل والنحل ۔ شہرستانی

۲۔ اصول کافی ۔ طبع لکھنؤ

۳۔ کتاب الغیبۃ۔ علامہ طوسی

۴۔ نقد المحصل

۵۔ انوار نعمانیہ۔ محدث الجزائری

۶۔ اساس الاصول۔ طبع ۱۳۰۴ھ

۷۔ استقصاء الافحام۔ علامہ مجلسی

۸۔ رجال کشی ۔ طبع ایران

۹۔ حیات القلوب

۱۰۔ حملۂ حیدری۔ علامہ باذل

۱۱۔ مختصر بصائر الدرجات

۱۲۔ روضہ کافی

۱۳۔ کشف الغمہ

۱۴۔ علل الشرائع

۱۵۔ مناقب شہر ابن آشوب

۱۶۔ اصول کافی معہ شرح صافی

۱۷۔ تفسیر عیاشی

۱۸۔ تفسیر صافی

۱۹۔ فصل الخطاب

۲۰۔ احتجاجِ طبرسی

۲۱۔ حق الیقین

۲۲۔ فروع کافی۔ طبع لکھنؤ

۲۳۔ ذبح عظیم

۲۴۔ خلاصۃ المصائب

۲۵۔ جلاء العیون

۲۶۔ مجالس المؤمنین

۲۷۔ نہج الاحزان طبع ایران

۲۸۔ تلخیص شافی

۲۹۔ الاستغاثۃ فی بدع الثلاثۃ

۳۰۔ فلک النجات

۳۱۔ کتاب سلیم بن قیس ہلالی

۳۲۔ درۃ النجفیہ

۳۳۔ مجمع البحار

۳۴۔ احقاق الحق

۳۵۔ المناقب الخوارزمی طبع عراق

۳۶۔ تفسیر امام حسن عسکری طبع ایران

۳۷۔ تفسیر قمی
۳۸۔ تفسیر فرات بن ابراہیم
۳۹۔ کشف الغین
۴۰۔ الرسالۃ الموضحہ
۴۱۔ بحار الانوار
۴۲۔ نہج البلاغہ معہ شرح میثم بحرانی
۴۳۔ کنز العرفان
۴۴۔ حدیدی شرح نہج البلاغہ
۴۵۔ منتہی الآمال
۴۶۔ الطراز المذہب مظفری
۴۷۔ ناسخ التواریخ
۴۸۔ تفسیر مجمع البیان
۴۹۔ کتاب المیزان طباطبائی
۵۰۔ تفسیر اتقان
۵۱۔ نامی شرح حسامی
۵۲۔ التوضیح والتلویح
۵۳۔ تفسیر کبیر امام رازی
۵۴۔ تفسیر مظہری
۵۵۔ المنجد
۵۶۔ تفسیر روح المعانی
۵۷۔ لسان العرب
۵۸۔ تاج العروس
۵۹۔ تصحیح اغلاط
۶۰۔ فتح الباری
۶۱۔ اللآلی المصنوعہ
۶۲۔ میزان الاعتدال
۶۳۔ اشعۃ اللمعات
۶۴۔ شرح مسلم امام نووی
۶۵۔ مسند احمد
۶۶۔ العواصم
۶۷۔ عمدۃ التحقیق
۶۸۔ کتاب الاذاعہ
۶۹۔ اغاثۃ اللہفان
۷۰۔ تاویل الروایات الباہرہ
۷۱۔ غایۃ المرام
۷۲۔ روضۃ الواعظین
۷۳۔ مشکوٰۃ
۷۴۔ ریاض النضرہ
۷۵۔ فیض الباری
۷۶۔ القاموس
۷۷۔ منتہی الارب
۷۸۔ عینی شرح بخاری
۷۹۔ حواشی المنتقی
۸۰۔ طبری
۸۱۔ عرف شذی

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر	نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	لفظ بدا کی تحقیق	۹	۱۵	حکومتِ ائمہ	۷۵
۲	فضیلت	۲۰	۱۶	امام مہدی کی فتوحات اور	
۳	عقیدہ بدا کی ضرورت	۲۱		انبیاء کا تعاون	۷۶
۴	فسخ، محو و اثبات اور بدا میں		۱۷	حضرت علی کی قیادت میں	
	فرق	۳۲		ایک خوفناک جنگ	۷۷
۵	عقیدۂ رسالت	۳۸	۱۸	مسئلہ رجعت اور شیعہ علماء	۸۲
۶	حضرت یوسفؑ	۴۳	۱۹	عقیدۂ امامت اور ائمہ کے متعلق	
۷	حضرت یونس علیہ السلام	۴۵		نادر باتیں	۹۸
۸	عقیدۂ آخرت	۴۸	۲۰	بارہویں امام کے متعلق سیّد	
۹	عقیدۂ امامت	۶۰		نعمت اللہ الجزائری محدث کا ذاتی واقعہ	۱۰۳
۱۰	سفرا کون تھے ؟	۶۶	۲۱	مسئلہ امامت اور خاندان نبوت	
۱۱	غیبت صغریٰ اور سفرا	۶۶		کی خانہ جنگیاں	۱۰۶
۱۲	امام کب ظاہر ہوں گے ؟	۶۷	۲۲	امام مظلوم	۱۱۴
۱۳	زمانۂ رجعت میں غیر شیعہ اور		۲۳	سابقہ کتب کے شواہد	۱۲۲
	سنیوں کی حالت	۷۲	۲۴	عقیدہ خلافت	۱۳۴
۱۴	زمانۂ رجعت میں امام کے انقلابی کام	۷۳	۲۵	آیت تذکرہ کے نزول اور خلافت علی بلافصل کی تفصیل	۱۳۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۲۶	لفظ مولیٰ کی تحقیق	۱۴۰
۲۷	علم معانی کے لحاظ سے تحقیق	۱۴۱
۲۸	کتاب سلیم بن قیس ہلالی کی تاریخی اور دینی حیثیت	۱۷۳
۲۹	حضرت علی اور خلفائے ثلثہ کے تعلقات	۱۸۱
۳۰	حضرت عثمان پر ایک الزام	۱۹۹
۳۱	اس مفروضہ کے خلاف ایک اور شہادت	۲۰۲
۳۲	باغ فدک	۲۱۰
۳۳	فدک کی جاگیر حضورؐ کے قبضہ میں کیسے آئی ؟	۲۱۷
۳۴	مال فے پر حضورؐ کے قبضہ کی نوعیت	

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۳۵	انبیاء علیہم السلام کی میراث	۲۲۶
۳۶	قرآن حکیم اور وراثت انبیاء	۲۳۹
۳۷	مطالبہ میراث کے سلسلے میں حضرت علی کا کردار	۲۵۶
۳۸	دعویٰ ہبہ فدک	۲۶۵
۳۹	ہبہ فدک کی تفصیل اور اس کی تاریخ	۲۶۸
۴۰	اعمال صالحہ	۲۷۵
۴۱	نماز	۲۸۲
۴۲	افضل العبادات و الذ العبادات	۲۸۶
۴۳	ماتم حسینؓ	۳۰۴
۴۴	مصیبت اور لوازم مصیبت	۳۲۱
۴۵	اپنے اور پرائے	۳۳۳
۴۶	سینوں سے یہ بغض کیوں	۳۳۷
۴۷	دین اسلام اور دین شیعہ	۳۴۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اسلام کے اساسی عقائد تین ہیں توحید، رسالت اور معاد۔ عقیدۂ توحید سے اجمالی طور پر مراد یہ ہے کہ اس امر کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں لاشریک ہے اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ اور عبادت کے لائق صرف اسی کی ذات ہے۔

شیعہ حضرات نے عقیدۂ توحید کے ضمن میں صفات باری تعالیٰ میں ایک خاص وصف کا ذکر کیا ہے اور خدا کی اس صفت پر ایمان لانا نہایت اہم قرار دیا ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ

"اللہ تعالیٰ کو بدا ہوتا ہے"

عقیدۂ بدا کی تفصیل میں چار اہم پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔

اوّل : لفظ بدا کی لغوی تحقیق۔

دوم : عقیدہ بدا کی اہمیت اور اس کی فضیلت۔

سوم : اللہ تعالیٰ کی ذات کو اس صفت سے متصف ماننے کی وجہ۔

چہارم : علمائے شیعہ کی توضیحات اور ان کا جائزہ۔

لفظ بدا کی تحقیق

کسی لفظ کے معنی اور مفہوم کی حقیقت معلوم کرنے کا مستند طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کی لغت اور اہل زبان کے محاورہ اور روزمرہ کا مطالعہ کیا جائے چنانچہ 'بدا' عربی زبان کا لفظ ہے لغت عرب میں بدا کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں بدا لہ ای ظہر لہ مالم یظہر یعنی اسے جو بات اب معلوم ہوئی وہ پہلے معلوم نہ تھی یا اس کے برعکس ظاہر تھی۔

لغت اور محاورہ کے اعتبار سے کلام عرب میں قرآن کریم فصیح ترین کتاب ہے۔

اس میں بدا کا لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے :-

(أ) سورۂ یوسف میں بیان ہوا کہ:

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ

پھران پر حضرت یوسفؑ کی پاک دامنی کے دلائل ظاہر ہوئے تو ان کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ انہیں کچھ مدت کے لیے قید کر دیا جائے۔

یعنی حضرت یوسفؑ کو قید کرنے کی رائے پہلے نہ تھی۔ اب یہ نئی صورت مناسب معلوم ہوئی۔ اس لیے پہلی حالت کا نام جہل ہے۔

(ii) وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان (کفار) پر وہ امور ظاہر ہوئے جن کا انہیں گمان تک نہ تھا۔

یعنی جزا و سزا کے قطعاً منکر ہیں قیامت میں اس کا علم ہوگا۔ دنیا میں جزا و سزا کے متعلق جاہل تھے قیامت میں علم ہو جائے گا۔

پر بدا کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں۔

الملل والنحل ۱ : ۱۴۷

والبدا له - فكان البدا في العلم وهو ان يظهر له خلاف ما علم والبدا في الارادة وهو ان يظهر له صواب على خلاف ما اراد وحكم والبدا في الامر وهو ان يامر بشيء ثم يامر بشيء آخر بعده بخلاف ذلك

اور بدا علم میں یہ ہے کہ پہلے جو چیز معلوم تھی اب اس کے خلاف اس پر ظاہر ہوئی۔ ارادہ میں بدا یہ ہے کہ سابقہ ارادہ کے خلاف دوسرا ارادہ اچھا معلوم ہوا۔ اور بدا حکم میں یہ ہے کہ پہلے ایک چیز کے کرنے کا حکم دیا پھر اس کے خلاف دوسری چیز کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت بدا کا عقیدہ رکھنے کی پہلی صورت یعنی بدا فی العلم کے متعلق صاحب الملل والنحل فرماتے ہیں کہ

ولا عاقل يعتقد هذا الاعتقاد - یعنی کوئی ذی عقل انسان (خدا کے متعلق) یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا۔ اور بدا فی الارادہ کا حاصل بھی یہی ہے کہ دوسرے ارادہ کے اچھا ہونے کا جو علم اب ہوا وہ پہلے نہ تھا لہٰذا پہلی حالت کو جہل ہی کہیں گے۔ اسی طرح بدا فی الحکم میں بھی بات وہی نکلتی ہے کہ حکم ثانی کے صحیح ہونے کا علم اس وقت نہ تھا جب حکم اوّل دیا۔ لہٰذا اس حالت کو جہل کہیں گے۔ ہاں اگر حکم اوّل کے متعلق پہلے معلوم تھا کہ ایک وقت مقررہ عندہ تک یہ حکم نافذ رہے گا اس کے بعد حکم ثانی نافذ ہوگا تو یہ نسخ کہلائے گا۔ جس میں پہلا حکم منسوخ اور دوسرا ناسخ کہلائے گا۔ گویا نسخ اور بدا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں نسخ کو بدا نہیں کہتے۔ اسی وجہ سے اصول کافی اور دوسری کتب شیعہ میں نسخ اور بدا کے الگ الگ باب قائم کئے گئے ہیں۔ اگر ایک چیز کے دو نام ہوتے تو ہر ایک کے لیے جدا باب قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کتب شیعہ سے نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بدا فی العلم اور بدا فی الارادہ کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی بدا کی ان دو قسموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے ظہور کا وقت سنہ ۷۰ھ مقرر کیا تھا مگر سنہ ۶۱ھ میں شیعہ حضرات نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کو غصہ آگیا اور سنہ ۷۰ھ میں ظہور امام کے ارادہ کو بدل دیا۔

اس واقعہ سے چند ایک امور ضمنی طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔

(ا) اگر امام کے قاتل خود شیعہ نہ ہوتے تو ظہور مہدی کی نعمت عظمیٰ سے محروم نہ کئے جاتے۔

(ب) خدا کو جب غصہ آتا ہے تو دوست بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جیسے شیعہ جو خدا کے دوست ہیں اتنی بڑی نعمت سے محروم کر دئے گئے۔

(ج) شہادت امام حسینؓ کے متعلق خدا کو پہلے علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو ظہور مہدی کے لیے سنہ ۷۰ھ مقرر نہ کرتا۔

۲۔ پھر ظہور مہدی کے لیے سنہ ۱۴۰ھ مقرر کیا گیا۔ مگر وہ سال بھی گذر گیا۔ اور امام کا ظہور نہ ہوا اس سے ظاہر ہے کہ یہ بدا فی الارادہ کا دوسرا موقعہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سنہ ۱۴۰ھ تک شیعہ پر خدا غصہ بدستور قائم رہا۔ اگر راضی ہوتا تو سنہ ۱۴۰ھ میں امام مہدی

کا ظہور ہو جاتا۔ اصول کافی مطبوعہ لکھنو صفحہ ۲۲۲ پر یہ عقیدہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

عن ابی حمزۃ الثمالی قال سمعت ابا جعفر یقول یا ثابت ان اللہ قد کان وقت ھذا الامر فی السبعین فلما ان قتل الحسین صلوات اللہ اشتد غضب اللہ علی اھل الارض فاخرہ الی اربعین ومائۃ فحدثناکم فاذعتم الحدیث و کشفتم قناع السر ولم یجعل بعد ذلک وقت عندنا قال ابو حمزہ فحدثت بذلک ابا عبد اللہ فقال کان ذلک

ابو حمزہ الثمالی کہتا ہے میں نے امام باقر سے یہ سُنا کہ اے ثابت! اللہ تعالےٰ نے ظہور مہدی کے لیے سنہ ۷۰ھ مقرر کیا تھا مگر جب حسینؓ قتل کر دئے گئے تو خدا تعالیٰ کو زمین والوں پر سخت غصہ آیا اس لیے ظہور مہدی کو سنہ ۱۴۰ھ تک مؤخر کر دیا ہم نے یہ بات تم سے بیان کر دی اور تم نے اسے مشہور کر دیا اور راز فاش ہو گیا اب اللہ تعالےٰ نے اس کا کوئی وقت ہمیں نہیں بتایا۔ ابو حمزہ کہتا ہے میں نے یہ باتیں امام جعفر کے سامنے بیان کیں تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوا۔

اصول کافی کی اس عبارت کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے پہلے ارادہ (سنہ ۷۰ھ) اور دوسرے ارادہ (سنہ ۱۴۰ھ) کی اطلاع ائمہ کو کیسے ملی؟ کتاب اللہ اور سنت رسول میں تو اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اس لیے یہی ہو سکتا ہے کہ ائمہ کو یہ بات بذریعہ وحی معلوم ہوئی یا بذریعہ کشف و الہام۔ اگر پہلی صورت تسلیم کی جائے تو ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے جو کفر ہے اور اگر دوسری صورت مانی جائے تو عقائد کے باب میں کشف و الہام کو حجت تسلیم کرنا پڑتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ اور اگر یہ دونوں صورتیں قابل تسلیم نہ ہوں تو ماننا پڑے گا کہ راویوں نے یہ افترا پردازی کی ہے۔ پھر محدثین شیعہ نے اس پر عقیدہ کی بنیاد کیوں رکھی؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت تاحال باقی ہے۔

علامہ قزوینی نے علامہ طوسی کی کتاب الغیبۃ سے ایک اقتباس دیا ہے :-

عن ابی حمزۃ الثمالی قال قلت لابی جعفر ان علیا کان یقول الی السبعین بلاء وکان یقول بعد البلاء رخاء وقد مضت السبعون ولم نر رخاء

ابو حمزہ کہتا ہے میں نے امام باقر سے کہا کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ سنہ ۷۰ھ تک مصائب ہیں اس کے بعد راحت و آرام مگر سنہ ۷۰ھ گذر گیا اور ہمیں راحت نصیب نہ ہوئی۔

اسی کتاب الغیبۃ میں ایک روایت ہے

عن عثمان بن النواد قال سمعت ابا عبد اللہ یقول کان ھذا الامر فی فاخرہ اللہ ویفعل اللہ مایشاء بعد فی ذریتی مایشاء

عثمان کہتا ہے میں نے امام جعفر سے سنا فرماتے تھے کہ منصب (امام مہدی) میرے لیے خاص تھا مگر اللہ تعالےٰ نے اسے مؤخر کر دیا۔ اور اب اللہ تعالےٰ میری اولاد میں جو چاہے گا کرے گا۔

اس روایت سے بدائی الارادہ کی ایک نئی صورت سامنے آتی ہے کہ پہلے امام جعفر کو اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کا منصب دینے کا ارادہ کیا۔ پھر اسے بدل دیا یعنی امام جعفر اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر دئے گئے۔ اِدھر امام جعفر سے یہ بھی منقول ہے کہ خدا تعالےٰ کا ارادہ تھا کہ سلسلہ امامت بارہ اماموں پر ختم کرے اس لیے بارہ اماموں کے نام بارہ سربمہر لفافوں میں رسولؐ خدا پر نازل فرمائے ہر لفافہ میں امام کا نام اور اس کی علامت لکھی تھی۔ یعنی بارہ اماموں کا تقرر خدا کی طرف سے تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر پر امامت کا سلسلہ ختم کرنے کا ارادہ خدا نے کیا جبھی تو انہیں آخری امام یعنی مہدی کا منصب دینا چاہا۔ مگر پھر خدا نے ارادہ بدل دیا اور بارہ امام ہی مقرر ہے۔

اصول کافی میں ایک طرف تو وقت کی تعیین سنہ ۷۰ھ اور سنہ ۱۴۰ھ کا ذکر ہے دوسری طرف اس کے بالکل برعکس ایک اور روایت بھی ملتی ہے۔

اصول کافی صفحہ ۲۲۳

عن ابی جعفر قال قلت لهذا الامر وقت فقال كذب الوقاتون كذب الوقاتون كذب الوقاتون

راوی کہتا ہے میں نے امام سے ظہورِ مہدی کا وقت دریافت کیا فرمایا وقت بیان کرنے والے سب جھوٹے ہیں جھوٹے ہیں جھوٹے ہیں۔

اصول کافی کے حوالے سے گذشتہ روایات سے ظاہر ہے وقت بتانے والے ائمہ ہی تو تھے یعنی حضرت علیؑ، امام باقر اور امام جعفر۔ پھر امام باقر فرما رہے ہیں کہ وقت بیان کرنے والے جھوٹے ہیں اس لیے یہی کہنا پڑے گا کہ راویوں نے یا تو یہاں افترا پردازی کی ہے یا وہاں۔ بہر حال افترا پردازیوں کے تانے بانے سے یہ مسلک تیار ہوا۔

دوسرا واقعہ :۔ منصب امامت پر تقرر کے لیے ایک قانون بیان ہوا ہے۔

اصول کافی طبع لکھنؤ صفحہ ۱۷۴

وللامام علامات منها ان يكون اكبر ولد ابيه

امام کے لیے نشانیاں ہیں از انجملہ ایک علامت یہ ہے کہ امام اپنے والد کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے۔

چنانچہ اسی اصول کے ماتحت خدا نے امام جعفر کے بعد ان کے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو امامت کا منصب عطا فرمایا مگر اس اعلانِ خداوندی کے باوجود اسمٰعیل اپنے باپ کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے اور خدا کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ اور موسیٰ کو امام مقرر کیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا کو علم نہ تھا کہ اسمٰعیل اپنے باپ کی زندگی میں ہی فوت ہوجائیں گے؟ اگر علم ہوتا تو ان کی امامت کا اعلان نہ کرتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ بدا فی العلم ہے۔ اور اسماعیل کی جگہ موسیٰ کو امام مقرر کرنا بدا فی الارادہ ہوا۔ اس ایک واقعہ میں بدا کی دو صورتیں ثابت ہوئیں۔

سید نعمت اللہ جزائری محدث کے سامنے جب یہ لاینحل مسئلہ پیش کیا گیا کہ رب العالمین کو جب اپنے قدیم علم سے معلوم تھا اور لوحِ محفوظ پر لکھ دیا تھا کہ یہ بارہ خلیفے ہوں گے تو اسماعیل کا امام ہونا بھی لوحِ محفوظ پر لکھا ہوگا۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ

(ا) اسماعیل، امام جعفر کے بڑے بیٹے تھے۔

(ب) یہ اپنے والد کی زندگی میں فوت ہوگئے۔

(ج) اسماعیل کی امامت کا اعلان حسب قانون شیعہ خدا کی طرف سے ہوا تھا۔ اور الفاظ میں تاویل تو ہوسکتی ہے مگر واقعات کی تکذیب کیونکر ممکن ہوسکتی ہے۔

تو سید صاحب نے جواب دیا۔

فان قلت اذا كان اسماء الائمة مكتوب في لوح فاطمة وفي الدفاتر السماوية قبل خلق آدم وبعده فما معنى ما روي من قول ابي عبد الله لابنه موسىٰ لما مات اسمٰعيل ما بدا لله في شيء مثل ما بدا لله في اسمٰعيل

اگر تو سوال کرے کہ جب ائمہ کے نام لوح فاطمہ اور دفاتر آسمانی میں پیدائش آدم سے پہلے لکھے جاچکے تھے تو پھر امام جعفر کے اس قول کے کیا معنی ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے موسیٰ سے فرمایا جب اسماعیل فوت ہوگئے کہ خدا کسی معاملے میں ایسا نہیں بھولا جیسا اسماعیل کی امامت کے معاملے میں بھول گیا ہے۔

اسی طرح کی ایک روایت علامہ طوسی نے نقد المحصل میں بحار الانوار مجلسی سے نقل کی ہے۔

عن جعفر الصادق انه جعل اسمٰعيل القائم مقامه بعده فظهر من اسمٰعيل ما لم يرتضه فجعل القائم مقامه موسىٰ فسئل عن ذلك فقال بدا لله في اسمٰعيل۔

امام جعفر سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے بعد اپنا قائم مقام اسماعیل کو قرار دیا مگر اسماعیل سے وہ بات ظاہر ہوئی جسے انہوں نے ناپسند کیا اور موسیٰ کاظم کو اپنا قائم مقام بنایا۔ پوچھا گیا تو کہا کہ خدا سے اسماعیل کے متعلق بھول ہوگئی

اسی قسم کی ایک روایت شیخ صدوق نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں بیان کی ہے

ما بدا لله في شيء كما بدا لله في اسمٰعيل

خدا کسی معاملے میں ایسا نہیں بھولا جیسے میرے بیٹے اسماعیل کے معاملے میں بھول گیا ہے۔

تیسرا واقعہ :۔ امام حسن عسکری کی امامت کے سلسلے میں اصول کافی صفحہ ۲۰۳ پر بیان ہوا ہے۔

عن ابی الهاشم الجعفري

ابوالہاشم کہتا ہے کہ میں امام نقی کے پاس گیا

قال كنت عند ابى الحسن
بعد ما مضى ابنه ابو جعفر
وانى لافكر فى نفسى
اريد ان اقول كانهما اعنى
اباجعفر وابا محمد فى هذا
الوقت كابى الحسن موسى
واسمعيل بن جعفر بن محمد
وان قصتهما كقصتهما اذ كان
ابو محمد المرجا بعد ابى
جعفر فاقبل علىّ ابوالحسن
قبل ان انطق فقال نعم يا ابا هاشم
بدالله فى ابى محمد كما بدالله فى موسى
بعد مضى اسمعيل ما كشف به عن حاله
وهو كما حدثتك نفسك وان كره
المبطلون وابو محمد ابنى الخلف من بعده
عنده علم ما يحتاج اليه ومعه آلة الامامة

جب ان کے بیٹے ابوجعفر کا انتقال ہوچکا تھا میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کیونکہ اس وقت ابوجعفر اور حسن عسکری کی حالت وہی ہے جو موسیٰ کاظم اور اسماعیل فرزندان جعفر صادق کی تھی دونوں کے واقعات ایک جیسے ہیں کیونکہ حسن عسکری ابوجعفر کے بعد پیدا ہوئے۔ امام نقی میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ابوالہاشم! اللہ کو حسن عسکری کے متعلق ایسا ہی ہوا جیسا موسیٰ کاظم کے لیے اسماعیل کے مرنے کے بعد ہوا جس نے اسماعیل کے حال کو ظاہر کر دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا تم نے دل میں خیال کیا اگرچہ گمراہ لوگ اسے بُرا ہی خیال کریں میرے بیٹے حسن عسکری کے پاس جو میرا خلیفہ ہے تمام ان اشیاء کا علم ہے جنکی ضرورت ہے اور اس کے پاس آلۂ امامت بھی ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ امام نقی کے بعد ان کے بڑے بیٹے ابوجعفر کو خدا نے امامت کے لیے منتخب فرمایا اور اس کا اعلان کر دیا مگر ابوجعفر اپنے والد کی زندگی میں فوت ہوگئے اور خدا کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا چنانچہ ان کی جگہ حسن عسکری کو امام بنایا تو شیعہ حضرات میں امامت کے عقیدہ کے متعلق تزلزل پیدا ہونے لگا۔ اس لیے امام نقی نے انہیں بتایا کہ خدا کو بدا ہو گیا یعنی خدا بھول کر ابوجعفر کی امامت کا اعلان کر بیٹھا تھا۔ اس لیے شیعہ کو خدا کی اس بھول پر چپ ہو جانا چاہیے۔ ہاں تو اس روایت سے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ امامت کے لیے کوئی مخصوص آلات بھی ہوتے ہیں۔

ان روایات سے یہ ثابت ہوا کہ شیعہ علماء اور محدثین اور متکلمین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ:۔

(۱) خدا سے بھول ہو جانے یعنی بدا کے متعلق روایات صحیح ہیں۔ اگر ان روایات میں کوئی سقم ہوتا تو آسان بات تھی کہ یہ جواب دیا جاتا کہ بدا کے متعلق احادیث غلط ہیں۔ تاویلات کی ضرورت اسی لیے محسوس ہوئی کہ ان روایات کی صحت کا یقین موجود ہے۔

(۲) محدثین اور متکلمین شیعہ مانتے ہیں کہ یہ تمام احادیث ائمہ طاہرین سے منقول ہو کر مستند کتب احادیث میں درج ہوئیں۔

(۳) عقیدہ بدا کا اظہار کسی نظری یا فکری اختلاف کے سلسلے میں نہیں ہوا بلکہ ان حالات سے متعلق ہے جو امور واقعہ ہیں۔ محض الفاظ نہیں بلکہ تاریخی واقعات ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ واقعات میں تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہٰذا شیعہ کے نزدیک خدا کے متعلق بدا کا عقیدہ رکھنا توحید کا جزو لاینفک ہے۔

اس سلسلے میں حیرت کی بات یہ ہے کہ خدا سے جب بھی بھول ہوئی امامت کے بارے میں ہوئی حالانکہ امام کی علامات اتنی تفصیل اور اتنے اہتمام سے شیعہ لٹریچر میں درج ہیں کہ غلطی کھا جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی خدا سے بھول ہوتی ہی رہی۔ مثلاً اصول کافی اور حق الیقین میں امام کی علامات درج ہیں:۔

(۱) امام ہمیشہ بڑا بیٹا ہوگا۔
(۲) امام چالیس دن کے بعد ماں کے پیٹ میں نہیں رہتا بلکہ ماں کی پسلیوں میں رہتا ہے۔
(۳) امام ماں کے پیٹ میں قرآن، توریت، انجیل، زبور وغیرہ حفظ کر کے پیدا ہوتا ہے۔
(۴) امام ماں کی دائیں ران سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ انسانی پیدائش کے موعودہ طریقے سے۔
(۵) امام کے دانت ماں کے پیٹ ہی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔
(۶) امام ختنہ شدہ پیدا ہوتا ہے۔
(۷) امام کی پیشانی پر "تمت کلمة ربك صدقا و عدلا" لکھا ہوتا ہے۔
(۸) پیدا ہوتے ہی امام سجدہ میں گر جاتا ہے اور کلمہ شہادت پڑھتا ہے۔
(۹) امام ناف بریدہ ہوتا ہے۔
(۱۰) ہر امام کے نام بنام بارہ لفافے رسولؐ خدا پر نازل ہوئے تھے کہ فلاں کے …

اس قدر واضح علامات کے باوجود امام کے بارے میں خدا سے بھول ہوتی ہی رہی اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ (معاذ اللہ) خدا کا علم ناقص ہے اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ کوئی کب مرے گا۔

اس ساری تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ :۔

(۱) بدا کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز جو پہلے خدا کے علم میں نہ تھی بعد میں معلوم ہو گئی۔ یعنی خدا کی ایک صفت جہل ہے اور عقیدہ بدا کے مطابق خدا کو جاہل ماننا لازمی ہے

(۲) خدا نے ایک ارادہ کیا اس کی غلطی اس پر ظاہر نہ ہوئی تھی جب غلطی ظاہر ہوئی تو مجبوراً خدا کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ یعنی یہ ماننا پڑا کہ صحیح اور غلط، مناسب و نامناسب کے درمیان فیصلہ کرنے میں خدا سے بھول ہو جاتی ہے۔

(۳) خدا سے جب بھی بھول ہوئی امامت کے منصب کے بارے میں ہوئی۔ حالانکہ امام کے لیے واضح اور کثیر علامات موجود تھیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ یا تو خدا بڑا سادہ اور بھولا بھالا ہے یا امامت کا عقیدہ ایجاد بندہ کی قبیل سے ہے۔

عقیدۂ بدا کی اہمیت اور فضیلت :۔

عقیدۂ بدا کے متعلق کتب شیعہ میں مختلف موقف اختیار کئے گئے ہیں مثلاً

(۱) جواز :۔

جوز البدا علی اللہ وان یرید اللہ شیئا ثم یبدو لہ ای یظہر علیہ ما لم یکن ظاہرا لہ و یلزمہ ان لا یکون الرب تعالی عالما بعواقب الامور والاحکام
ھو (انوار نعمانیہ ۱؍ ۲۰۹

شیعہ نے خدا کے لیے بدا کو جائز رکھا۔ اور بدا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کسی شے کا ارادہ کرے پھر خدا پر وہ ظاہر ہو جو پہلے ظاہر نہ تھا۔ اور اس سے لازم آئے گا کہ خدا تعالیٰ امور کے انجام سے جاہل ہے اور یہ بات نہایت صحیح ہے۔

اس اقتباس سے عقیدہ بدا کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ بدا کے معنی واضح ہوتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے۔ امور کے انجام سے خدا کا جاہل ہونا لازم آتا ہے۔

(۲) اہمیت :۔

القول بالبدا کما قال اصحابنا فی اخبارنا عن الائمۃ انہ ما عبد اللہ بشیٔ مثل البدا وان اللہ لم یرسل نبیا حتی اقر للہ بالبدا۔

خدا کے متعلق بدا کا عقیدہ جیسا کہ ہمارے علماء شیعہ نے خدا کا جاہل ہونا تسلیم کیا ہے۔ اور ائمہ کرام سے حدیثیں مروی ہیں کہ خدا کی عبادت کا حق جو عقیدہ بدا کے تسلیم کرنے سے ادا ہوتا ہے وہ کسی اور عبادت سے نہیں ہوتا اور خدا نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس سے خدا کے جاہل ہونے کا اقرار نہ کرایا ہو۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ :۔

۱ ۔ خدا کے متعلق بدا کا عقیدہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کی روح یہ ہے کہ خدا کو امور کے انجام سے جاہل تسلیم کیا جائے۔

۲ ۔ یہ عقیدہ علمائے شیعہ کا متفق علیہ ہے۔

۳ ۔ یہ عقیدہ تمام اماموں کا تھا جیسا کہ ائمہ کی احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

۴ ۔ اس عقیدہ کے بغیر خدا کی عبادت کا حق ادا نہیں ہوتا۔

۵ ۔ تمام انبیاء سے خدا نے یہ اقرار کرایا بلکہ نبوت ملتی ہی اس وقت تھی جب اس عقیدہ کا اقرار کر لیتا۔

خدا کی ایک صفت جہل کھٹکتی ہے مگر اس کے بغیر بدا کے عقیدہ کی تکمیل ہی نہیں ہوتی اس لیے بعض طبائع نے کھل کر اختلاف کیا جیسا کہ علامہ دلدار علی مجتہد لکھنوی لکھتے ہیں۔

واعلم ان البدا لا ینبغی ان یقول بہ احد لانہ یلزم منہ ان یتصف الباری تعالی بالجاھل کما لا یخفی (اساس الاصول طبع ۱۲۶۴ھ ص ۲۱۹

تو سمجھ لو کہ خدا کے متعلق بدا کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے خدا کی ایک صفت جاہل ہونا لازم آتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

مگر تیرھویں صدی میں آکر ایک مجتہد ائمہ کی احادیث اور محدثین و متکلمین شیعہ متقدمین کے عقائد پر کیسے پانی پھیر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک اور مجتہد امام المناظرین مولوی

حامد حسین لکھنوی نے علامہ دلدار علی کے قول کو یوں رد کر دیا کہ "خدا کے جاہل ہونے کے عقیدہ میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی" دیکھئے کتاب استقصا الافہام ۱: ۱۲۸ تا ۱۵۸ بحث عقیدہ بدا۔ آخر میں یہ بات فرما دی۔ ظاہر ہے کہ صدیوں پرانا عقیدہ ایک دلدار علی کے کہنے سے کیسے چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ فضیلت :۔

ا ۔ عن ابی عبد الله یقول ما تنبأ نبی قط حتی یقر لله بخمس بالبداء المشیة الخ	امام جعفر فرماتے ہیں کوئی ایسا نبی نہیں آیا جس نے اللہ کی پانچ صفات کا اقرار نہ کیا ہو۔ بدا کا مشیت کا۔ الخ ۔
ب ۔ عن الرضا یقول ما بعث الله نبیاً قط الا بتحریم الخمر وان یقر لله بالبداء۔	امام موسیٰ رضا سے روایت ہے کہ اللہ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا جس نے شراب کے حرام ہونے کا اور عقیدہ بدا کا اقرار نہ کیا ہو۔
ج ۔ عن زرارہ بن اعین عن احدھما قال ما عبد الله بشئ مثل البداء۔	زرارہ سے روایت ہے کہ امام نے فرمایا کہ خدا کی عبادت عقیدہ بدا رکھنے سے بڑھ کسی چیز میں نہیں۔
د ۔ عن ابی عبد الله یقول لو علم الناس ما فی القول بالبداء من الاجر ما افتروا عن الکلام فیہ (اصول کافی)	امام جعفر فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عقیدہ بدا کی تبلیغ اور چرچا کرنے میں کتنا ثواب ہے تو وہ اس میں ہرگز سستی نہ کریں ۔
س ۔ ان الله تعالیٰ لم یرسل نبیاً حتی اقر لله تعالیٰ بالبداء۔ انوار نعمانیہ ۱: ۲۰۹	اللہ تعالیٰ نے کسی کو رسول نہیں بنایا جب تک اس نے عقیدہ بدا کا اقرار نہیں کیا ۔

اس سے بڑھ کر فضیلت کا معیار اور کیا ہو سکتا ہے کہ :۔
نبی کو نبوت ملنے کا مدار اس عقیدہ کا اقرار کرنا ٹھہرا ۔

(۲) یہ عقیدہ رکھنا خدا کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اس سے اعلیٰ کسی عبادت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔

(۳) یہ باتیں ائمہ طاہرین نے بیان فرمائی ہیں صرف کسی متکلم یا عالم کی فکری کاوش کا نتیجہ نہیں۔

انوار نعمانیہ کا شیعہ کے نزدیک جو مقام ہے مؤلف نے خود مقدمہ میں بیان کر دیا ہے۔

وقد التزمنا ان لا نذکر فیه الا ما اخذناہ عن ارباب العصمة الطاهرین او ما صح عندنا من کتب الناقلین (۱: ۲۱۹)	ہم نے اس کتاب میں اس امر کا التزام کیا ہے کہ اس میں وہی بیان کرنا ہے جو ہم نے ائمہ معصومین سے اخذ کیا ہے اور جو ہم نے علمائے ناقلین کی کتب سے صحیح پایا ہے ۔

حاصل یہ ہے کہ عقیدہ بدا رکھنا شیعہ کے نزدیک صرف جائز ہی نہیں بلکہ نہایت اہم ہے اور سب سے افضل عبادت یہ عقیدہ رکھنا ہے ۔

امر سوم :۔ عقیدہ بدا کی ضرورت :

کتب شیعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے دور کے اواخر میں ایک یہودی عبد اللہ بن سبا نامی منافقانہ طور پر ایمان لایا اور مسلمانوں کی جماعت میں ضم ہو کر در پردہ اسلام کی تخریب کے درپے ہوا اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اسلام کی تعبیر اور اس کی ترویج میں ایک خطرہ محسوس کیا کہ اسلام کو نئی شکل دینے کے لیے روایات گھڑ لینا تو آسان ہے مگر ان روایات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا مشکل ہے کیونکہ احادیث کی جرح و تعدیل کا فن اس سازش کو چلنے نہ دے گا اس لیے اس کے لیے نئی راہ یہ نکالی کہ روایات کو ائمہ اہل بیت کی طرف منسوب کیا جائے۔ ان حضرات سے گہری عقیدت اور جذباتی تعلق احادیث کی جرح و تعدیل کے سامنے بچاؤ کا کام دے گا ۔ چنانچہ شیعہ مذہب کی روایات ائمہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

ہر معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو گہری عقیدت کے باوجود تحقیق کے عادی ہوتے ہیں اس لیے کچھ لوگوں نے ان روایات کو ائمہ کے سامنے پیش کرنا اور ان سے تصدیق کرانا شروع کر دیا چنانچہ ائمہ نے جھوٹی اور من گھڑت روایات کی تکذیب شروع کر دی۔ اور شیعہ پر لعنت کیا کرتے۔ اس کا حل سبائی گروہ نے یہ نکالا کہ امام تقیہ کرتے ہیں عوام کے سامنے سنی ہوتے ہیں۔ وہی نماز پڑھتے ہیں مگر درحقیقت شیعہ ہوتے ہیں اور پوشیدہ طور پر ہمیں مذہب کی تعلیم دیتے ہیں پھر تقیہ کے فضائل بیان کرتے کرتے بات یہاں تک پہنچا دی کہ تقیہ ہی اصل دین ہے۔ دین اسلام کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں پوشیدہ ہے یعنی جو آدمی تمام عبادات کا پابند ہے فضائل اخلاق کا حامل ہے مگر تقیہ نہیں کرتا یعنی جھوٹ نہیں بولتا تو وہ نو حصے دین ضائع کرتا ہے اس عقیدہ کی وجہ سے شیعہ مذہب دنیا کے تمام مذاہب میں ممتاز نظر آتا ہے۔ ہر مذہب میں خواہ وہ آسمانی مذہب ہو یا غیر آسمانی جھوٹ بولنا بُرا سمجھا جاتا ہے اور بنیادی انسانی اخلاقیات میں جھوٹ کو رذائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر شیعہ مذہب میں اسے عبادت سمجھا جاتا ہے۔

تقیہ کے عقیدہ کی ایجاد سے یہ مشکل عقدہ تو حل ہو گیا مگر ایک اور مشکل پیدا ہو گئی کہ اس طرح ائمہ اہل بیت کا اصل مذہب معلوم کرنا ایک معمہ بن گیا۔ کیونکہ ان کے ہر بیان میں جب تقیہ کا امکان ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا اصل مذہب یہ ہے جب جھوٹ اور سچ میں کوئی حد فاصل نہ رہی۔ اور ان میں تمیز کرنے کے لیے کوئی معیار نہ رہا تو ائمہ کے کسی عقیدہ یا کسی عبادت کے متعلق وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقت ہے یا محض ابلہ فریبی ہے۔ یعنی عقیدہ تقیہ سے عوام کو قابو کر لیا گیا مگر ائمہ کا مذہب مشکوک ہو گیا۔ اور یہ عقدہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔

شیعہ مذہب میں تقیہ کے عقیدہ کا جو مقام ہے اس کے متعلق اصول کافی باب التقیہ سے چند روایات پیش کی جاتی ہیں جو ائمہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔

۱ - قال ابوعبداللہ ما عبداللہ بشئ احب الیہ من التقیۃ۔	امام جعفر نے فرمایا خدا کے نزدیک افضل ترین عبادت تقیہ کرنا ہے۔

۲ - قال ابوجعفر التقیۃ من دینی ومن دین ابائی لادین لمن لا تقیۃ لہ۔	امام باقر نے فرمایا تقیہ کرنا میرا دین ہے میرے آبا و اجداد کا دین ہے اس شخص کا کوئی دین نہیں جو تقیہ نہیں کرتا۔
۳ - عن ابی عبداللہ ان تسعۃ اعشار الدین فی التقیۃ ولا دین لمن لا تقیۃ لہ۔	امام جعفر سے روایت ہے کہ دس میں سے نو حصہ دین تقیہ میں ہے اور جو شخص تقیہ نہیں کرتا اس کا کوئی دین ہی نہیں۔

سبائیوں نے امامت میں تقدس کا رنگ پختہ کرنے کے لیے مستقبل کے متعلق ائمہ سے منسوب کر کے طرح طرح کی پیشگوئیاں بیان کرنا شروع کر دیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ پیشگوئیاں غلط ثابت ہونے لگیں جیسا کہ ظہور مہدی وغیرہ کے متعلق بیان ہو چکا ہے تو انہوں نے امامت کو بچانے کے لیے عقیدۂ بدا ایجاد کر لیا۔ اس طرح عقیدۂ توحید کی قربانی دے کر امامت کو بچانے کی کوشش کی گئی کہ ائمہ نے یہ پیشگوئیاں از خود کب کی تھیں۔ خدا نے انہیں جو کچھ بتایا انہوں نے بیان کر دیا۔ ائمہ تو معصوم ہیں۔ البتہ خدا سے بھول ہو گئی۔ اور بدا یعنی بھول جانا خدا کی ایک صفت قرار دے دی گئی۔ اس کوشش سے امامت کا تقدس محفوظ ہو گیا مگر اس کا کیا علاج کہ تقیہ کے عقیدہ نے امامت کو وہاں لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں سے پست کسی اور مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تقیہ اور بدا کے عقیدے صرف ایجاد ہی نہیں کئے گئے بلکہ ان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے دونوں کو ہم رتبہ بنا دیا گیا۔ ان دونوں روایتوں کے الفاظ اور معانی قابل غور ہیں۔

ماعبد اللہ بشئ مثل البدا ۱ اور ماعبد اللہ بشئ احب الیہ من التقیۃ

عبداللہ بن سبا اور اس کے گروہ کی خدمات:-

۱- انوار نعمانیہ ۱: ۲۰۷

وقیل انہ کان یہودیا فاسلم وکان فی الیہودیۃ یقول فی یوشع بن نون وصی موسی علیہ السلام	اور کہا گیا ہے کہ ابن سبا یہودی تھا پھر مسلمان ہوا۔ یہودیت کے زمانے میں یوشع

مثل ما قال فی علی وقیل انه اول من اظهر القول بوجوب امامة علی علیه السلام و منه تشعبت اقسام الغلاة ـ

بن نون وصی موسیٰ کے متعلق غلو کرتا تھا۔ جیسا مسلمان ہوکر اس نے حضرت علیؓ کے متعلق غلو کیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کی امامت کے وجوب کا اظہار کیا۔ اور اس سے کئی غالی فرقے پیدا ہوئے۔

۲۔ رجال کشی طبع ایران صفا

ذکر بعض اہل العلم ان عبد اللہ بن سبا کان یهودیا فاسلم ووالی علی علیه السلام وکان یقول و هو علی یهودیة فی یوشع بن نون وصی موسی علیه السلام بالغلو فقال فی اسلامه بعد وفات رسول اللہ فی علی مثل ذلک وکان اول من اشتهر بالقول بفرض امامة علیؑ واظهر البراءة من اعدائه وکاشف مخالفیه واکفرهم ومن ههنا قال من خالف الشیعة اصل التشیع والرفض ماخوذ من الیهودیة

بعض علماء نے بیان کیا کہ عبد اللہ بن سبا یہودی تھا پھر مسلمان ہوا اور حضرت علیؓ سے محبت کا اظہار کیا۔ یہودیت میں یوشع بن نون کے متعلق جو غلو کرتا تھا ویسا ہی مسلمان ہونے کی حالت میں حضرت علیؓ کے بارے میں غلو کرنے لگا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کی امامت کے فرض ہونے کو شہرت دی اور ان کے دشمنوں پر تبرا بازی شروع کی اور ان کے مخالفوں کی کھلی کھلی مخالفت کی۔ اور انہیں کافر کہا۔ اسی لیے مخالفین شیعہ کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب اور رفض کی اساس اور ماخذ یہودیت ہے۔

۳۔ الملل والنحل شہرستانی ۱ : ۴۷ ۱

اصحاب عبد اللہ بن سبا الذی قال لعلی انت انت یعنی انت الاله فنفاه الی المدائن زعموا انه کان یهودیا

ابن سبا کا گروہ۔ وہ ابن سبا جس نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ تو خدا ہے اس لیے حضرت علیؓ نے اسے مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا ان اصحاب ابن سبا کا یہ کہنا ہے کہ وہ یہودی

فاسلم وکان فی الیهودیة یقول فی یوشع بن نون وصی موسیٰؑ مثل ما قال فی علی وهو اول من اظهر القول بالنص بامامة علی کرم اللہ وجهه ـ

تھا پھر اسلام لایا اور یہودیت میں یوشع بن نون کے حق میں اسی طرح غلو کرتا تھا جس طرح وہ مسلمان ہوکر حضرت علیؓ کے حق میں غلو کرتا تھا۔ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؓ کی امامت کو منصوص ہونا ظاہر کیا۔

۴۔ رجال کشی صفا طبع لکھنؤ۔

عن ابان بن عثمان قال سمعت ابا عبد اللہ یقول لعن اللہ عبد اللہ بن سبا انه ادعی الربوبیة فی امیر المومنین و کان واللہ امیر المومنین عبد اللہ طائعا الویل لمن کذب علینا وان قوما یقولون فینا مالا نقول فی انفسنا فبرءوا الی اللہ منهم نبرا الی اللہ عنهم

ان روایات سے معلوم ہوا کہ :۔

(۱) شیعہ مذہب کے بنیادی عقائد امامت کا منصوص ہونا۔ امام کے مفترض الطاعۃ ہونا صحابہ کی تکفیر کرنا ان سے بغض رکھنا اور ان پر تبرا بازی کرنا ہے۔
(۲) ان عقائد کا موجد عبد اللہ بن سبا ہے اور یہ کوئی افسانوی شخصیت نہیں ہے۔
(۳) متقدمین علمائے شیعہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مذہب عبد اللہ بن سبا کا ایجاد کردہ ہے۔
(۴) غلو کرنا ابن سبا کی فطرت تھی۔ یہودیت کے زمانے میں اس نے اپنی فطرت کے تقاضا کو پورا کرنے کے لیے یوشع بن نون کو انتخاب کر رکھا تھا۔ اور منافقانہ طور پر مسلمان ہونے کے بعد اس نے اس مقصد کے لیے حضرت علیؓ کی شخصیت کو انتخاب

کرلیا۔ اور ان کی امامت کے منصوص ہونے کا عقیدہ ایجاد کر کے طبیعت سیر ہوئی اور انہیں یہاں تک کہہ دیا کہ "تو خدا ہے"

ائمہ کی پیشگوئیاں بیان کرنے کی اصل غرض :-

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وقت نے جب ائمہ کی پیشگوئیاں غلط ثابت کر دیں تو عقیدۂ بدا ایجاد کر لیا گیا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ان پیشگوئیوں کا اصل مقصد کیا تھا۔

۱۔ انوار نعمانیہ ۱ : ۱۴۶

انہ تدری فی الاخبار من الصادقین ان الشیعۃ لم تزل تربی بالامانی فھذہ التمنیات من احتمال خروجہ ھذا الیوم وھذا العام لیسھل الخطب علی الشیعۃ من ظلم الظالمین لھم ودخلھم فی باب التقیۃ من کل وجہ

ائمہ صادقین کی پیشگوئیوں سے کیا تو نہیں سمجھتا کہ شیعہ کو ان جھوٹی پیشگوئیوں سے بہلایا جاتا رہا۔ از انجملہ خروج مہدی کا احتمال ہے کہ فلاں دن یا فلاں سال خروج ہوگا۔ غرض یہ تھی شیعہ پر ظالموں کے جو ظلم ہوتے ہیں وہ انہیں سہل محسوس ہو اور خوب تقیہ کریں۔

۲۔ انوار نعمانیہ ۱ : ۱۵۳ اور اصول کافی صفحہ ۲۳۲

وروی عن الحسن بن علی بن یقطین من اخیہ الحسین عن ابیہ علی بن یقطین قال قال لی ابی الحسن ان الشیعۃ تربی بالامانی منذ مائتی سنۃ قال وقال یقطین لابنہ علی بن یقطین ما بالنا قیل وکان وقیل لکم ولم یکن قال فقال لہ

حسن بن علی بن یقطین سے روایت ہے وہ اپنے بھائی حسین سے وہ اپنے باپ علی بن یقطین سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں ابو الحسنؑ نے کہا کہ شیعہ کو دو سو سال سے جھوٹی خبروں سے بہلایا جا رہا ہے یقطین نے اپنے بیٹے علی سے کہا کہ ہم سے جو ہمارے رسول نے کہا وہ ہو گیا اور تم سے ائمہ نے جو کہا وہ جھوٹ نکلا۔ بیٹے نے باپ سے کہا۔ خرج دونوں کا ایک ہے مگر تم سے جو کہا گیا وہ سچا ثابت ہوا

علی ان الذی قیل لنا و لکم کان من مخرج واحد غیر ان امرکم حضر فاعطیتم محضۃ فکان کما قیل لکم وان امرنا لم یحضر فعللنا بالامانی فلو قیل لنا ان ھذا الامر لا یکون الی مائتی سنۃ او ثلثمائۃ سنۃ لقست القلوب لرجع عامۃ الناس عن الاسلام ولکن قالوا ما اسرع الامر واقربہ تالفا لقلوب الناس وتقریبا للفرج

اور ہم شیعہ کو جو پیشگوئی سنائی گئی وہ پوری نہ ہوئی اور ہمیں جھوٹی خبروں سے بہلایا جاتا رہا اگر ہم شیعہ کو کہا جاتا کہ ظہور مہدی ۲۰۰ سال یا ۳۰۰ سال تک نہ ہوگا تو شیعہ کے دل سخت ہو جاتے اور اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جاتے اس لیے شیعہ کی تالیف قلب کے لیے جھوٹ موٹ سے کہا گیا کہ امام مہدی جلد ظاہر ہوں گے۔ تاکہ وہ خوش رہیں۔

۳۔ استقصاء الافہام علامہ مجلسی ۱ : ۳۰

ومنھا ان یکون ھذہ الاخبار تسلیۃ لقوم من المومنین المنتظرین لفرج اولیاء اللہ وغلبۃ اھل الحق واھلہ کما روی فی فرج اھل البیت وغلبتھم لانھم علیھم السلام لو کانوا اخبروا الشیعۃ فی اول ابتلائھم باستیلاء المخالفین وشدتھم فمنعھم انہ لیس فرجھم الا بعد الف سنۃ او الفی سنۃ لیئسوا ورجعوا عن الدین ولکنھم اخبروا شیعتھم بتعجیل الفرج۔

اور از انجملہ ایک تاویل یہ بھی ہے کہ یہ پیشگوئیاں مومنین کی تسلی کے لیے تھیں جو خدا کے دوستوں کی راحت اور اہل حق کے غلبہ کے منتظر تھے جیسا کہ اہل بیت کے آرام اور ان کے غلبہ کے متعلق روایت کیا گیا ہے۔ اگر ائمہ کرام شیعوں کو شروع میں ہی بتا دیتے کہ مخالفین کا غلبہ ابھی رہے گا اور ۲ ہزار یا تین ہزار سال تک شیعہ کو آرام نصیب نہ ہوگا تو شیعہ نا اُمید ہو جاتے اور دین چھوڑ کر مرتد ہو جاتے اس بنا پر ائمہ نے جھوٹی خبریں سنا کر شیعہ کو تسلی دی کہ آرام و راحت کا زمانہ جلد آنے والا ہے۔

ان روایات میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو گئی کہ ظہور مہدی کے متعلق ائمہ کی طرف

سے جتنے اعلانات کئے گئے بالکل جھوٹے تھے ان کا مقصد محض طفل تسلی تھا۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان پیشگوئیوں کے جھوٹا ہونے کا اقرار کرنا ہی تھا تو خدا کے متعلق عقیدہ بدا کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

گذشتہ اوراق میں بیان ہوچکا ہے کہ شیعہ کا کہنا یہ ہے کہ ظہور مہدی کا اعلان خدا کی طرف سے ہوتا رہا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کوئی اعلان نہیں کیا ائمہ نے شیعہ کو موہوم ارتداد سے بچانے کے لیے یہ جھوٹ موٹ کی پیشگوئیاں خود گھڑلیں اور شیعہ کو بہلاتے رہے اس دورنگی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیعہ نے جب خدا کے متعلق عقیدہ بدا ایجاد کیا تو علمائے حق نے گرفت شروع کی شیعہ نے دامن بچانے کے لیے ائمہ کے ذمے لگا دیا کہ ائمہ صادقین جھوٹ بولتے رہے۔ مگر غرض نیک تھی کہ شیعہ کی تالیف قلوب کی جاسکے اور وہ ارتداد سے بچ جائیں۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ان خبروں کو خدا کی طرف منسوب کرنا درست ہے تو خدا کو جاہل ماننا لازم آتا ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ ائمہ صادقین نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو ائمہ کا معصوم نہ ہونا بلکہ جھوٹا اور دھوکا باز ہونا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ باتیں دونوں ہی مشکل ہیں۔ اس سلسلہ کی کڑیاں کچھ اس طرح جڑتی نظر آتی ہیں۔

۱ - ائمہ کے تقدس کو بچانے کے لیے عقیدۂ بدا ایجاد ہوا۔

۲ - عقیدۂ توحید پر اس حملے کی مدافعت میں اہل حق کی طرف سے اعتراضات ہوئے تو ائمہ کو جھوٹی خبریں بنانے اور شائع کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

۳ - اس طرح ائمہ کی عصمت کا عقیدہ مجروح ہوا تو جھوٹ کا لیبل بدل کر اس کا نام تقیہ رکھ دیا گیا۔

۴ - نام بدلنے سے جب کام نہ چلا تو تقیہ میں تقدس کا رنگ بھرا اور بات یہاں تک پہنچی کہ تقیہ کو ۹/۱۰ حصہ دین قرار دے دیا۔ بلکہ اسے دین انبیاء قرار دیا۔ جیساکہ اصول کافی صفحہ ۴۸۳

عن ابی بصیر قال قال ابو عبد اللہ

ابو بصیر (نابینا) کہتا ہے کہ امام جعفر نے

التقیۃ من دین اللہ قلت من دین اللہ قال من دین اللہ ولقد قال یوسف ایتھا العیر انکم لسارقون واللہ ما کانوا سرقوا شیئا ولقد قال ابراھیم انی سقیم واللہ ما کان سقیما۔

فرمایا کہ تقیہ خدا کا دین ہے۔ میں نے عرض کیا خدا کا دین ہے؟ فرمایا خدا کا دین ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا اے قافلے والو تحقیق تم چور ہو خدا کی قسم انہوں نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ اور محقق بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میں بیمار ہوں اور خدا کی قسم وہ بیمار نہیں تھے۔

اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تقیہ کو خدا کا دین ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس سے وہ غرض تو کیا پوری ہوتی البتہ اس امر میں شک کی گنجائش باقی نہ رہی کہ امام جعفرؒ نے فرمایا کہ تقیہ اور جھوٹ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ انہوں نے قسم کھا کے کہا کہ وہ چور نہیں تھے جنہیں چور کہا گیا یہ تقیہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ جو چور نہ ہو اس کو چور کہنا اسی کا نام جھوٹ ہے۔ گویا امام جعفرؒ سے یہ کہلوایا گیا کہ جھوٹ بولنا خدا کا دین ہے۔

رہا حضرت یوسفؑ کے ذمے جھوٹ کی تہمت لگانے کا سوال جناب نابینا (ابو بصیر) نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفرؒ نے قرآن پڑھا ہی نہیں تھا اگر پڑھا تھا تو سمجھا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن کے الفاظ ہیں فاذن موذن ایتھا العیر انکم لسارقون یعنی آواز تو ملازموں نے دی اور امام کہتے ہیں لقد قال یوسف یعنی یوسفؑ نے کہا۔ پیالہ واقعی حضرت یوسفؑ نے رکھا اور بحکم خدا رکھا کیونکہ مضمون کے خاتمہ پر کذلک کدنا لیوسف تقیہ کی صورت تو اس وقت پیدا ہوتی جب حضرت یوسفؑ خود پیالہ رکھ کر خود آواز دیتے کہ تم چور ہو۔

مرض دو قسم کے ہوتے ہیں مادی اور روحانی۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے یہ منظر دیکھنا کہ قوم بت پرستی کرتی ہے [illegible] وہ روحانی [illegible] اس واقعہ میں مرض

شرک کے مظہر مادی تھے مگر اس کا اثر سا فرج تھا جو قلب ابراہیم پر پڑتا تھا۔ اور انہیں قلبی تکلیف اور کڑھن ہوتی تھی اور وہ اسی کڑھن میں مبتلا تھے۔

قرآن کریم نے مرض کی ایک قسم غیر مادی بھی بیان کی ہے جیسے فی قلوبھم مرض اسی طرح انی سقیم کی حقیقت سمجھنا کسی نابینا کے بس کا کام نہیں یہ چشم بینا کا کام ہے بہر حال تقیہ جو جھوٹ کا دوسرا نام ہے کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ کوئی عقیدہ، کوئی عمل اور کوئی واقعہ اس دائرہ سے باہر مشکل ہی سے رہ سکتا ہے۔ مثلاً ۲۳ سال کی محنت شاقہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو مقدس جماعت تیار کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر یہ جماعت بھی تقیہ کی زد میں آگئی۔ شیعہ نے اس جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک طرف حضرت علیؓ اور تین صحابی ہیں جنہوں نے عمر بھر تقیہ کرکے اپنا عقیدہ اور دین چھپائے رکھا دوسری طرف ایک لاکھ کئی ہزار صحابہ جنہوں ازرہ نفاق اپنا اصل عقیدہ چھپائے رکھا حالانکہ نفاق بھی جھوٹ ہے اور تقیہ بھی جھوٹ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس میں صرف جھوٹے لوگوں کی ایک فوج تیار کی اور جس صرف ایک سچا آدمی بھی حضورؐ سے تیار نہ ہو سکا (معاذ اللہ) ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہیں مرغ قبلہ نما آشیانے میں

IV بحث علمائے شیعہ اور تاویلات عقیدۂ بدا:۔

گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکا ہے کہ ائمہ صادقین نے یہ جھوٹی پیشگوئیاں محض شیعہ کی تسلی اور تالیف قلوب کے لیے گھڑیں اور بیان کیں۔ اس کے بعد عقیدہ بدا کی ضرورت باقی نہیں رہتی پھر بھی خدا کے متعلق اس عقیدہ کو اساس دین بنانے کے لیے بہت کوشش کی گئی۔

لفظ بدا کی تحقیق میں علامہ طوسی کی روایت بیان کی گئی ہے جو نقد محصل میں موجود ہے یہ امام جعفرؒ سے منقول ہے۔ اصول کافی کی روایت بدا امام نقی سے کتاب الغیبۃ کی روایت امام جعفرؓ اور حضرت علیؓ سے منقول ہے اور انوار نعمانیہ

کی روایت بھی امام جعفرؒ سے منقول ہے ان سب روایات میں یہ حقیقت صاف بیان ہوئی ہے کہ خدا بھول گیا۔ پھر بھی تاویلات میں کمی نہیں کی گئی۔

(۱) سید نعمت اللہ الجزائری کی تاویل ملاحظہ ہو۔

قلت لیس معناہ ما قالوا بل معناہ واللہ اعلم ان الشیعۃ تعتقد ان الامامۃ فی اسمٰعیل لانہ اکبر الاولاد وان الامامۃ فی الاکبر فلما مات اسمٰعیل فی زمن ابیہ ظہر للشیعۃ انہ لیس بامام فذلک البدا الذی بدا اللہ ھو فی ظاھر الحال عند الشیعۃ لا فی الواقع ولفنس الامر۔

میں کہتا ہوں اس کے وہ معنی نہیں جو انہوں نے بیان کئے بلکہ معنی یہ ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ شیعہ کا یہ عقیدہ ہو چکا تھا کہ امامت بڑے بیٹے اسمٰعیل میں ہوگی۔ جب اسمٰعیل اپنے والد کی زندگی میں مر گئے تو شیعہ کو معلوم ہو گیا کہ اسمٰعیل تو امام نہ تھے۔ پس یہ وہ بدا ہے جو بدا اللہ کہا گیا ہے پس شیعہ کے نزدیک یہ صورۃً تو بدا ہے مگر حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے بدا نہیں۔

تاویل تو خوب ہے مگر اس میں چند باتیں قابل غور ہیں:۔

فرمایا ان الشیعۃ تعتقد یعنی شیعہ میں یہ عقیدہ مشہور ہو چکا تھا کہ امامت بڑے لڑکے میں ہوتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ یہ بات یونہی مشہور ہو گئی تھی یا یہ ایک مقررہ اور مسلمہ قانون تھا؟ اگر یہ مسلمہ اصول تھا تو ظاہر ہے کہ شیعہ نے ائمہ سے ہی لیا ہوگا اور روایات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر یہ قانون شیعہ کے ہاں مسلمہ اصول نہیں تو عوام شیعہ نے اپنی طرف سے مشہور کرکے اسمٰعیل کو امام بنا دیا۔ اس صورت میں باقی ائمہ کو بھی ایسے ہی امام مشہور کر دیا ہو تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ اور شیعہ کے نزدیک امامت تو نبوت سے افضل ہے اگر محض لوگوں کے مشہور کر دینے سے کوئی امام بن سکتا ہے تو لوگوں کے لیے نبی بنانا اور آسان تر ہے۔

بدا کی ایک روایت کے الفاظ میں ما بدا للہ فی شیٔ کما بدا لہ فی اسمٰعیل ابنی میں

بدا خدا کا ذکر ہے بداالشیعہ کا نہیں اس لیے یہ فی ظاہر الحال و رنفس الامر کی بھول بھلیاں بے معنی معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) انوار نعمانیہ ۱ : ۲۰۹

ولکن لیس معنی البدا ما ذکروہ بل معناہ ظهور شیٔ للخلائق لم یکن ظاهرا لهم قبل ذلک والا فهو ظاهر عنده سبحانه والنسخ فرد من افراد البدا و قوله یمحو الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب۔

بدا کے معنی وہ نہیں جو انہوں نے بیان کئے بلکہ معنی یہ ہیں کہ جو چیز پہلے مخلوق پر ظاہر نہ تھی اب ظاہر ہوگئی ورنہ خدا پر تو ظاہر تھی۔ اور نسخ تو بدا کے افراد میں سے ایک فرد ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے قائم رکھتا ہے۔

یہ تاویل بھی اسی قبیل سے ہے مگر اس تضاد کو رفع نہیں کیا جا سکتا کہ ائمہ سے منقول ہے خدا کو علم نہ تھا۔ محدث الجزائری کہتے ہیں مخلوق کو علم نہ تھا۔

محدث صاحب کا دوسرا دعویٰ یہ ہے نسخ ایک فرد ہے بدا کی مگر یہ بات بھول گئے کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے اخبار میں نسخ جائز نہیں ہوتا۔ امامت اسماعیل کا اعلان جو خدا کی طرف سے ہوا وہ از قبیل اخبار ہے۔ اور تخلف حکم اخبار کا مستلزم ہے کذب باری تعالےٰ کو اس لیے نسخ قرار دینے کا معاملہ تو اور بھی زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

نسخ، محو و اثبات اور بدا میں فرق :-

نسخ اور محو و اثبات ایک چیز کے دو نام ہیں اس صورت میں خدا تعالیٰ کو نہ کوئی غلط فہمی ہوتی ہے نہ کوئی حکم اس سے مخفی ہوتا ہے نہ کوئی رائے بدلتی ہے اور بدا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے علمائے اصول نے نسخ اور محو و اثبات کا مستقل باب قائم کرکے مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ نسخ کو بدا سے دور کا واسطہ بھی نہیں بلکہ یہ دونوں متضاد ہیں۔

تفسیر اتقان ۲ : ۲۱

وقد اجمع المسلمون علی جوازہ (النسخ) وانکرہ الیهود ظنا منهم انه بدا کالذی یری الرای ثم یبدو له وهو باطل۔

نسخ احکام کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ یہود اس کے منکر ہیں ان کا خیال ہے نسخ بھی بدا کی مانند ہے کہ سابقہ رائے کو بدل دیا کہ وہ ٹھیک نہ تھی اور وہ باطل ہے۔

اور النسخ فی حق صاحب الشرع بیان لمدة الحکم المطلق الذی کان معلوما عند الله الا انه تعالی اطلقه ظاهره البقاء فی حق البشر فکان تبدیلا فی حقنا بیانا محضا فی حق صاحب الشرع۔ نامی شرح حسامی ص۱۲۱

نسخ، صاحب شرع کے حق میں حکم مطلق کی مدت کا بیان ہے جو خدا تعالےٰ کو معلوم تھی مگر اس نے اس حکم کو مطلق بیان کیا جس سے بظاہر بقائے حکم معلوم ہوتا ہے لہٰذا اس حکم کا تبدیل ہونا صرف مخلوق کے حق میں ہے اور صاحب شریعت کے لیے بیان حکم ہے کہ فلاں وقت تک یہ حکم نافذ رہیگا۔

اور التوضیح والتلویح ص ۵۰۶-۵۰۵ پر نسخ کی بحث میں لکھا ہے۔

هو جائز فی احکام الشرع عندنا خلافا للیهود قالت الیهود ان النسخ لا یجوز لانه یکون بدون مصلحة لامتناع العبث علی الحکیم بل یکون لحکمة خفیت اولا فظهرت ثانیا و هذا رجوع عن المصلحة الاولی بالاطلاع علی مصلحة اخری فیلزم البدا او الجهل وکلاهما محالات علی الله تعالی۔

ہمارے نزدیک احکام شرع میں نسخ جائز ہے یہود اس کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ نسخ جائز نہیں کیونکہ نسخ کسی مصلحت کی وجہ سے ہوگا بلکہ نسخ کسی مخفی حکمت کی بنا پر ہوگا وہ حکمت رجوع ہے جو مصلحت ثانی کے ظاہر ہونے کی وجہ سے ہوا پس خدا پر بدا اور جہل لازم آئے گا اور یہ دونوں خدا کے لیے محال ہیں۔

البدا عبارة عن الظهور بعد الخفاء

بدا۔ چیز کے ظہور سے عبارت ہے جو پہلے

من قولهم بدا لهم الامر الخلاف اذا ظهر بعد خفائه وقد قال الله تعالیٰ وبدا لهم من الله ما لم یکونوا یحتسبون۔

خدا پر مخفی تھی جیسا کہ عربوں میں مشہور ہے کہ فلاں کام ان پر ظاہر ہوگیا جو پہلے ان سے پوشیدہ تھا۔ اور فرمان باری تعالیٰ ہے کہ ان پر وہ چیز ظاہر ہوئی جس کا انہیں خیال بھی نہیں تھا۔

معلوم ہوا کہ بدا اور نسخ دو مختلف چیزیں ہیں البتہ یہود نے نسخ اور بدا کو ایک ہی شے قرار دیا ہے اور شیعہ محدثین نے یہود کی تقلید میں نسخ اور بدا کو ایک ہی چیز سمجھا ہے اتنی بات تو یہود بھی جانتے ہیں کہ عقیدہ بدا تسلیم کرنے سے خدا کے لیے جہل لازم آئے گا۔

بدا بمعنی ابدا :-

شیعہ علماء کی ایک تاویل یہ ہے کہ اہل السنت والجماعت نے بدا بمعنی ابدا بیان کیا ہے جیسا کہ علامہ ابن اثیر جزری کی کتاب میں موجود ہے اس لیے شیعہ بھی بدا بمعنی ابدا لے سکتے ہیں یعنی خدا نے دوسروں پر ظاہر کیا۔ اس صورت میں اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔

اس تاویل کے سلسلے میں چند امور قابل غور ہیں۔

(۱) یہ بیان تو درست ہے مگر اہل السنت کے ہاں ایسا کوئی واقعہ موجود نہیں جو خدا نے بھول جانے کی دلیل بن سکے۔ پھر اہل السنت نے خدا کے جاہل ہونے کا کوئی الگ مستقل باب قائم نہیں کیا اس کے برعکس شیعہ کے ہاں بدا کے بیسیوں واقعات موجود ہیں اور شیعہ نے بدا پر مستقل باب قائم کیا ہے۔ اور جہل خدا پر تفصیلی بحث کر کے اس کی وضاحت کی ہے کہ خدا کو فلاں فلاں وقت فلاں شخص کے متعلق غلطی لگی اس لیے شیعہ کی یہ تاویل نہیں چل سکتی۔

(۲) اگر یہ تاویل درست ہے تو محقق طوسی نے بدا کا انکار کیوں کیا ؟

(۳) علامہ دلدار علی مجتہد نے بدا کا مستلزم جہل خدا ہونا کیوں بیان کیا ؟

شیعہ حضرات نے ایک اور پہلو اختیار کیا کہ انبیاء کرامؑ کو مستقبل کے متعلق خدا نے جو خبریں دیں وہ بھی غلط ثابت ہوئیں اس لیے اگر ائمہ کی پیشگوئیاں غلط ثابت ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔ مثلاً

(۱) خدا نے حضرت یونسؑ سے فرمایا کہ تمہاری قوم پر عذاب آئے گا مگر فلاں شرط سے۔ اور وہ شرط حضرت یونسؑ کو نہ بتائی جس سے حضرت یونسؑ کو غلطی لگی۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ نے ۳۰ راتوں کا وعدہ دیا۔ مگر تورات نہ ملی اور دس راتوں کا اضافہ کیا۔

(۳) حضور اکرمؐ نے اپنے بیٹے ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا۔ لو عاش ابراهیم لکان صدیقا نبیا یعنی خدا کو بدا ہوگیا۔

(۴) اللہ تعالےٰ نے حضور اکرمؐ کو فرمایا کہ تم اس سال مسجد حرام میں امن و امان سے داخل ہوگے مگر کفار مکہ نے داخل نہ ہونے دیا اور پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔

ان چاروں امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱) حضرت یونسؑ کے واقعہ کے متعلق تفسیر کبیر اور تفسیر مظہری میں موجود ہے۔

والصحیح ان المراد برویة العذاب الالیم المانع من قبول الایمان رویة العذاب الاخروی عند حصول الموت حین یری الملائکة الموت - الا تری ان الکفار عذبوا یوم بدر بالعذاب الدنیوی من القتل والاسر وغیر ذلك ثم امن بعض من بقی حیا وکذا کان حال قوم یونس انهم امنوا قبل رویة العذاب الاخروی فقبل الله ایمانهم بعد ما راو العذاب فی الدنیا ثم لما امنوا کشف الله عنهم العذاب الخزی فی الحیاة الدنیا

صحیح بات یہ ہے قبول ایمان سے صرف عذاب اخروی کا دیکھنا مانع ہے جب انسان موت کے فرشتوں کو دیکھ لے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کفار کو بدر میں دنیا کا عذاب یعنی قتل اور قید دیا گیا مگر جو بچ رہے ان میں سے بعض ایمان لے آئے۔ یہی حال قوم یونسؑ کا ہے یہ قوم بھی عذاب اخروی دیکھنے سے پہلے ایمان لے آئی اور خدا تعالےٰ نے عذاب اخروی ٹال

مظہری ۵ : ۱۵۶	دیا جو دنیا میں ذلیل کنندہ تھا۔

ظاہر ہے کہ عذاب دنیا دیکھ اور چکھ لینے کے بعد ایمان قبول ہو جاتا ہے مگر عذاب اخروی دیکھنے کے بعد ایمان قبول نہیں ہوتا اور قوم یونسؑ اس عذاب کو دیکھ کر ایمان لائی جو مانع ایمان نہیں۔ صاحب مظہری نے وضاحت کر دی کہ جب اخروی عذاب کے اسباب ظاہر ہو جائیں مثلاً علامات موت سامنے آجائیں یا ملک الموت ظاہر ہو جائے تو ایمان اضطراری ہو جاتا ہے جو قبول نہیں مگر قوم یونسؑ کے سامنے جو اسباب ہلاکت آئے وہ عذاب دنیوی کے تھے اس لیے بدا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تفسیر کبیر ۵ : ۲۹

فقالوا ان رانا اسباب الهلاك أمنابك.	قوم نے کہا جب ہم اسباب ہلاکت دیکھیں گے تو ایمان لے آئیں گے۔

یہ شرط انہوں نے پوری کر دی اور عذاب اخروی ٹل گیا۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی تفصیل تفسیر کبیر ۴ : ۲۸۴

وفائدة هذا التفصيل ان الله امره ان يصوم ثلاثين يوما وان يعمل فيها مايقربه الى الله تعالى ثم انزلت التوراة فى العشر البواقى وكلمه ايضا فيه فهذا هو الفائدة فى تفصيل الاربعين الى ثلاثين والى العشرة.	اس تفصیل کا فائدہ یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ۳۰ روزے رکھنے کا حکم دیا کہ ان راتوں میں وہ عمل کریں جو قرب الٰہی کا سبب بنے پھر باقی دس راتوں میں تورات نازل ہوئی اور کلام ہوئی۔ تیس اور دس کی تفصیل سے بیان کرنے کا یہ فائدہ ہے۔

اور سورہ بقرہ میں ہے :۔

واذ وعدنا موسى اربعين ليلة	اور ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔

ماحصل یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے چالیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اس کی تفصیل بتا دی کہ تیس دن کے بعد تورات ملنی شروع ہوگی۔ اس لیے یہاں بدا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ ہے

کہ اس میں ایسے کمالات تھے کہ اگر زندگی ہوتی اور نبوت کا سلسلہ ختم نہ ہو چکا ہوتا تو اسے نبی بنایا جاتا۔ حضورؐ نے کب یہ فرمایا کہ خدا کو بدا ہوگیا۔ امامت اسماعیل کے بارے میں تو صاف روایت موجود ہے کہ خدا کو بدا ہوگیا۔

(۴) مسجد حرام میں داخلہ کی بشارت کے ساتھ اسی سال داخلہ کا ذکر نہ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ حضورؐ نے۔ لوگوں نے اپنے قیاس سے اسی سال کی تعلین سمجھ لی۔ حضور اکرمؐ نے بعد میں صحابہ کو اس غلط فہمی سے آگاہ فرمایا۔ اور حضورؐ اپنے محبوب صحابہ سمیت موعودہ وقت پر امن سے مسجد حرام میں داخل ہوئے اور کفار کی قوت ختم ہوگئی خدا کا وعدہ پورا ہوگیا۔ اعجاز الحسن بدایونی نے تنبیہ السامعین میں مسجد حرام میں داخلہ کے ساتھ حفاظت قرآن کا مسئلہ بھی ملا لیا اور فرمایا کہ خدا نے یہ دو وعدے کئے تھے مگر صحابہ نے پورے نہ ہونے دئے دونوں پورے نہ ہوئے یعنی یک نہ شد دو شد۔

باب دوم

عقیدۂ رسالت

عقیدۂ رسالت سے مراد اجمالی طور پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ہر زمانے میں انبیاء مبعوث فرمائے۔ یہ سب سچے تھے۔ اللہ کی طرف سے مامور تھے۔ معصوم عن الخطا تھے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں۔

مخلوق میں انبیاء کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ کسی نبی کی ذات، صفات یا اس کے متعلقہ کسی چیز کی توہین کرنا ایمان سے محروم اور اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ ہیں جو نسل انسانی کے جدِ امجد بھی ہیں۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو ذکر آیا ہے اس سے ان کی عظمت اور فضیلت کا اظہار ہوتا ہے

۱ - واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس۔

۲ - ابلیس نے ان کی عظمت کا انکار کیا تو سزا ملی۔

۳ - ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین (۴) ان اللہ اصطفیٰ آدم .....

۴ - فاجتباہ ربہ۔

اسی قسم کی متعدد آیات موجود ہیں جو آدمؑ کے اجتباء، اصطفاء اور عظمت پر دال ہیں۔

شیعہ روایات میں حضرت آدمؑ کے متعلق یہ عقیدے بیان ہوئے ہیں:-

۱ - حیات القلوب ملا باقر مجلسی ۱ : ۶۶

بسند معتبر از صادق منقول است کہ حق تعالیٰ عرض کرد بر آدم ذریت او را در میثاق پس رسولؐ خدا را گذشت و تکیہ زدہ بود بر امیر المؤمنین و حضرت فاطمہ از عقب ایشاں می آمد و حضرت امام حسن و حضرت امام حسین از عقب او می آمدند حق تعالیٰ فرمود کہ اے آدم زنہار نظر حسد سوئے ایشاں مکن کہ ترا از جوار خود فرو می فرستم پس چوں خدا او را در بہشت ساکن گردانید ممثل شدند برائے او محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ پس نظر کرد بر ایشاں بحسد پس عرض شد برو ولایت ایشاں و آں قبول کہ سزاوار بود نکرد۔

امام جعفر صادق سے بسند معتبر روایت ہے کہ روز میثاق میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے سامنے ان کی ذریت پیش کی پس رسول کریمؐ ان کے پاس سے گزرے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ پر سہارا لیا ہوا تھا ان کے پیچھے حضرت فاطمہ تھیں اور عقب میں حسنین آ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم! خبردار انہیں حسد کی نگاہ سے نہ دیکھنا ورنہ میں تمہیں اپنے پڑوس سے نکال دوں گا۔ پھر خدا نے جب انہیں بہشت میں قیام کرایا تو محمدؐ، علیؓ، فاطمہ، حسن، حسین کی صورت ان کے سامنے پیش کی تو حضرت آدمؑ نے انہیں حسد کی نگاہ سے دیکھا پھر ان کی ولایت حضرت آدمؑ کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے کماحقہ اسے قبول نہ کیا۔

اس حسد کی وجہ سے خدا نے آدم و حوا دونوں کو جنت سے نکال دیا۔

۲ - حیاۃ القلوب ۱ : ۶۸

بسند معتبر از امام باقر منقول است کہ مکث آدم و حوا در بہشت تا بیروں آمدن ہفت ساعت بود۔

امام باقر سے سند معتبر کے ساتھ روایت ہے کہ حضرت آدم و حوا کا جنت میں قیام صرف سات گھنٹے رہا۔

۳ - بسند حسن منقول است از حضرت صادق کہ چوں آدم از بہشت فرود آمد خط سیاہی در بدن او بہم رسید و از روئش از سر تا پائش

امام جعفر سے سند حسن کے ساتھ منقول ہے کہ جب آدمؑ بہشت سے نیچے اترے تو ان کے بدن پہ سر سے پاؤں تک سیاہی کا خط تھا۔

۴ - انوار نعمانیہ ۱ : ۸۴

فلما نزل آدم من الجنۃ ظہرت بہ شامۃ سوداء فی وجہہ من

جب حضرت آدمؑ جنت سے نکلے تو ان کے چہرے پر سیاہ داغ ظاہر ہوا جو ان کے پاؤں

قربنا الی قدمه فطال حزنه و بکاءه علی ما ظهر بها ۔

تک پھیل گیا۔ اس داغ کی وجہ سے وہ مدتوں رنج اور گریہ میں مبتلا رہے۔

ان روایات سے حضرت آدمؑ کے متعلق یہ عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود اپنی اس اولاد پر حسد کیا جو ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔

۲۔ ان کی ولایت کو دل سے تسلیم نہ کیا

۳۔ اس حسد کی وجہ سے آدم وحوا دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا۔

۴۔ اس حسد کی وجہ سے ان کے چہرہ بلکہ سارے بدن پر سیاہی کا داغ نمایاں کیا گیا۔

اصول کافی باب اصول الکفر وارکانہ میں حضرت آدمؑ کے متعلق ایک اور عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے۔

قال ابوعبدالله اصول الکفر ثلاثة الحرص والاستکبار والحسد فاما الحرص فان آدم حین نهی عن الشجرة حمله الحرص علی ان اکل منها واما الاستکبار فابلیس حیث امر بالسجود لآدم فابی۔ واما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدهما صاحبه۔

کفر کے اصول تین ہیں حرص تکبر اور حسد۔ جہاں تک حرص کا تعلق ہے جب آدمؑ کو درخت سے منع کیا گیا تو حرص کی وجہ سے انہوں نے اس میں سے کھا لیا تکبر تو ابلیس کو آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم ملا اس نے انکار کیا اور حسد کی وجہ سے آدمؑ کے ایک بیٹے نے دوسرے کو قتل کیا۔

یعنی حضرت آدمؑ میں اصول کفر میں سے ایک اصل تو حرص اور دوسری حسد پائی جاتی تھی اور حسد کا نتیجہ اصول کافی مع شرح صافی باب الحسد ص۱۴۴ پر بیان ہوا ہے

قال ابوجعفر ان الحسد لیاکل الایمان کما تاکل النار الحطب۔

امام باقر فرماتے ہیں کہ حسد ایمان کو یوں کھا جاتا ہے جیسے آگ ایندھن کو۔

انہی الفاظ میں ایک روایت امام جعفر سے منقول ہے اور ان سے حسد کی

وضاحت بھی منقول ہے۔

عن ابی عبدالله قال ان المؤمن یغبط ولا یحسد والمنافق یحسد ولا یغبط

امام جعفر فرماتے ہیں کہ مومن غبطہ کرتا ہے حسد نہیں کرتا اور منافق حسد کرتا ہے غبطہ نہیں کرتا۔

اصول کافی باب البغض ص۵۴۳ پر حسد کو اور نکھار دیا گیا ہے۔

عن ابی عبدالله قال یقول ابلیس لجنوده القوا بینهم الحسد والبغض فانهما یعدلان عند الله الشرک۔

امام جعفر فرماتے ہیں کہ ابلیس اپنے لشکر سے کہتا ہے ان میں حسد اور بغض ڈال دو کیونکہ وہ اللہ کے نزدیک شرک کے برابر ہیں۔

اور انوار نعمانیہ ۱ : ۲۶۱

ان المنافق یحسد ولا یغبط وان صلوٰة الحاسد ترد من السماء الخامسة

منافق حسد کرتا ہے غبطہ نہیں کرتا اور حاسد کی نماز پانچویں آسمان سے رد کر دی جاتی ہے

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ:-

۱۔ حسد ایمان کو یوں مٹا دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو۔

۲۔ حسد کرنا منافق کا شیوہ ہے۔

۳۔ حاسد کی نماز مقبول نہیں۔

۴۔ حسد اور شرک عند اللہ برابر ہیں۔

اور شیعہ کے ہاں یہ مسلم ہے کہ آدمؑ نے حسد کیا پھر ان روایات کی روشنی میں سب سے پہلے نبی کی جو حیثیت ثابت ہوتی ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

انوار نعمانیہ ۱ : ۲۴۳ میں شیخ صدوق کی کتاب عیون الاخبار سے نقل کیا گیا ہے

ان آدم علیه السلام لما اکرمه الله تعالیٰ باسجاد الملائکة له وبادخال الجنة قال فی نفسه هل خلق الله بشرا افضل منی فعلم الله عزوجل ما وقع فی نفسه فناداه ارفع رأسک الی ساق العرش فرفع رأسه

آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے یوں عزت بخشی کہ فرشتوں کو ان کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور ان کو جنت میں داخل کیا۔ انہوں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اللہ نے مجھ سے بہتر بھی کوئی بشر پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے

فنظر الی ساق العرش فوجد مکتوبا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ابن ابی طالب وزوجتہ فاطمہ سیدۃ لنساء العالمین و الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنۃ الخ .... قال ھؤلاء من ذریتک وھم خیر منک ومن جمیع خلقی ولولاھم ما خلقتک ولا خلقت الجنۃ والنار ولا السماء والارض فایاک ان تنظر الیھم بعین الحسد وتمنی منزلتھم فسلط علیہ الشیطان الی ان قال وتسلط علی حوی لنظرھا الی فاطمۃ بعین الحسد

دل کی بات معلوم کرلی اور آدمؑ کو آواز دی اپنا سر اٹھا اور عرش کو دیکھ۔ آدمؑ نے دیکھا کہ لکھا ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور علی ابن ابی طالب ان کی بیوی فاطمہ دنیا کی عورتوں کی سردار حسن اور حسین جوانان جنت کے سردار یہ تیری اولاد سے ہے اور تجھ سے اور ساری مخلوق سے افضل ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تجھے پیدا کرتا نہ جنت دوزخ کو نہ زمین و آسمان کو خبردار انہیں حسد کی نگاہ سے نہ دیکھنا پھر پھر شیطان حضرت آدمؑ پر مسلط ہوگیا ..... اور حوا پر شیطان مسلط ہوگیا اس نے فاطمہ کی طرف حسد کی نگاہ سے دیکھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت آدمؑ خود بینی اور عجب میں مبتلا ہوئے حضرت آدمؑ نے ان کے مرتبہ تک پہنچنے کی آرزو کی۔ اس کی سزا میں شیطان ان پر مسلط کیا گیا۔ حضرت حوا نے حسد کیا ان پر بھی شیطان مسلط ہوگیا۔

قرآن مجید میں جہاں شیطان کا چیلنج ذکر کیا گیا ہے وہاں اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کا یہ جواب بھی ملتا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ یعنی جو میرے خاص بندے ہوں گے ان پر تو مسلط نہ ہوسکے گا۔ یعنی نبوت تو بہت اونچا مقام ہے حضرت آدمؑ تو اللہ کے خاص بندوں کے زمرہ میں بھی شمار کے لائق نہ رہے (معاذ اللہ)

حسد جیسی محبط اعمال صفت کو اللہ کے کسی نبی کی ذات سے منسوب کرنا طبع سلیم پر گراں گزرتا ہے اس لیے شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ روایات صحیح نہیں ہیں۔ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے مگر اس کا کیا جواب کہ محدثین شیعہ نے یہ روایات ائمہ معصومین سے بیان کی ہیں اور "بسند معتبر" اور "بسند حسن" کی قید سے بیان کی ہیں۔

ایک اور وضاحت یہ کی گئی ہے کہ حسد بمعنی غبطہ بھی آتا ہے مگر ان روایات میں حضرت آدمؑ کے متعلق جہاں حسد کا لفظ آیا ہے اسے غبطہ قرار دینا دو وجہ سے ممکن نہیں۔ اور غبطہ اور حسد کے الفاظ کے ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں مثلاً

ان المؤمن یغبط ولا یحسد والمنافق یحسد ولا یغبط

دوم یہ کہ غبطہ ایک جائز فعل ہے اس لیے غبطہ کرنے پر وعید کا بیان ہونا ممکن نہیں جس وصف کی بنا پر حضرت آدمؑ پر شیطان کو مسلط کیا گیا۔ ان کا چہرہ اور جسم سیاہ کردیا گیا انہیں جنت سے نکالا گیا وہ غبطہ نہیں ہوسکتا۔ صرف حسد بمعنی حسد ہی ہوسکتا ہے یہاں تو حسد ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جو ارکان کفر میں سے ہے اور جو عند اللہ شرک کے ہم پلہ ہے۔

حضرت یوسفؑ

اب ایک اور نبی کے متعلق شیعہ عقیدہ ملاحظہ ہو؟

بچندیں سند معتبر از حضرت صادق منقول است کہ چوں یوسفؑ باستقبال حضرت یعقوب بیروں آمد وکید یگر را ملاقات کردند یعقوبؑ پیادہ شد و یوسفؑ را شوکت پادشاہی مانع شد و پیادہ نشد وہنوز از معانقہ فارغ نشدہ بودند کہ جبرئیل بہ حضرت یوسف نازل شد و خطاب مقرون بعتاب از جانب رب الارباب آورد کہ اے یوسفؑ خداوند عالمیان می فرماید کہ ملک

امام جعفر صادق سے معتبر سند کے ساتھ منقول ہے کہ جب حضرت یوسفؑ اپنے والد کے استقبال کے لیے باہر آئے ایک دوسرے سے ملاقات کی اس طرح کہ حضرت یعقوبؑ پیادہ ہوگئے اور یوسفؑ کو شوکت پادشاہی مانع آئی اور سوار ہی رہے ابھی معانقہ سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ جبرئیل نازل ہوئے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے عتاب آمیز پیغام دیا کہ یوسفؑ! خداوند عالم فرماتا ہے کہ تیرے لیے بادشاہی کا غرور رکاوٹ بنا کہ میرے برگزیدہ صدیق بندے کیلئے

وشاہی ترا مانع شد کہ پیادہ شوی برائے بندۂ شائستہ صدیق من ۔ دست خود را بکشا چوں دست را کشود از کف دستش وبروایتے از میان انگشتانش نور نبوت بیروں رفت گفت ایں چہ نور بود ای جبرئیل؟ گفت نور پیغمبری بود از صلب تو پیغمبر بہم نخواہد رسید بعقوبت آنچہ کردی بہ یعقوب کہ برائے او پیادہ نشدی (حیاۃ القلوب ۱: ۲۲۹)

سواری سے نہ اترے - ہاتھ نکال - جب ہاتھ نکالا تو ان کی ہتھیلی سے اور بروایت انکی انگلیوں کے درمیان سے نورِ نبوت باہر نکل گیا پوچھا جبرئیل! یہ کیسا نور تھا جبرئیل نے جواب دیا یہ نورِ نبوت تھا - اب تیری نسل سے کوئی پیغمبر نہیں ہوگا یہ اس جرم کی سزا ہے کہ تو یعقوب کے لیے سواری سے نہیں اترا -

---

معلوم ہوا کہ (۱) حضرت یوسفؑ اپنے مدت سے بچھڑے ہوئے والد اور اللہ کے نبی کے استقبال کیلئے گئے مگر سواری سے نہ اترے ہاں معانقہ کر لیا - مگر اس کی کوئی صورت تصور میں نہیں آسکتی کہ ایک آدمی گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو دوسرا زمین پر کھڑا ہوا اور وہ معانقہ بھی کرلیں ممکن ہے حضرت یعقوبؑ کا قد اتنا لمبا ہو کہ زمین پر کھڑے ہوتے ہوئے ان کا سینہ حضرت یوسفؑ کے سینے کے برابر ہو جو گھوڑے پر سوار تھے -

۲ - حضرت یوسفؑ پر اللہ تعالےٰ کا عتاب نازل ہوا -

۳ - ان کو فوری طور پر سزا یہ ملی کہ نورِ نبوت ہاتھوں کے راستے خارج ہو گیا - یعنی نورِ نبوت گیا - تو نبوت بھی گئی اور منصب نبوت سے معزول کر دئے گئے - جیسے نورِ ایمان چلا جائے تو ایمان چلا جاتا ہے -

۴ - ان کی نسل کو نبوت کے منصب سے محروم کر دیا گیا - اب یہ دیکھنا علمائے انساب کا ہی کام ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تک جو انبیائے بنی اسرائیل آتے رہے وہ کس کی نسل سے تھے -

اہل السنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ نبوت وہبی چیز ہے یہ منصب سلب نہیں ہوتا اور نبی اپنے منصب سے کبھی معزول نہیں ہوتا -

حضرت یونس علیہ السلام

حیاۃ القلوب ۱: ۸۸۵ حضرت زین العابدین اور مچھلی کا مکالمہ -

پس فرمود ای ماہی ناگاہ ماہی سر از دریا بیروں آورد مانند کوہ عظیم و میگفت لبیک لبیک ای ولی خدا حضرت فرمود کہ تو کیستی گفت من ماہی یونسؑ ام اے سید من فرمود کہ ما را خبر دہ قصۂ یونس چگونہ بود؟ ماہی گفت اے سید من! حق تعالیٰ ہیچ پیغمبر را مبعوث نگرداندہ است از آدم تا جد تو محمدؐ مگر آنکہ ولایت شما اہل بیت را برو عرض کرد پس ہر کہ قبول کرد سالم ماند و ہر کہ اِبا کرد مبتلا گردید تا آنکہ حق تعالیٰ یونسؑ را بہ پیغمبری مبعوث گردانید پس حق تعالیٰ وحی نمود باو کہ اے یونس! مقبول کن ولایت امیر المؤمنین و ائمہ راشدان از صلب او را با سخناں کہ با دوحی نمود - یونسؑ گفت چگونہ اختیار کنم ولایت کسے را کہ او را ندیدم و نمی شناسم و رفت بکنار دریا - پس خدا وحی نمود بمن کہ یونسؑ را فرو بردم تا آنکہ قال لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین قبول کردم ولایت امیر المؤمنین را و ائمہ راشداں را از فرزندان او -

پس فرمایا اے مچھلی! اچانک مچھلی نے دریا سے سر نکالا وہ ایک عظیم پہاڑ کی طرح تھی اور کہا اے خدا کے دوست میں حاضر ہوں امام نے پوچھا تو کون ہے کہا میں یونسؑ کی مچھلی ہوں فرمایا مجھے یونسؑ کا قصہ سنا مچھلی نے کہا اے میرے سردار اللہ تعالےٰ نے آدمؑ سے لیکر محمدؐ تک کوئی نبی نہیں بھیجا جس کے سامنے آپ کی ولایت نہ پیش کی ہو جس نبی نے ولایت قبول کی وہ بچ گیا جس نے انکار کیا ابتلا میں آگیا - حتیٰ کہ اللہ تعالےٰ نے یونسؑ کو مبعوث فرمایا اور یہ وحی کی کہ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد میں سے ائمہ کی ولایت قبول کر جیسا کہ تجھے حکم دیا جاتا ہے یونسؑ نے کہا جسے میں نے دیکھا بھی نہیں اس کی ولایت کیونکر قبول کروں یہ کہہ کے یونسؑ دریا کے کنارے کی طرف چل دئے پھر خدا نے مجھے وحی بھیجی اور یونسؑ کو نگل لیا حتیٰ کہ انہوں نے کہا لا الٰہ الا انت الخ تب سے حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد میں سے ائمہ راشدین کی ولایت قبول کی -

اس روایت سے نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں ۔

(۱) مچھلی نے کتنی طویل عمر پائی تھی کہاں حضرت یونسؑ کا زمانہ جب وہ انہیں نگلنے کے قابل تھی اور کہاں حضرت زین العابدین کا زمانہ ۔

(۲) مچھلی کا علم اتنا وسیع تھا کہ آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء کے متعلق یہ جانتی تھی کہ منصب نبوت پر فائز کرنے سے پہلے ان سے ولایت ائمہ کا اقرار لیا جاتا تھا ۔ مچھلی نے یہ نہیں بتایا کہ ان سے توحید کا اقرار بھی لیا جاتا تھا یا اس کی ضرورت نہ تھی صرف ولایت کا اقرار کافی تھا ۔

(۳) جن انبیاء نے ولایت ائمہ کا اقرار کیا مزے سے نبوت کی جنہوں نے انکار کیا طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہوئے ۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر آتے ہیں چنانچہ کونسی مصیبت ہے جو حضورؐ پر نہیں آئی ۔ مچھلی کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ سمیت تمام انبیاء پر جو مصائب آتے رہے ان کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ولایت ائمہ کا انکار کیا ۔

(۴) حضرت یونسؑ، اللہ تعالےٰ کا حکم سن کر تعمیل کرنے کی بجائے دریا کو چل دیے گویا اللہ سے روٹھ گئے ۔

(۵) جب انہوں نے ولایت ائمہ کا اقرار کیا تو جان چھوٹی یعنی ان کا ایمان اضطراری ہوا اور اضطراری ایمان تو قابل قبول نہیں ممکن ہے انہوں نے تقیہ کیا ہو ۔ مگر تقیہ سے تو صرف مخلوق کو دھوکا دیا جا سکتا ہے ۔ علیم بذات الصدور خالق کو تو دھوکا نہیں دیا جا سکتا ۔

(۶) امامت کا مرتبہ نبوت سے بلند ہے ۔ کیونکہ امامت کے اقرار کے بغیر نبوت کا منصب ملتا ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو مصائب جھیلنے پڑتے ہیں ۔ چنانچہ منصب امامت کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے علامہ باذل نے حضرت علیؓ کی تعریف میں لکھا ہے :۔

حملہ حیدری ۔ علامہ باذل ایرانی ۱ : ۵

علی صاحب اختیار جہاں   علی صاحب حکم بر آسماں
روا است تا عرش فرمان او   ملائک چو حجاب و دربان او
رہانندۂ موسیٰ از رود نیل   دمانندۂ گل ز نار خلیلے
بساحل رسانندۂ فلک نوح   کشانندۂ یا بہائے فتوح
خدا را مباہات ز ایجاد او   نبی را تظاہر ز امداد او ،
ہوا خواہ او جبرئیل امین   بفرمان او آسمان و زمین
تعجب دریں امر چنداں مکن   کہ در قدر او نیست جائے سخن
ندانی خدا مر علیؓ را ولے   ندانی خدا تا ندانی علیؓ
ہمہ وارث علم پیغمبری   بود غیر شاں کاذب و مفتری
ہمہ چوں محمدؐ منزہ صفات   ہمہ صاحب حکم بر کائنات
بعلم و بقدرت ہمہ ممتلی   ہمہ چوں محمدؐ ہمہ چوں علیؓ

اس منظوم عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ کے پہلے امام حضرت علیؓ کی شان یہ ہے کہ انکا حکم اور اختیار زمین و آسمان پر چلتا ہے ۔ حضرت موسیٰؑ کو دریائے نیل سے انہوں نے پار اتارا نار ابراہیم کو گلزار انہوں نے بنایا کشتی نوح کو بسلامت ساحل پر انہوں نے لگایا ۔ حضور اکرمؐ بھی حضرت علیؓ کی امداد کے محتاج ہیں ۔ حضورؐ کے علم وارث ہیں ان کے بغیر جو شخص علم کی بات کرتا ہے وہ جھوٹا ہے ۔ حضرت علیؓ بھی حضورؐ کیطرح معصوم عن الخطا ہیں ۔ آپ کا حکم کائنات پر چلتا ہے اس طویل نظم میں اگر حضرت علیؓ کے نام کی جگہ اللہ کا نام رکھ کر پڑھو تو توحید کی معرفت حاصل ہو گی اور اللہ کے نام کی جگہ علیؓ کا نام رکھ دو تو امامت کی شان معلوم ہو جائے گی ۔ اور دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر پڑھو تو معلوم ہو گا کہ امامت اور الوہیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ۔ اس لیے نبوت تو واقعی امامت سے کم درجے کا منصب ٹھیرا ۔

امامت کے اس عظیم منصب کے لیے اللہ تعالےٰ نے کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا ۔ آخری آسمانی کتاب قرآن مجید میں اس منصب کا ذکر تک نہیں ۔ اور آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نے مسئلہ امامت بیان ہی نہیں فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے بار بار اس کی تاکید فرمائی مگر خدا کا رسول ڈر کے مارے اسے بیان کرنے سے گریز کرتا رہا۔ آخر حکم ہؤا کہ اگر اعلان نہ کیا تو دفترِ نبوت سے نام کاٹ دیا جائے گا۔ پھر بھی خاموشی رہی آخر خدا کی طرف سے تسلی دی گئی کہ واللہ یعصمک من الناس اس یقین دہانی کے باوجود اعلان کیا بھی تو بڑا مبہم من کنت مولاہ فعلی مولاہ امامت کا منصب جس لفظ سے بیان کیا وہ لغتِ عرب میں بائیس معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور لطف یہ کہ محاورۂ عرب میں کہیں امام اور حاکم کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اگر اسے درست مان لیا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے خدا اور رسول سے اس بارے میں کمی رہ گئی تھی جو علامہ باذل نے پوری کر دی۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

عقیدۂ آخرت

توحید و رسالت کے بعد اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ آخرت کی جوابدہی کا یقین ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اللہ تعالےٰ نے انسان کو کچھ ذمہ داریاں سونپی ہیں اور اسے یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے زندگی کی مہلت عطا کی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ نظام ختم ہو جائے گا اور نیا نظام شروع ہوگا جس میں ہر انسان سے اس کی ذمہ داریوں کے متعلق باز پرس ہوگی یہاں تک کہ ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرہ شرا یرہ۔ تمام اچھے اور بُرے اعمال سامنے آجائیں گے۔ اچھے اعمال کا صلہ اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی۔ اور اس فیصلہ میں بنیادی اصول یہ ہوگا کہ ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ یعنی سب کو اپنے کئے کا بدلہ ملے گا یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

شیعہ مذہب میں بھی عقائد کی فہرست میں عقیدۂ آخرت موجود ہے البتہ اس

کا نقشہ ذرا مختلف ہے۔ اس لیے تھوڑا سا اجمالی بیان کر دینا مناسب ہے۔

۱۔ مختصر بصائر الدرجات ص۲۲۴

اذا کان یوم القیامۃ نزع اللہ عز وجل مسحۃ الایمان منہم فردھا الی شیعتنا ونزع بجمیع ما اکتسبوا من السیأت فردھا الی اعدائنا الی ان قال قلت جعلت فداک تؤخذ حسناتہم فترد الینا وتؤخذ سیئاتنا فترد الیہم قال ای واللہ الذی لا الہ الا ھو قلت جعلت فداک اتجدھا فی کتاب اللہ قال نعم یا ابا اسحاق ما تتلو ھذہ الایۃ اولئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات۔

"قیامت کے دن اللہ تعالےٰ سنیوں کے ایمان کا حصہ ان سے چھین کر شیعوں کو دے دے گا اور شیعہ کی تمام برائیاں ان سے چھین کر سنیوں کو دے دے گا۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا قربان جاؤں سنیوں کی نیکیاں شیعوں کو اور شیعوں کی برائیاں سنیوں کو دی جائیں گی۔ کیا یہ مسئلہ کتاب اللہ یعنی قرآن میں ہے؟ امام نے قسم کھا کر کہا کہ ایسا ہوگا اے ابو اسحاق کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کہ اولئک یبدل اللہ الخ"

امام کے اس حلفیہ بیان کو پڑھ کر قیامت کا منظر اور حساب و کتاب کا سماں چشمِ تصور کے سامنے آجاتا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں لگتی ہے۔

(۱) اللہ تعالےٰ بڑا رحیم ہے انسان اس کی مخلوق ہیں میدان قیامت میں مخلوق اس کی عدالت میں پیش ہوگی اور ساری مخلوق میں سے شیعوں کی حالت زار پر اللہ تعالےٰ کو بڑا ترس آئے گا کہ یہ بیچارے تو خالی ہاتھ ہیں تہی دامن ہیں یہاں صلہ ملنے کا سرمایہ اعمال ہیں اور اعمال کی بنیاد ایمان ہے اور یہ بیچارے ایمان سے بھی خالی ہیں آگے معاملہ کیسے چلے گا چنانچہ رحمتِ الٰہی جوش پہ آئے گی اور دیکھے گی کہ یہ دولت کس کے پاس ہے۔ سنی سامنے ہوں گے اللہ تعالےٰ دیکھ لیں گے کہ یہی تو وہ ہیں جو دولت ایمان کا حصہ وافر سمیٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سے یہ سامان لے کر شیعوں کو دے دے گا تاکہ ان بیچارے تہی دامنوں اور تہیدستوں کو آگے کچھ دینے کے لیے بنیاد تو بنے۔ اگر یہ دنیلے اور کچھ نہیں تو

ایمان ہی ساتھ لاتے تو کام آسان ہوتا ۔ مگر یہ بیچارے ساتھ تب لاتے جب پاس ہوتا جب پاس تھا ہی نہیں تو لاتے کیا بیچارے معذور ہیں ۔

(۲) شیعوں کی تمام برائیاں سنیوں کو دی جائیں گی ۔ یہاں بات کچھ الجھ گئی ہے کیونکہ برائیوں پر تو سزا ملتی ہے گویا سنیوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے بھلا کون کر رہا ہے جو کہتا ہے کہ ان اللہ بالناس لرءوف رحیم اور یہ معاملہ تو رحم چھوڑ عدل سے بھی کوسوں دور ظلم کا نقشہ پیش کر رہا ہے ۔ اور ظلم کی نسبت رب العالمین سے کرنا اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا مگر مشکل یہ ہے کہ اس کارروائی کو ظلم کے بغیر اور کچھ بھی کہہ نہیں سکتے ۔

(۳) اس سے اللہ تعالےٰ کا ظالم ہونا غیر عادل ہونا تسلیم کرنا پڑے گا ۔

(۴) امام کا اعتراف ہے کہ ایمان سنیوں ہی کے پاس ہے ۔

(۵) امام کا اعتراف ہے کہ شیعہ ایمان سے خالی ہیں ۔

(۶) ہاں مگر نپٹ خالی نہیں ہیں وہ برائیوں کی دولت سے مالامال ہیں ۔

(۷) شیعوں کو نجات کے لیے قیامت میں بھی سنیوں کا سہارا لینا پڑے گا ۔ ان کے محتاج ہوں گے ۔ اس لیے معقولیت اسی میں ہے کہ اس دنیا میں سنیوں سے بگاڑ کیوں پیدا کرتے ہو ان سے اتفاق سے رہو بلکہ ان کے احسان مند بن کے رہو سنی وہاں تمہارے کام آئیں گے جہاں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا یوم یفر المرء من اخیه و امه وابیه وصاحبته وبنیه ۔ اس لیے ٹھنڈے دل سے سوچو اپنے محسنوں کو پہچانو اور ان سے صلح و آشتی سے رہو ۔

(۸) امام نے جس آیت کا حوالہ دیا اس کے معنی آج تک کسی انسان نے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم سکالر وہ نہیں بیان کئے جو امام نے بیان کئے اس لیے اسے قرآن کی تحریف کے بغیر اور کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ گویا صاحب مختصر بصائر الدرجات نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ائمہ کا ایک محبوب مشغلہ تحریف قرآن بھی تھا ۔

چنانچہ جب یہ اعتراض ہوا تو مصنف نے ص ۲۲۵ پر ایک اور بات کہہ دی ۔

واما تبدیل سیأت المؤمن بحسنات الناصب وحمل الناصب سیأت المؤمن فقد جاء فی الکتاب وفسرہ آل محمد علیہ السلام ۔

" بہر حال جہاں تک شیعہ سنی کی برائیاں نیکیاں ادل بدل کرنے کا معاملہ ہے قرآن میں آچکا ہے اور آل محمد نے اس کی تفسیر یہی کی ہے "

شیعوں کے لیے یہ سودا تو نفع کا ہے اور مژدہ جانفزا ہے مگر ایک اور روایت سے معاملہ کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے ۔

(۲) ۔ روضہ کافی ص ۱۴۲

عن ابی عبداللہ علیہ السلام انہ قال لا یبالی الناصب صلی ام زنا وهذه الایة نزلت فیهم عاملة ناصبة تصلی نارا حامیة ۔

" امام جعفر نے فرمایا کہ سنی نماز پڑھے یا زنا کرے دونوں برابر ہیں اور یہ آیت سنیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے عاملة ناصبة الخ "

(۳) روضہ کافی ص ۱۸۱ سنیوں کے حق میں لکھا ہے ۔

" سنیوں کے لیے دنیا اور آخرت میں کوئی حصہ نہیں پس ہر سنی کی عملی جد وجہد غبار کی مانند بے کار ہے "

ان دو روایتوں سے ظاہر ہے کہ امام جعفر کے نزدیک سنی کی نماز اور زنا میں کوئی فرق نہیں اور سنیوں کے اعمال کی حیثیت گرد و غبار کے بکھرے ہوئے بے حقیقت ذرات سے زیادہ کچھ نہیں تو مختصر بصائر الدرجات کی روایت کے مطابق سنیوں سے لیا کیا جائے گا ۔ اور شیعوں کی مطلب بر آری کیسے ہوگی ۔

عرصہ محشر کی چھینا جھپٹی سے کیا ہوا شیعہ بیچارے پہلے ہی برائیوں کے بوجھ سے خمیدہ کمر ہوں گے اوپر سے سنیوں سے چھینی ہوئی نیکیاں نمازیں وغیرہ جب زنا کے برابر ہیں تو گویا شیعوں کے بوجھ میں اور اضافہ ہوا ۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
تکیہ جن پتوں پہ تھا وہی ہوا دینے لگے

(۴) روضہ کافی ص ۲۵۲ بڑی روح افزا روایت ہے۔

ان اللہ عزوجل ملائکۃ یسقطون الذنوب عن ظہور شیعتنا کما تسقط الریح الورق وذلک قولہ عزوجل یسبحون بحمد ربھم و یستغفرون للذین اٰمنوا واللہ ما اراد بھذا غیرکم۔

"اللہ تعالٰے نے کچھ فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ شیعوں کی پیٹھوں پر سے گناہوں کے بوجھ ساقط کریں جیسے خزاں میں ہوا سے پتے جھڑتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور ایمان والوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور واللہ اس آیت سے تم شیعہ ہی مراد ہو"

کتنی مزے کی بات ہے کہ تم مزے سے برائیاں کیے جاؤ شوق سے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ کرتے رہو فرشتوں کی فوج مقرر ہے جو اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے ہی مقرر ہے۔ اس کا آخری جملہ معمہ ہے۔ کیونکہ اس آیت میں الذین اٰمنوا کا ذکر ہے اور مختصر بصائر الدرجات والی روایت میں صاف بتایا گیا ہے کہ شیعہ بیچارے ایمان سے خالی ہوں گے اس لیے اللہ تعالٰے رحم فرما کر سنیوں سے یہ دولت لے کر ان تہیدستوں کو دیگا ظاہر ہے کہ یہاں سے ایمان کی دولت لے کر جب جائیں گے نہیں تو وہاں ایمان کیسے پاس ہو۔ لہٰذا یہ روایت اس بات کی نفی بلکہ تردید کرتی ہے کہ الذین اٰمنوا سے مراد شیعہ ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ بات بنتے بنتے رہ گئی۔

(۵) انوار نعمانیہ ص ۱۹۹

وھذا الکاتبان یکتبان اعمال الیوم الی اللیل فیأتیان مع الصحیفتین الی امام العصر فیعرضانھما علیہ فیقرأھما فما کان من صحیفۃ سیأت شیعتہ استغفر واصلح۔

"کاتبین شیعہ کے دن رات کے اعمال لکھتے ہیں پھر ان اعمال کو امام زمانہ کے پیش کرتے ہیں۔ امام ان اعمال ناموں کو پڑھتا ہے۔ شیعوں کے جو برے اعمال ہوتے ہیں۔

ان کے لیے امام استغفار کرتا ہے اور اصلاح کر دیتا ہے"

یہ روایت بڑی خوش کن خبر دیتی ہے مگر حقیقت میں بات پھر الجھ کے رہ جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ فرشتے وہی کچھ لکھتے ہیں جو انسان کرتا ہے۔ انہیں امام کی خدمت میں اعمال نامے پیش کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام کو تمام اعمال نامے پڑھنے ہوتے ہیں یہی ڈیوٹی کچھ ایسی وقت طلب اور وقت طلب ہے کہ امام کسی دوسرے کام کے لیے فارغ ہو نہیں سکتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ جو بارہ لفافے آسمان سے نازل ہوئے تھے کسی لفافے میں امام کی اس ڈیوٹی کا ذکر نہیں۔

چہارم یہ کہ امام کا استغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہ اصلاح کرنے کا معاملہ ایسا ہے کہ کچھ عجیب ہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اصلاح کی ایک صورت یہ ہے کہ فرشتے نے لکھا فلاں گناہ کیا امام نے اصلاح کی اور گناہ کو مٹا کر اس کی جگہ کوئی ثواب کا کام لکھ دیا۔ بڑی اچھی بات ہے مگر جعلسازی معلوم ہوتی ہے۔ کیا امام اسی خدمت کیلئے رہ گیا ہے۔

پنجم؛ یہ استغفار اور اصلاح تو سنیوں کے حق میں مفید ثابت ہوگی کیونکہ شیعوں کی برائیاں سنیوں کو ملتی ہیں اور امام نے شیعوں کی برائیوں کی اصلاح کر دی۔ وہ نیکیاں بن گئیں تو سنیوں کو فائدہ ہوا گویا اب سودے کی صورت یہ ہوئی کہ شیعوں نے سنیوں سے ایمان کی دولت لی اور انہیں اپنے وہ اعمال دئے جن کی امام نے اصلاح بھی کی اور استغفار بھی کی۔

اس سے بھی زیادہ خوش کن بلکہ روح افزا خبر ایک اور روایت میں دی گئی ہے۔

(۶) روضہ کافی ص ۱۴۰ امام باقر سے روایت ہے۔

ثم یدعی بنا فیدفع الینا حساب الناس فنحن واللہ ندخل اھل الجنۃ الجنۃ واھل النار النار ثم یدعی بالنبیین علیھم الصلوٰۃ والسلام فیقامون صفین عند العرش حتی نفرغ من حساب الناس۔

"پھر ہمیں بلایا جائے گا اور تمام انسانوں سے حساب لینا ہمارے سپرد کیا جائے گا۔ خدا کی قسم ہم جنتیوں کو جنت میں داخل کریں گے اور دوزخیوں کو دوزخ میں پھر انبیاء کرام کو بلایا جائے گا وہ دو صفوں میں عرش کے پاس کھڑے ہوجائیں گے اور اس وقت تک کھڑے رہیں گے کہ ہم حساب لینے سے فارغ ہوجائیں"

لیجئے حشر ونشر میزان اور حساب وکتاب کی سختیوں کے حالات سو ہان روح بن چکے تھے بات گھر میں پہنچ گئی اپنے امام حساب لیں گے۔ بہرحال اس روایت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) حساب کے ساتھ الناس کا لفظ ہے یعنی صرف امت محمدیہ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے اعمال کا حساب لینا اماموں کے ذمے ہوگا خواہ وہ کسی نبی کی امت تھے۔

(۲) حساب ائمہ نے لینا ہے ان کی تعداد بارہ ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ مخلوق کو بارہ حصوں میں تقسیم کردیں ہر امام اپنا کوٹہ لے کر کام شروع کردے۔

(۳) انبیاء کو کس لیے بلایا جائے گا؟ یہ ایک عقدہ ہے۔ ممکن ہے اس لیے کہ ہر نبی اپنی اُمت کے افراد کا نتیجہ دیکھ لے۔ گویا انبیاء محض تماشائی ہوں گے۔

یہ بات کچھ فطری معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں بھی پڑھانے والے اور ہوتے ہیں اور امتحان لینے والے دوسرے ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء کا کام تو تعلیم وتربیت اور پڑھانا لکھانا تھا اور امتحان لینا ائمہ کے ذمے لگایا جائے گا۔

(۴) وہی ائمہ جب اپنے اپنے عصر میں شیعوں کے اعمال ناموں کی اصلاح کرچکے ہیں تو وہاں بھی ضرورت ہوئی تو اصلاح کردیں گے اور شیعہ دوزخی بھی ہوگا تو جنت میں بھیج دیں گے کیونکہ اس کے بعد کسی اپیل کا ذکر اس روایت میں نہیں ہاں ایک مشکل پیش آئیگی کہ مثلاً پہلے امام کے زمانے کا شیعہ بارھویں امام کے حصے میں آجائے تو کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ شیعہ بتادے گا۔ اور اس کا بتا دینا ہی کافی ہوگا اور اگر ضرورت پڑی تو بارھواں امام پہلے امام سے پوچھ لے گا مگر ضرورت تو پڑے گی نہیں کیونکہ امام کو کان وما یکون کا علم ہوتا ہے۔

(۵) ائمہ جب یہاں سنیوں سے خوش نہیں تو انہیں وہاں حساب لیے بغیر ہی دوزخ میں بھیج دیں تو کیا بعید ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انبیاء تو بس وہاں صرف کھڑے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ تو یہ کام ائمہ کے سپرد کرکے فارغ ہوگا (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قیامت کی ہولناکیوں کے وہ مناظر پیش فرمائے ہیں کہ پڑھ کے روح کانپ اٹھتی ہے۔ خدا بھلا کرے ان روضہ کافی اور انوار نعمانیہ اور مختصر بصائر الدرجات کے مصنفین کا کہ قیامت کو ایک ڈرامہ بنا کے دکھا دیا۔

(۷) کشف الغمہ ۲ : ۴۰۷

یا زید ان الصراط الینا والمیزان الینا وحساب الشیعة الینا۔

"اے زید پل صراط سے گزرنا ہمارے ذمہ ہے۔ وزن اعمال ہمارے ذمہ ہے اور شیعہ کا حساب لینا ہمارے ذمہ ہے"

روضہ کافی کی روایت اور اس روایت میں تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے۔ وہاں حساب الناس ہے یہاں حساب الشیعہ ہے۔ دونوں میں تطابق کی ایک صورت یہ ہے کہ شیعہ بھی آخر ناس تو ہیں یا اس سے مراد تخصیص بعد التعمیم ہے اور ظاہر ہے کہ ائمہ اس دنیا میں شیعوں سے امتیازی سلوک کرتے ہیں ان کے اعمالناموں کی اصلاح بھی کرتے ہیں تو وہاں کیوں نہ خصوصی توجہ کریں گے۔

(۸) انوار نعمانیہ ۱ : ۹۶، مختصر بصائر الدرجات صـ ۲۲۳/۲۴ اور علل الشرائع صـ ۴۹

ابو اسحاق قمی امام باقر سے عرض کرتا ہے۔

جعلت فداك یا ابن رسول الله انی اجد من شیعتکم من یشرب الخمر ویقطع الطریق ویخیف السبل، ویزنی، ویلوط ویاکل الربوا ویرتکب الفواحش ویتهاون بالصلوٰة والصیام والزکوٰة و یقطع الرحم ویأتی بالکبائر فکیف هذا۔

"اے ابن رسول میں آپ کے شیعوں کو دیکھتا ہوں کہ شرابی ہیں ڈاکو ہیں زانی ہیں لوطی ہیں سود خور ہیں بے حیائیوں کے مرتکب ہیں نماز روزہ زکوٰۃ سے بے نیاز ہیں۔

قطع رحمی کرتے ہیں کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔
ابو اسحاق نے امام باقر کے سامنے شیعوں کے کردار کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔

اور مختصر بصائر الدرجات ص۹۶

نقلت یا ابن رسول اللہ واجد من اعدائکم ومن ناصبیکم من یکثر من الصلوٰۃ ومن الصیام و یخرج الزکوٰۃ ویتابع بین الحج والعمرۃ ویحرص علی الجھاد ویصل الارحام ویقضی حقوق اخوانہ ویواسیھم من مالہ ویجتنب شرب الخمر والزنا واللواطۃ وسائر الفواحش فمم ذالک۔

"تو میں نے کہا اے ابن رسول میں آپ کے دشمنوں ناصبیوں (سنیوں) کو دیکھتا ہوں کہ کثرت سے نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں حج اور عمرہ کرتے ہیں جہاد کے حریص ہیں صلہ رحمی کرتے ہیں بھائیوں کے حقوق ادا کرتے ہیں شراب سے بچتے ہیں زنا لواطت اور دوسری تمام برائیوں سے اجتناب کرتے ہیں ایسا کیوں ہے۔

اور اسی کتاب کے ص۲۲۳ پر سنیوں کے متعلق کہا کہ

کثیر الصلوٰۃ کثیر الصوم کثیر الصدقۃ یؤدی الزکوٰۃ ویتورع فیؤدی الامانۃ۔

دونوں گروہوں کی سیرت کا نقشہ کھینچ کر ابو اسحاق نے امام سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کے جواب میں امام نے وہی فرمایا جو ص۲۲۳ کے حوالے سے اس بحث کے شروع میں ص۱ پر درج ہے۔

(۹) روضہ کافی ص۱۹۱ موسیٰ بن بکر واسطی امام ابوالحسن کی زبانی شیعہ کی تعریف بیان کرتا ہے۔

قال لی ابوالحسن علیہ السلام لو میزت شیعتی لم اجدھم الا واصفۃ ولو امتحنتھم لما وجدتھم الا مرتدین ولو تمحصتھم لما خلص من الالف واحد ولو غربلتھم غربلۃ لم یبق منھم الا ما کان لی الی ان قال فقالوا نحن شیعۃ علی انما شیعۃ علی من صدق قولہ وفعلہ۔

"امام ابوالحسن نے فرمایا اگر میں شیعوں کی بات کروں تو میں انہیں آپس میں وصفیں بیان کرنے والے پاؤں گا (یعنی محض باتیں بنانے والا) اور اگر میں ان کا امتحان لوں تو انہیں مرتد پاؤں گا اگر میں چھان بین کروں تو ہزار میں سے ایک بھی مخلص نہ پاؤں گا اگر میں انہیں چھلنی میں چھانوں تو ایک خاص باقی رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم شیعان علی ہیں۔ حالانکہ حضرت علی کے شیعہ وہ ہیں جو قول وفعل میں سچے ہوں"

پہلی دو روایتوں میں امام باقر کے سامنے شیعوں کے اوصاف بیان ہوئے اس روایت میں امام نے خود شیعوں کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ سب وصفوں سے نرالا وصف امام نے بیان کیا کہ اگر انہیں کسی امتحان میں ڈالا جائے تو وہ مرتد پائے جائیں گے۔ ارتداد سے اونچا اور کونسا وصف ہو سکتا ہے۔ مگر اس میں نقصان سنیوں کا ہے کیوں کہ روایت ۳ کے مطابق یہ ارتداد کا گناہ بھی قیامت کے دن تو سنیوں کی پیٹھ پر لادا جائے گا شیعوں کا کیا بگڑا۔

اس موقع پر ایک روایت کا ذکر کرنا دو لحاظ سے مناسب ہے اول یہ کہ ائمہ نے اپنے شیعوں کے متعلق جب اس قسم کی رائے کا اظہار کیا تو شیعوں نے اس کا بدلہ دینے میں بخل نہیں برتا۔ دوسرا یہ کہ ایک طرف ائمہ کا یہ مقام بیان ہوا کہ قیامت میں حساب وکتاب اور سب فیصلے ائمہ ہی کریں گے دوسری طرف ائمہ کے متعلق یہ کہا گیا۔

مناقب شہر ابن آشوب ج۴، ص۳۲ امام حسن نے جب امیر معاویہؓ سے صلح کرنے کا ارادہ کیا تو یہ خطبہ دیا۔

ولا تخالفوا امری ولا تردوا علی رأیی غفر اللہ لی ولکم وارشدنی وایاکم لما فیہ المحبۃ والرضا فقالوا واللہ یرید ان یصالح معاویۃ ویسلم الامر الیہ کفر واللہ الرجل کما کفر ابوہ فانتھبوا فسطاطہ حتی اخذوا مصلی من تحتہ ونزع مطرفہ عبد الرحمٰن بن جعال الازدی وطعنہ۔

"میری مخالفت نہ کرو میری رائے کو رد نہ کرو اللہ مجھے اور تمہیں مغفرت کرے اور مجھے اور تمہیں ہدایت پر رکھے کیونکہ اس صلح میں محبت ہے اور خدا کی رضا ہے۔ شیعوں نے کہا قسم بخدا یہ شخص (امام حسن) معاویہ سے صلح کرنا چاہتا ہے اور حکومت اس کے حوالے

کرنا چاہتا ہے۔ یہ کافر ہو گیا ہے جیسے باپ یعنی حضرت علی کافر ہو گیا تھا۔ پھر امام کے خیمے پہ بلہ بول دیا ان کے نیچے سے مصلیٰ چھین لیا۔ اوپر کی چادر چھین لی اور امام کو نیزہ مار کر زخمی کر دیا"

حضرت امام حسن کے ارشاد اور شیعوں کے جواب کے الفاظ کسی تبصرہ کے محتاج تو نہیں اور یہ شیعوں کا اپنے گھر کا معاملہ ہے امام کو جو چاہیں کہیں آخر ان کا حق بنتا ہے البتہ چند ایک نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) اگر شیعوں نے اصحاب ثلاثہ کے متعلق ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ جس امام سے ان کا مذہب چلتا ہے یا وہ چلاتے ہیں وہ حضرت علی ہیں دوسرے نمبر پہ حضرت حسن ہیں جب شیعوں نے ان دونوں اماموں کو کافر کہہ دیا تو اور کوئی ان کی زبان سے کیسے بچ سکتا ہے

تمہارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانے کا رضا جو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا۔

(۲) ایک طرف تو امام کا یہ مقام کہ اعمال نامے اس کے پیش ہوتے ہیں وہ ان میں اصلاح کرتا ہے قیامت میں حساب کتاب لینا جنت دوزخ میں بھیجنا سب ان کے اختیار میں ہے دوسری طرف یہ حال کہ ابو الائمہ کو کافر قرار دے رہے ہیں کیا کفر سے امامت کے سوتے پھوٹے ہیں؟

(۳) امام عصر کے سامنے اس کے شیعوں کے اعمال نامے پیش ہوتے ہیں تو جن شیعوں نے امام حسن کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ کافر کہا۔ لوٹا مارا زخمی کیا، ان کے اعمال نامے اس روز جب امام کے سامنے پیش ہوئے ہوں گے تو خدا جانے ان میں کیا اصلاح کی ہو گی۔ کیا فرشتوں کو حکم دیا ہو گا کہ لکھو۔ شیعوں نے میری منقبت پڑھی میرے پاؤں پکڑے ہاتھ چومے خون میں نہیں پانی سے غسل دیا۔

خیر یہ باتیں تو سوچنے کی ہیں جسے خدا سوچنے کی توفیق دے سوچے اصل بات جو اس باب کا خلاصہ ہے یہ ہے کہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ آخرت کا عقیدہ برحق ہے البتہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیعہ ہر صورت نجات یافتہ ہیں گناہ خواہ کتنے کریں سنیوں کے بوجھ میں اضافہ ہو گا۔ اماموں کو کافر کہیں۔ زخمی کریں۔ قتل کریں۔ مرتد ہو جائیں کچھ ہو جائے جنت انہیں مل کے رہے گی کیونکہ خدا پہ عدل کرنا ان کے نزدیک واجب ہے۔ اور عدل کی اس سے بہتر مثال تصور میں آ ہی نہیں سکتی کہ

"کھائے پئے کوکری تے دھون بھنائے جمعہ"

ایک بات وضاحت طلب ہے کہ روایت ۶ میں ابو اسحاق نے امام سے جو سوال کیا کہ شیعہ ایسے ہیں ایسے ہیں تو ایسا کیوں ہے؟ امام نے اس کیوں کا جواب نہیں دیا بلکہ سائل کے اصل خطرے کا علاج بتا دیا جو روایت ۵ میں درج ہے۔ ممکن ہے امام نے یہ سمجھا ہو کہ استدلال کے گورکھ دھندے میں پڑنا فضول ہے سائل کے اصل خدشے کو دور کر دو۔ مگر اس کیوں کا جواب ضرور موجود ہے۔

اصول کافی باب التقیہ میں ہے عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ان تسعة اعشار الدین فی تقیة ولا دین لمن لا تقیة لہ۔

صرف تقیہ کرنے سے ۹/۱۰ دین پہ عمل ہو گیا یعنی آدمی ۹/۱۰ دیندار ہو گیا۔ اور میدان حشر میں حساب لینا ائمہ کا کام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں انسان انسان سے بڑی رعایت برتتا ہے مثلاً ۳۳ فیصد نمبر لیے تو پاس ہو گیا۔ اور تقیہ کیا تو ۹۰ فیصد نمبر لے لیے یعنی نہایت اونچی فرسٹ ڈویژن سے زیادہ نمبر لے لیے لہٰذا پاس تو کیا میڈل کا مستحق ہو گیا۔ باقی ۱/۱۰ حصہ دین رہ گیا نماز روزہ حج زکوٰۃ جہاد سب عبادتیں اس ۱/۱۰ میں آگئیں۔ جب آدمی نے نہایت اطمینان سے ہر معاملے میں ہر بات میں تقیہ کرنا معمول بنا لیا تو اسے کیا ضرورت ہے کہ باقی ۱/۱۰ حصہ دین کی فکر میں گھلتا رہے۔ غالباً اس کیوں کا جواب یہی ہے۔ کہ شیعہ مطمئن ہیں کہ ۹/۱۰ دین تو ہمارے ہاتھ سے جا نہیں سکتا۔ باقی ۱/۱۰ کی فکر کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ جب آدمی، آدمی سے اتنی رعایت برتتا ہے تو کیا رب العالمین اتنی رعایت بھی نہ دے گا کہ ۹۰ فیصد والے کو پاس قرار دے اور رب کے نمائندے ائمہ کیا اس کلیے کو استعمال نہیں کریں گے۔

عقیدۂ امامت

دین اسلام میں اساسی عقائد تین ہیں توحید، رسالت اور معاد مگر دین شیعہ میں امامت کا عقیدہ اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ امامت کا منصب نبوت سے بلند تر ہے جیسا کہ گذشتہ باب میں وضاحت کر دی گئی ہے اس لیے عقیدۂ امامت کے تمام پہلوؤں کی تفصیل دی جاتی ہے۔

عقیدہ ۱: امامت اصول دین سے ہے جیسے توحید، رسالت اور قیامت اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں توحید رسالت اور قیامت کا ذکر جا بجا مختلف اسلوب بیان اختیار کر کے کیا ہے مگر عقیدۂ امامت کا ذکر اشارۃً بھی نہیں کیا تو اسے اصول دین میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب دیا گیا کہ امامت کا مسئلہ قرآن میں موجود تھا مگر قرآن جمع کرنے والے صحابہ نے قرآن سے نکال دیا۔ چنانچہ تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام باقر نے فرمایا

لو قرئ القرآن کما انزل لا لفیتنا فیہ مسمین۔

قرآن جس طرح نازل کیا گیا اگر اسی طرح پڑھا جاتا تو تم ہمارے نام اس میں موجود پاتے۔

اسی طرح تفسیر صافی میں عیاش سے منقول ہے کہ امام باقر نے فرمایا

لولا انہ زید فی القرآن او نقص ما خفی حقنا علی ذی حجی۔

اگر قرآن میں کمی، زیادتی نہ کی جاتی تو ہمارا حق کسی ذی عقل سے مخفی نہ رہتا۔

اس تصریح سے یہ ثابت ہوا کہ شیعہ کے نزدیک موجودہ قرآن اصل قرآن نہیں بلکہ تبدیل شدہ ہے۔ یعنی شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اس لیے موجودہ قرآن پر ان کا ایمان نہ ہونا تعجب کی بات نہیں بلکہ ان کے لیے ایسا عقیدہ رکھنا لازمی ہے ورنہ امامت کے عقیدہ کو اصول دین سے خارج کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ امامت ایک راز ہے جس کی اطلاع صرف رسول کریمؐ کو دی گئی اور آپؐ نے یہ راز صرف حضرت علیؓ کو بتایا جیسے

اصول کافی ص۲۷۴

قال ابو جعفر ولایۃ اللہ اسرھا الی جبرئیل واسرھا جبرئیل الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم واسرھا محمد الی علیؑ واسرھا علی الی من یشاء ثم انتم تذیعون ذلک۔

امام باقر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ولایت کا راز جبرئیل کو پوشیدہ بتایا جبرئیل نے یہ راز نبی کریمؐ کو بتایا حضورؐ نے یہ راز حضرت علیؓ کو بتایا۔ پھر حضرت علیؓ نے جسے چاہا بتایا مگر تم لوگ اسے ظاہر کرتے پھرتے ہو۔

ظاہر ہے کہ ایسی راز کی بات قرآن میں کیسے بیان کی جا سکتی تھی۔ اور اگر بیان کی گئی تو اسے باقی کیونکر رکھا جا سکتا تھا۔ قرآن تو ہر مسلمان پڑھتا ہے اس لیے اس راز کے فاش ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے ممکن ہے صحابہ نے حضرت علیؓ کے ایما پر ہی اسے قرآن سے خارج کر دیا ہو۔ راز داری کا اتنا اہتمام کرنے کے باوجود امام باقر کو شیعہ سے شکایت ہے کہ اس راز کو پھیلاتے پھرتے ہیں۔

یہ جواب بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے مگر ایک مشکل یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب امامت ایک راز ہے جس کا ظاہر کرنا جرم ہے تو اسے اصول دین میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے۔ دین تو پھیلانے کے لیے بھیجا گیا ہے اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہ عجیب الجھن ہے۔ اگر عقیدہ امامت کو چھپائیں تو دین کامل کی تبلیغ نہ ہوئی اور اگر ظاہر کریں تو افشائے راز کے مجرم ٹھیرے۔ شیعہ نے غدیر خم اور حدیث قرطاس کے واقعات کو اچھال کر افشائے راز کا مجرم بننا قبول کیا۔ خدا جانے کل امام کو کیا منہ دکھائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصول دین کے لیے تو دلائل قطعیہ درکار ہوتے ہیں جو بات کسی فرد واحد کے کان میں کہدی گئی ہو اور اسے راز میں رکھنے کی تاکید کی گئی ہو۔ اسے اصول دین کس دلیل سے کہہ سکتے ہیں۔

عقیدہ ۲: امام اپنی موت کا وقت جانتے ہیں اور اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

اصول کافی ص۱۵۸

ان الائمۃ علیہم السلام یعلمون متی

امام اپنی موت کا وقت جانتے ہیں اور اپنے

یموتون لایموتون الا باختیار ھم

اختیار سے موت قبول کرتے ہیں۔

امامت کا مرتبہ واقعی بڑا بلند ہے۔ اگر خدا مارنا چاہے اور امام کو پسند نہ ہو تو خدا مار نہیں سکتا۔ اور امام کو جو بات پسند ہو اس کے متبعین کو بھی پسند ہونی چاہیے ورنہ امام اور متبع کی پسند و ناپسند میں تضاد ہوگا اور یہ چیز اتباع اور اطاعت کے منافی ہے تو معلوم ہوا امام حسین کو اپنی موت کا علم تھا اور وہ اپنے اختیار سے مرے ہیں۔ اس لیے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے اختیار اور ان کی پسند میں رکاوٹ بن سکتا۔ پھر یہ ماتم کس بات کا کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے امام کی پسند کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہو۔

عقیدہ ۳ : امام ہر چیز کے متعلق جانتا ہے۔ جس کو آنے والی مصیبت کا علم نہ ہو وہ امام ہی نہیں۔

اصول کافی ص ۱۵۸

الائمۃ اذا شاؤوا ان یعلموا علموا عن ابی بصیر قال قال ابوعبداللہ علیہ السلام ای امام لایعلم مایصیبہ والی مایصیر فلیس ذلک بحجۃ اللہ علی خلقہ۔

امام جو چیز جاننا چاہیں جان لیتے ہیں۔ جس امام کو آنے والی مصیبت کا علم نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ وہ مصیبت کب تک رہے گی وہ خدا کے نزدیک امام ہی نہیں۔

اصول کافی ص ۱۵۹ پر پورا باب موجود ہے۔

ان الائمۃ یعلمون علم ما کان وما یکون وانہ لایخفی علیھم شئ صلوات اللہ علیھم۔

امام کو ماضی اور مستقبل کا علم ہوتا ہے اور امام سے دنیا کی کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی۔

اور **مختصر بصائر الدرجات ص ۱۲** پر مفضل بن عمر امام جعفر صادق کے متعلق بیان کرتا ہے

کان یریٰ ما فی شرق الارض وغربھا وبرھا وبحرھا قلت جعلت فداک یتناول الامام ما بغداد بیدہ قال نعم ومادون العراق۔

امام۔ زمین کے مشرق مغرب خشکی تری کی ہر چیز دیکھتا اور جانتا ہے میں نے کہا قربان جاؤں کیا امام ہاتھ بڑھا کے بغداد سے کوئی چیز پکڑ سکتا ہے فرمایا ہاں بلکہ عراق سے ورے تک بھی۔

عقیدہ ۴ : امام مہدی کی شان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ملائکہ مقربین سے بھی بلند ہے۔

مختصر بصائر الدرجات ص ۲۱۳

ویکون جبریل امامہ ومیکائیل عن یمینہ واسرافیل عن یسارہ ..... والملائکۃ المقربون حذائہ اول من بایعہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

ظہور مہدی کے وقت جبریل آگے آگے ہوں گے میکائیل دائیں جانب اسرافیل بائیں طرف مقرب فرشتے ساتھ ہوں گے سب سے پہلے محمد رسول اللہ، امام مہدی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔

"حق الیقین" میں بھی یہی بات کہی گئی ہے اول کسے کہ با و بیعت کند محمد مصطفیٰ باشد ظاہر ہے کہ جس پیر کا مرید امام الانبیاء ہو اس پیر کے رتبے کا کیا پوچھنا۔

عقیدہ ۵ : بارھویں امام غار سر من رای میں چھپ گئے ہیں جب ظاہر ہوں گے تو تمام دنیا پر شیعوں کی حکومت ہوگی۔

بارھویں امام کو غائب ہوئے ایک طویل زمانہ گذر چکا ہے اور نہ جانے کتنا عرصہ اور گزر جائے گا اس لیے ان کے حالات ذرا تفصیل سے بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

شیعہ کا کہنا ہے کہ امام حسن عسکری کا بیٹا نرگس خاتون کے بطن سے پیدا ہوا اور ابھی دو برس یا چار برس یا پانچ برس کا تھا کہ یہ بچہ اصل قرآن مجید، مصحف فاطمہ، کتاب علی چمڑے والا تھیلا، عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان وغیرہ تمام نادر اشیاء ایک گٹھڑی میں باندھ، بغل میں دبائے غار سر من رای میں چھپ گیا۔

انوار نعمانیہ ۱ : ۱۴۳

وتشوقون الی حصول الثانی عشر لیقتلوہ..... ولھذا لما دفن مولانا الحسن العسکری علیہ السلام اضطرب السلطان واصحابہ فی طلب ولدہ وکثر التفتیش فی المنازل والدور وتوقفوا

انہیں امام مہدی کے حاصل کرنے اور اسے قتل کرنے کا شوق تھا جب امام حسن عسکری کو دفن کر چکے تو بادشاہ اور اس کے حواریوں کو پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ہر جگہ اور

عن نقسم میراثه ولم یزل الذین وکلوا بحفظ الجاریة التی توهموا علیها الحبل ملازمین لها سنتین او اکثر حتی یتبین بهم بطلان الحبل نقسم میراثه بین امه واخیه جعفر وادعت امه وصیته وثبت عند القضاة والسلطان علی ذلك بطلب اثر ولده ...... وقد کان علیه السلام مع غیبته عن الناس یظهر لخاصته وموالیه و شیعته و یخرج منه التوقیعات فی فنون المسائل والاحکام و بقی علی هذا الحال ستین سنة حتی اشتد الامر وکثر الطلب علیه والتفحص عن خواصه وموالیه فخاف علی نفسه وعلی خواص شیعته وذلك فی دولة الخلیفة المعتضد بالله فغاب۔ هذه الغیبة الکبری الی الان نرجو من الله ان یوفقنا تقبیل اعتابه

گھر میں امام مہدی کو تلاش کیا اور حسن عسکری کی میراث کی تقسیم میں توقف کیا امام مہدی کی والدہ پر دو سال تک سخت پہرہ رکھا جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہی نہیں ہوئی تھی تو امام کے بھائی جعفر اور اس کی ماں میں میراث تقسیم کر دی امام کی والدہ نے امام کی وصیت کا دعویٰ کیا اور حکومت پر یہ بات واضح ہو گئی ۔ پھر غائب ہونے کے باوجود امام اپنے خاص دوستوں سے ملتے تھے اور امام کی طرف سے کئی خط اور مسائل و احکام بھی آتے تھے اس حالت میں ۶۰ برس گذر گئے ۔ پھر انکی تلاش کا معاملہ شدت اختیار کر گیا ان کے خاص دوستوں اور شیعوں سے سخت تفتیش ہونے لگی یہ معاملہ عباسی خلیفہ معتضد باللہ کے عہد میں پیش آیا ۔ پھر امام پوری طرح غائب ہو گئے آج تک یہ غیبت کبریٰ ہے ہم اللہ سے امید رکھتے ہیں کہ ہمیں امام کی دہلیز چومنے کا موقع دے گا ۔

امام حسن عسکری کی وفات ۲۶۰ھ میں ہوئی ۔ نرگس خاتون کے متعلق ۲ سال تک تحقیق ہوتی رہی آخر ثابت ہوا کہ ان کو حمل نہیں ہوا ۔ یعنی امام حسن عسکری لاولد فوت ہو گئے ۔ اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جاتی تو امامت کا معاملہ ادھورا رہ جاتا تھا ۔ اس لیے یہ طے کر لیا گیا کہ وفات کے دس روز بعد امام کا ۲ سال یا کم و بیش عمر کا بچہ تمام نوادرات کی گٹھڑی اٹھا کے گھر سے چلا گیا اور ایک غار میں چھپ گیا ۔ یہ معجزانہ کام ایک امام کے بغیر اور کون کر سکتا ہے ۔ پھر گیارھویں

امام حسن عسکری کی میراث ان کے بھائی اور والدہ میں تقسیم ہوئی امام کے بھائی جعفر نے شہادت دی کہ ان کا بھائی لاولد فوت ہوا ۔ یہ سچی بات کہنے کی وجہ سے شیعہ انہیں جعفر کذاب کہتے ہیں ۔ حکومت کی تفتیش، بھائی کی گواہی، والدہ کی شہادت یہ ہے کہ امام حسن عسکری لاولد فوت ہوئے ۔ مگر شیعہ کا عقیدہ ہے کہ بچہ ضرور پیدا ہوا ۔ اور چھپ گیا ۔ کوئی انسانی کوشش آج تک اس غار کا کوئی سراغ نہ لگا سکی نہ امام کو کوئی تلاش کر سکا نہ وہ از خود ظاہر ہوئے ۔ مگر مقررہ وقت سے پہلے کیونکر ظاہر ہو سکتے ہیں ۔

غیبت کا اجمالی بیان :-

بارھویں امام غائب کیوں ہو گئے ؟

۱ ۔ ان العلة فی غیبته انما الخوف من القتل ۔

امام قتل ہو جانے کے ڈر سے غائب ہو گئے ۔

۲ ۔ لو کان ظاهرا لم یسعه الا موافقة الطواغیت بسبب التقیة التی سلکها آباءه ۔

اگر ظاہر ہوتے تو ظالم بادشاہوں کی تقیہ کے طور پر بیعت کرنی پڑتی جیسا کہ ان کے آباؤ اجداد نے کیا تھا ۔

یعنی انہیں اپنے آباؤ اجداد کی تقلید گوارا نہ تھی اور تقیہ کا ثواب حاصل کرنا بھی پسند نہ تھا ۔

۳ ۔ لئلا یکون لاحد فی عنقه بیعته ولما وقعت البیعة فی عنقه لم یمکنه نقضها اتقاء علی نفسه لان نقض البیعة عندنا هو ارتداد

خدا کو یہی منظور تھا کہ کسی کی گردن میں امام کی بیعت کا طوق نہ ہو کیونکہ جب وہ کسی کی بیعت لیتے تو توڑنا ممکن نہ تھا کیونکہ ان کے ہاں بیعت توڑ نا مرتد ہونا ہے ۔

۴ ۔ ان غیبته عن اعدائه للتقیة منهم و غیبته اولیائه للتقیة ۔

سنیوں کے خوف کی وجہ سے امام غائب ہو گئے اور امام کے دوست بھی تقیہ کر کے پوشیدہ ہیں ۔

غیبت صغریٰ اور سفراء:-

غیبت کے پہلے دور میں جسے غیبت صغریٰ کہتے ہیں امام غائب کے پاس سفیر آتے جاتے رہتے تھے۔ شیعوں کی درخواستیں لے جاتے۔ شیعوں کے لیے امام کی طرف سے پیغام اور احکام لاتے اور شیعہ حضرات ان سفیروں کی خوب خدمت کرتے تھے۔ اور انہیں ایسا کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ سفراء، امام اور شیعوں کے درمیان واحد واسطہ تھے۔ جب حکومت کو معلوم ہوا کہ سفارت کا کام ایک منافع بخش تجارت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور یار لوگ سادہ لوح عوام کو خوب لوٹتے ہیں تو چھان بین شروع ہوئی۔ چنانچہ سفراء کا سلسلہ ختم ہو گیا اور غیبت کبریٰ شروع ہو گئی اس کی تفصیل باقر مجلسی کی حق الیقین میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

سفراء کون تھے؟

امام غائب کے سفراء میں چار نام مشہور ہیں۔

۱۔ عثمان بن سعید اسدی۔

۲۔ ابو جعفر محمد بن عثمان۔

۳۔ ورئیس ہذہ الطائفۃ الشیخ الذی کان بما قیل بعصمتہ ابو القاسم حسین بن روح السفیر الثالث بین الشیعۃ والحجۃ۔

اس گروہ کا رئیس جسے اکثر معصوم کہا جاتا ہے ابو القاسم حسین بن روح ہے۔ شیعہ اور امام غائب کے درمیان تیسرا سفیر ہے۔

(فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب ص۲۸)

۴۔ علی بن محمد سمرقندی۔ اس کی سفارت کا زمانہ تین سال رہا پھر غیبت کبریٰ شروع ہو گئی یعنی امامت کی ابتدا بھی خبر واحد سے ہوئی اور انجام بھی خبر واحد پر ہوا۔

اسی سفارت کے زمانے میں مذہب شیعہ کی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ محمد بن یعقوب کلینی اسی دور کا آدمی ہے اس کی کتاب "کافی" سفراء کے ذریعے امام کے پاس بھیجی گئی اور امام سے تصدیق کرائی گئی۔ اسی کے متعلق امام نے کہا کہ ھذا کافی لشیعتنا۔

امام کب ظاہر ہوں گے؟

۱۔ القائم علیہ السلام لن یظھر ابدا حتی یخرج ودائع اللہ عز و جل فاذا اخرج ظھر۔

امام اس وقت تک ظاہر نہ ہوگا جب تک سنیوں کی پشت سے کوئی شیعہ پیدا ہونے والا ہے۔ جب کوئی شیعہ پشت سنی میں نہ رہا تو امام ظاہر ہوگا۔

یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ یہ صورت کب پیدا ہوگی۔ اور یہ شرط نہ جانے کس نے لگائی کیونکہ خدا نے پہلی دفعہ امام کے ظہور کا وقت ۷۰ھ مقرر کیا تھا مگر بدا ہو گیا پھر ۱۴۰ھ مقرر کیا پھر بدا ہو گیا۔ اب یہ شرط لگا دی تو اچھا ہوا کہ وقت کے تعین سے بار بار شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ اگر یہ شرط امام نے لگائی تو ظاہر ہے کہ خدا سے ہی معلوم کیا ہوگا۔ بہرحال بدا سے بچنے کے لیے یہ شرط بڑی مناسب ہے۔

۲۔ احتجاج طبرسی ص۲۴۲

یجتمع الیہ من اصحابہ عدۃ بدر ثلثمائۃ وثلث عشر رجلا من اقاصی الارض ..... فاذا جمعت لہ ہذہ العدۃ من اھل الاخلاص اظھرہ اللہ فاذا اکمل لہ العقد وھو عشرۃ الاف رجل خرج باذن اللہ فلا یزال یقتل اعداء اللہ

دنیا کے مختلف حصوں سے جب ۳۱۳ اہل اخلاص شیعہ جمع ہو جائیں گے تو امام کا ظہور ہوگا..... اور دس ہزار مخلص شیعہ اکٹھے ہو جائیں گے تو امام جہاد شروع کرے گا اور اللہ کے دشمنوں کو قتل کرے گا۔

معلوم ہوا کہ ۳۱۳ کے عدد میں بڑی برکت ہے۔ اصحاب بدر ۳۱۳ تھے انہوں نے اسلام کا بول بالا کیا اور باطل کو نیچا دکھایا گویا صاحب احتجاج طبرسی کے نزدیک اہل بدر سچے مومن تھے۔ پھر ان مخلص اہل بدر کو برا بھلا کہنا اپنی تکذیب کرنا ہوا۔

۲۶۰ھ میں امام غائب ہو گئے۔ گیارہ صدیاں گذر گئیں اور ساری دنیا میں آج تک ۳۱۳ مخلص شیعہ پیدا نہیں ہو سکے ورنہ امام کا ظہور ہو جاتا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے ماتم کے موقع پر تو لاکھوں کے ہجوم نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا وہ نام کے شیعہ ہیں [illegible] کام کے شیعہ نہیں

۳ - انوار نعمانیہ صـ۱۴۶

ما ورد في الروايات عن صادق عليه السلام من ان اناسا من الشيعة كانوا يحرصونه على القيام بالسيف وكانوا يقولون ان لك شيعة في العراق لو حملتهم على اطراف الاسنة لمشوا عليها فقال قائل منهم هذا الكلام وهم يمشون فنظر عليه السلام الى غنيمات تدعى فقال لو كان اناس الشيعة من يوافقنا في القلب واللسان على امر الخروج لجدّ هذه الاغنام لخرج القائم لنا قال الراوي فعددتها فاذا مجموعها سبعة عشر شاة۔

روایتوں میں امام جعفر سے یہ وارد ہوا ہے کہ شیعہ لوگ امام کو جہاد کی تحریص دلاتے تھے اور کہتے تھے کہ عراق میں ایسے شیعہ موجود ہیں کہ اگر آپ انہیں نیزوں پہ چلنے کو کہیں تو ایسا کر گزریں گے۔ امام راستہ میں چلے جا رہے تھے جب کہنے والے نے یہ بات کہی۔ سامنے بکریاں چر رہی تھیں امام نے ان کی طرف دیکھا اور کہا اگر ان بکریوں کی تعداد کے مطابق صحیح شیعہ دنیا میں موجود ہوتے جو دل اور زبان سے ہماری موافقت کرتے تو امام ظاہر ہو جاتا راوی کہتا ہے میں نے بعد میں بکریاں شمار کیں تو وہ سترہ تھیں۔

امام جعفر کو شکایت رہی کہ انہیں عمر بھر ۱۷ شیعہ بھی نہ ملے جن کے دل اور زبان میں مطابقت ہو۔ اور اگر ۱۷ صحیح شیعہ دنیا میں پائے جاتے تو امام ظاہر ہو جاتا۔ گویا امام اس وقت ظاہر ہو گا جب پورے کرۂ ارض میں ۱۷ شیعہ پائے جائیں گے۔ یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے محرم میں تو سیاہ پوش فوج کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تو کیا یہ سارے تقیہ ہی کر رہے ہوتے ہیں ان کی زبان پر جو کچھ ہوتا ہے دل میں وہ نہیں ہوتا۔

۴ - اصول کافی صـ۴۹۶

لو وجدت منكم ثلاثة مؤمنين يكتمون حديثي ما احللت ان اكتمهم حديثي۔

امام جعفر نے فرمایا اگر تین صحیح شیعہ مجھے مل جاتے جو میری حدیث کو چھپا رکھتے تو میں کوئی حدیث نہ چھپاتا۔

معلوم ہوا کہ امام جعفر کو عمر بھر تین صحیح شیعہ نہ ملے جو راز کی بات دل میں رکھ سکتے۔ اس لیے امام نے اپنی حدیثیں بیان نہیں کیں کیونکہ صحیح آدمی کوئی نہ ملا۔ مگر امام سے منسوب

حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ جو شیعوں میں متداول ہے وہ کہاں سے آگیا؟ امام کو تو اپنی حدیث سنانے کی حسرت ہی رہی اور یار لوگوں نے امام کی حدیثوں کا دریا بہا دیا۔ پس اگر امام نے کوئی حدیث بیان کر بھی دی تو وہ چھپا رکھنے کے لیے تھی۔ اسے ظاہر کر کے امام سے بغاوت کرنے کا کیا فائدہ ہوا۔

۵ - انوار نعمانیہ ۱ : ۱۵۶

وهم اي شيعتنا لا يعلمون بظهوره لانهم يصيرون وتروا بين يديه وهم ثلثمائة وثلاثة عشر رجلا بعدة اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر۔

شیعہ ہمارے امام کے ظہور کو نہیں جانتے اگر وہ اصحاب بدر کی تعداد کے مطابق ہو جاتے تو امام کے سامنے کھڑے ہوتے۔

معلوم ہوا کہ ۳۱۳ کے عدد کو باطل کے دبانے سے خاص تعلق ہے بشرطیکہ مخلص اور سچے مومن ہو جیسے اصحاب بدر ابوبکر، عمر، عثمان اور دوسرے صحابہ سچے اور مخلص مومن تھے۔

انوار نعمانیہ کی مذکورہ روایت کے ساتھ آگے ذکر ہے

قال المفضل فالاثنان وسبعون رجلا الذين قتلوا مع الحسين يظهرون معه قال نعم يظهرون معه وفيهم الحسين في اثنا عشر الف من المؤمنين من شيعة علي عليه السلام۔

مفضل نے کہا اصحاب حسین کی تعداد کے برابر ۷۲ شیعہ ہو جاتے تو امام ظاہر ہو جاتا امام نے کہا کہ ہاں مع حسین ہوں گے اور ۱۲ ہزار شیعہ ہوں گے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ امام کا ساتھ دینے والے ۷۲ ہی ہو جاتے تو خواہ باطل دب نہ سکتا مگر ان کا جوش جہاد اور شہادت تو بروئے کار آتا۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ امام کے ظاہر ہونے کے لیے کبھی ۳۱۳ شیعہ کا دنیا میں موجود ہونا شرط قرار پایا کبھی ۱۷ کبھی تین کبھی ۷۲ مگر ایک شرط ایسی رکھ دی جس کا علم اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کو نہیں ہو سکتا لہٰذا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ امام کب ظاہر ہوں گے۔

امام ظاہر ہو کر کیا کارہائے نمایاں انجام دیں گے؟ اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے عقیدہ نمبر ۶ مسئلہ رجعت بھی ضروریات دین سے ہے اس کا منکر مذہب شیعہ سے خارج ہے۔

مسئلہ رجعت کیا ہے؟ حق الیقین میں ملا باقر مجلسی نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا

ہے اجمالی طور پر بیان کیا جاتا ہے :-

۱ - قیامت سے پہلے امام مہدی کے زمانہ میں ایک قیامت آنے گی حضرت آدمؑ سے لیکر اس وقت تک کے تمام مردہ انسان زندہ کئے جائیں گے - جنات کو بھی زندہ کیا جائے گا انبیاء سمیت تمام انسانوں اور جنوں کے بادشاہ امام مہدی ہوں گے -

۲ - دنیا کی عمر ایک لاکھ برس ہے ۲۰ ہزار برس دوسروں کی حکومت ہوگی پھر ظہور مہدی سے لے کر ۸۰ ہزار برس تک شیعہ کی حکومت ہوگی -

زمانہ رجعت کا نقشہ :- شیعوں کی حالت -

۱ - انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶۳

اذا قام القائم بعث الله الی کل قبر من قبور المؤمنین ملکا ینادیہ ھذا امامك قد ظھر فان اردت ان تحیی وتلحق بہ و ان اردت ان تبقی فی النعیم الی یوم القیامۃ فی مکانك -

جب امام مہدی ظاہر ہوں گے اللہ تعالیٰ ہر شیعہ کی قبر پر ایک فرشتہ بھیجے گا وہ کہے گا کہ امام ظاہر ہو گیا - اے شیعہ اگر تو زندہ ہونا چاہتا ہے تو زندہ ہو کر امام کے پاس آجا اور اگر چاہتا ہے تو قیامت تک جنت میں عیش کر -

یعنی زمانہ رجعت میں مردہ شیعوں کا زندہ ہونا ان کی مرضی پر موقوف ہوگا البتہ فرشتہ بھیج کر اتمام حجت کر دیا جائے گا کہ کسی کو گلہ نہ رہے -

۲ - انوار نعمانیہ ص ۱۶۰

و یدفع الله تعالی عنھم (شیعۃ) الضعف والکسل والبلاء والامراض -

شیعہ پر نہ بڑھاپا آئے گا نہ کمزوری نہ کوئی مصیبت آئے گی نہ بیماری -

تاکہ صدیوں کے طویل مصائب کی تلافی ہو سکے -

۳ - انوار نعمانیہ ص ۱۶۰

یمد الله سبحانہ اسماعھم وابصارھم حتی انھم اذا کانوا فی بلاد والمھدی فی بلاد اخری یکون لھم من السمع والبصر ما یرونہ ویشاھدونہ وانوارہ ویسمعون کلامہ من حیثہ ویتکلمون معہ -

زمانہ رجعت میں شیعوں کی قوت سامعہ اور باصرہ اتنی تیز کر دی جائے گی کہ اگر شیعہ ایک شہر میں ہوگا اور امام دوسرے ملک میں تو شیعہ امام کو دیکھیں گے اس کی کلام سن لیں گے اس سے آزادی سے بات چیت کر سکیں گے -

یعنی شیعہ کو ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ٹیلیویژن اور وائرلیس کی محتاجی نہ ہوگی -

۴ - ویتنور الارض بنورہ ویرتفع الظلمۃ ولا یحتاج الناس الی الشمس والقمر ویعمر کل واحد المؤمنین الف سنۃ یولد فی کل سنۃ ذکر ص

زمین امام کے نور سے روشن ہو جائے گی سورج چاند کی محتاجی نہ ہوگی ہر شیعہ کی عمر ہزار سال ہوگی اور اس کے ہاں ہر سال ایک لڑکا پیدا ہوگا -

یعنی کثرت آبادی کوئی پریشان کن مسئلہ نہ ہوگا - خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت نہ ہوگی البتہ مردوں کی کثرت ہو جائے گی اور عورت ڈھونڈے نہ ملے گی - خدا جانے جنسی داعیہ کی تسکین کی صورت کیا ہوگی -

۵ - ویظھر الله تعالی من مسجد الکوفۃ عینا من دھن وعینا من ماء وعینا من لبن -

اور اللہ تعالیٰ شیعوں کے لیے مسجد کوفہ سے ایک چشمہ گھی کا ایک پانی کا اور ایک دودھ کا بہا دے گا -

اس نعمت کے لیے کوفہ کے مقام کا انتخاب شاید اس بنا پر ہوگا کہ کوفہ کے شیعوں نے امام کو گھر بلا کر پیاسا شہید کیا تھا اس لیے وہی ان نعمتوں کا مرکز بننے کے مستحق ہیں -

۶ - ویؤتی طعامھم وشرابھم من الجنۃ ویاکل الشیعۃ ثمار الشتاء فی الصیف وثمر الصیف فی الشتاء -

شیعوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں جنت سے آئیں گی اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل سردیوں میں کھائیں گے -

جبھی تو کثرت آبادی سے پریشانی نہ ہوگی ورنہ راشن سسٹم اور کنٹرول سسٹم کی ضرورت پڑتی مگر خدا جانے بے موسم پھل کھانے کی عادت کا فلسفہ کیا ہے -

۷ - ص ۱۶۲

ولا یبقی احد من الشیعۃ الا ان الله سبحانہ یلازم علیہ ملکا

اللہ تعالیٰ ہر شیعہ کی خدمت کے لیے ایک فرشتہ مقرر کرے گا جو اس کے چہرے پر سے گرد و غبار

يمسح الغبار عن وجهه ويطلعه على مكانه من الجنة۔

صاف کرے گا اور جنت میں اس کے ٹھکانے کی سیر کرائے گا۔

کھانا پینا جنت سے آئے گا دودھ گھی اور پانی کے چشمے ابل رہے ہوں گے چہرہ جانے ان کے چہروں پر گرد و غبار کہاں سے آئے گا ممکن ہے چہرہ پر مٹی ملتے رہنا ان کی بابی ہو۔ ظاہر ہے کہ شیعوں کے لیے یہ سنہری زمانہ ہوگا اس لیے مسئلہ رجعت پر یقین نہ رکھنا ان تمام نعمتوں اور عظمتوں سے محروم ہو جانا ہے۔

زمانۂ رجعت میں غیر شیعہ اور سنیوں کی حالت:۔

۸۔ انوار نعمانیہ ۱: ۱۶۱۔

ويحيى عائشة ويعذبها۔

پھر امام مہدی ام المؤمنین عائشہ کو زندہ کرے گا اور انہیں عذاب دے گا۔

قرآن نے حضور اکرمؐ کی ازواج مطہرات کو حضورؐ کی امت کے لوگوں کی مائیں کہا ہے۔ اگر امام مہدی حضورؐ کی امت میں سے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اپنی ماں سے وہ سلوک کریں گے جسے کوئی شریف آدمی پسند نہیں کرتا بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر حضورؐ کی امت سے خارج ہوں گے تو آزاد ہیں۔

۹۔ بصائر ص۲۱۳

لو قد قام قائمنا لقد رد اليه الحميرا حتى يجلدها الحد حتى ينتقم لابنة محمد۔

جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو حضرت عائشہ کو ان کے سپرد کر دیا جائے گا حتیٰ کہ ان پر حد جاری کرے گا اور حضرت فاطمہ کا بدلہ لے گا۔

۱۰۔ انوار نعمانیہ ص۱۵۲

فيأمر بعد ثلاثة ايام و يحفر قبورهما ويخرجهما فيخرجان طريان كصورتهما في الدنيا فيكشف عنهما اكفانهما ويأمر بوضعهما على دوحة يابسة نخرة فيصلبهما ... ثم يأمر بهما فيقتلان في كل يوم و ليلة الف قتلة ويردان الى اشد العذاب ثم يأمر نارا تخرج من الارض تحرقهما والشجرة ثم يأمر ريحا فتنسفهما في اليم نسفا۔

پھر تین دن کے بعد امام مہدی حکم دے گا ابوبکر و عمر کی قبریں کھود کر باہر نکالا جائے۔ وہ باہر نکالے گا تو ان کے جسم تر و تازہ ہوں گے جیسے دنیا میں تھے۔ ان کے کفن اتارے گا پھر ایک خشک درخت پر انہیں لٹکائے گا پھر حکم دے گا انہیں روزانہ ایک ہزار بار قتل کیا جائے پھر انہیں شدید عذاب دے گا۔ پھر آگ کو حکم دے گا زمین سے نکلے گی انہیں جلا دے گی پھر ہوا کو حکم دے گا ان کی راکھ کو اڑا کر سمندر میں پھینک دے گی۔

یعنی جن جسموں کو ہزاروں برس تک مٹی میں پڑے رہنے کے باوجود محفوظ رکھا گیا کیونکہ اہل اللہ کے جسم کو مٹی خراب نہیں کر سکتی ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا کہ انسانیت اور شرافت کھڑی ماتم کر رہی ہوگی۔

۱۱۔ انوار نعمانیہ ص۱۶۴

وفي تفسير قوله تعالى سنسمه على الخرطوم قال في الرجعة امير المومنين عليه السلام ويرجع اعداءه فيسمهم كما توسم البهائم على الخرطوم۔

آیت سنسمہ الخ کی تفسیر یہ ہے کہ زمانہ رجعت میں حضرت علی اپنے دشمنوں یعنی سنیوں اور اصحاب رسول کے چہروں ناک اور ہونٹوں پر داغ دیں گے جیسے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔

۱۲۔ انوار نعمانیہ ص۱۶۵

وفي تفسير قوله تعالى فان له معيشة ضنكا۔ ان تاويلها في الصواب ..... ان يكون طعامهم في الرجعة العذرة۔

آیت فان لہ۔ الخ کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ زمانہ رجعت میں سنیوں کی غذا شیعوں کا پاخانہ ہوگا۔

حق الیقین ص۳۴۹ اور بصائر الدرجات ص۸۱ پر یہی ہے کہ سنیوں کی غذا گندگی اور پیشاب ہوگا۔

زمانہ رجعت میں امام کے انقلابی کام:۔

۱۔ انوار نعمانیہ ۱: ۱۵۷

وتتوجه الی المدینة وقال المفضل ما یصنع بالکعبة فقال انه یهدم هذا البیت ۔

پھر امام تعمیری کام کی طرف متوجہ ہوگا مفضل نے کہا کہ کعبہ سے کیا سلوک کرے گا۔ فرمایا اس گھر کو مٹا دے گا۔

کیونکہ یہ مسلمانوں کا مرکز ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

جعل اللہ الکعبة البیت الحرام قیاما للناس ۔

اور امام اپنے تعمیری کام کی بسم اللہ اس گھر کو مٹانے سے نہ کرے تو اس کے ظہور کا فائدہ کیا ہوا۔

۲ ۔ وکذلك یهدم جمیع مابناه الظالمون فی کل اقالیم ویهدم المسجد الحرام ومسجد رسول اللہ ۔

اسی طرح دنیا کی تمام مساجد جو سنیوں نے بنائی ہیں انہیں گرا دے گا اور کعبہ اور مسجد نبوی کو منہدم کر دے گا۔

۳ ۔ ویخرج القرآن الذی الفه امیر المؤمنین ولم یعمل به الاشقیاء ویعمل بذلك القرآن وذالك امیر المؤمنین علیه السلام کانی انظر الی الشیعة قد بنوا الخیام بمسجد الکوفة وجلسوا یعلمون القرآن جدید للناس ۔

پھر امام وہ قرآن نکالے گا جو حضرت علی نے تالیف کیا تھا اور بدبختوں نے اس پر عمل نہ کیا تھا اس نئے قرآن پر عمل ہوگا اور امیر المومنین نے کہا یوں لگتا ہے جیسے میں دیکھ رہا ہوں مسجد کوفہ میں شیعہ بیٹھے نئے قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں۔

۱ ۔ امام اپنے تعمیری کام کی ابتدا کعبہ اور مسجدیں گرانے سے کرے گا مسجد بنانے کا ذکر نہیں۔

۲ ۔ اسلام کا مرکز مکہ اور مدینہ ہے امام کا مرکز کوفہ ہوگا۔ کیونکہ کربلا کے میدان میں شیعوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا صلہ ملنا چاہیے ۔

۳ ۔ اشقیا نے اس نئے قرآن پر عمل نہیں کیا تھا۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے

ا ۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نئے قرآن پر عمل کیا تھا ؟

ب ۔ کیا حضرت علی نے اس نئے قرآن پر عمل کیا تھا ؟

ج ۔ کیا اہل بیت نے اس پر عمل کیا تھا ؟

د ۔ کیا دیگر ائمہ نے اس پر عمل کیا تھا ؟

ان سوالوں کا جواب ”نہیں“ کے سوا کیا ہو سکتا ہے ۔

تو پھر اشقیاء کس کو کہا گیا ہے ؟

۴ ۔ رجال کشی ص ۹۳ اور بصائر الدرجات ص ۲۱۳

ثم یقوم بامر جدید وکتاب جدید وسنة جدیدة وقضاء جدید علی العرب شدید لیس شانه الا القتل ولا یستتیب ۔

امام ۔ نیا اسلام نیا قرآن نئی سنت نئے احکام لائے گا عربوں کو سخت سزا دی جائے جو قتل سے کم نہ ہوگی ان کی توبہ قبول نہ ہوگی ۔

(کشی) فلو قد قام قائمنا وتکلم متکلمنا ثم استانف بکم تعلیم القرآن وشرائع الدین والاحکام والفرائض کما انزل اللہ تعالیٰ علی محمد صلی اللہ علیه وسلم

پھر ہمارا امام قائم ہوگا متکلم کلام کرے گا۔ از سر نو قرآن کی تعلیم ہوگی شریعت اور احکام کی تعلیم اس طرح ہوگی جس شکل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔

یہ کام تو بلاشبہ مہتم بالشان اور تعمیری نوعیت کے ہیں مگر تعجب اس بات پہ ہے کہ جس ہستی پہ قرآن نازل ہوا جس آخری نبی کو آخری شریعت دی گئی اس نے سب کچھ چھپائے رکھا اور امام اسے ظاہر کرے گا تو اس پر قرآن نازل کرنے کی ضرورت کیا تھی کیوں نہ امام پر ہی نازل کیا جاتا ۔

حکومت ائمہ :۔

انوار نعمانیہ ص ۱۴۳

روی ابن طاؤس ان عمر الدنیا مائة الف سنة یکون منها عشرون الف سنة ملك جمیع اهل الدنیا ویکون ثمانون الف سنة منها مدة ملك آل محمد ۔

ابن طاؤس روایت کرتا ہے کہ دنیا کی عمر ایک لاکھ برس ہے ۲۰ ہزار برس تک دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی حکومت ہوگی اور ۸۰ ہزار برس آل محمدؐ کی حکومت ہوگی ۔

انوار نعمانیہ ص ۱۴۳

وملكها امير المؤمنين عليه السلام اربعة واربعين الف عام۔

(۴۴ ہزار میں سے) ۴۴ ہزار سال حضرت علی کی حکومت ہوگی۔

حق الیقین میں ملا باقر مجلسی نے کہا ہے کہ امام مہدی کی حکومت صرف ۲۹ برس ہوگی۔ پھر امام حسین کی حکومت ۳۰۹ برس (صفحہ ۳۵۰)

اور مختصر بصائر الدرجات صفحہ ۱۸ پر ہے امام حسین کی حکومت ۴۰ برس ہوگی۔

امام مہدی کی فتوحات اور انبیاء کا تعاون :-

بصائر الدرجات صفحہ ۲۱۳

ويفتح الله له الروم والصين والترك والديلم والسند والهند وكابل والخزر يا۔

امام مہدی روم، چین، ترکی، دیلم، سندھ ہند، کابل اور خزریا کو فتح کریں گے۔

انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶۲

وكذا نصرة الانبياء عليهم الصلوة والسلام لم تحصل بعد لانهم ما تواقبل ما تى بعد هذا سينصرونى فى زمان رجعتى ويكون لى ملكا بين المشرق والمغرب يخرج الله لنصرتى الانبياء من آدم الى محمد يجاهدون معى ويقتلون بسيوفهم الكفار الاحياء والاموات الذين يحييهم الله ...... وانا الذى اظهر آخر الزمان ومعى عصاء موسى وخاتم سليمان اضعه فى وجه المؤمن والكافر فينقش فيه هذا مؤمن وهذا كافر۔

اسی طرح تمام انبیاءؑ میری (امام مہدیؑ) امداد کریں گے کیونکہ وہ میری امامت سے پہلے فوت ہوگئے اور میری مدد کا موقع نہ مل سکا میری حکومت مشرق و مغرب تک پھیلے گی اللہ تعالیٰ میری امداد کے لیے حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء کو قبروں سے نکالے گا وہ میری قیادت میں تلواروں سے جہاد کریں گے۔ تمام مردہ کفار کو اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا اور یہ انہیں قتل کریں گے۔ میں آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گا میرے پاس عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان ہوگی میں یہ انگوٹھی ہر شخص کے چہرہ پر رکھوں گا اس پر لکھا جائیگا یہ مومن ہے یہ کافر ہے

۱۔ یعنی زمانہ رجعت میں مراتب کی ترتیب الٹ جائے گی۔ امام مہدی سالار لشکر ہونگے اور انبیاء ان کی قیادت میں جہاد کریں گے۔ ممکن ہے اس وقت انبیاء یہ تمنا کرنے لگیں ہم نبی نہ ہوتے امام ہوتے۔

حضرت علی کی قیادت میں ایک خوفناک جنگ :-

انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶۳

فقال الراوى كم لامير المؤمنين من رجعة فقال ان له رجعات ورجعات وما من امام فى عصر من الاعصار الا يرجع ويرجع معه المؤمنين فى زمانه والكافرون فيه حتى يتولى اولئك المؤمنون على اولئك الكافرين فينتقمون منهم فاذا جاء الوقت المعلوم ظهر امير المؤمنين مع اصحابه وظهر الشيطان مع اصحابه فيتلاقى العسكران على الفرات فى مكان اسمه روحاء قريب الكوفة فيقع بينهم حرب لم يقع فى الدنيا من اولها و آخرها وكانى ارى اصحاب امير المؤمنين قد رجعوا منهزمين حتى تقع ارجلهم فى الفرات فعند ذلك يرسل الله سحابة مملوءة من الملائكة يتقدمها النبى صلى الله عليه وسلم وبيده حربة من

راوی نے امام جعفر سے پوچھا حضرت علی کی کتنی رجعتیں ہوں گی فرمایا ان کی کئی رجعتیں ہوں گی۔ ہر امام رجعت کرے گا اس کیساتھ اس کے زمانہ کے مومن اور کافر بھی رجعت کریں گے مؤمنین کو غلبہ ہوگا کافروں سے انتقام لیں گے۔ جب وقت مقررہ آئے گا۔ حضرت علی اپنے اصحاب سمیت رجعت کریں گے اور شیطان اپنے ساتھیوں کا لشکر لے کر میدان میں آجائے گا دریائے فرات کے کنارے کوفہ کے قریب روحاء کے مقام پر جنگ ہوگی۔ ایسی جنگ دنیا دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی اور میں دیکھ رہا ہوں کہ حضرت علی کی فوج شکست کھا کر بھاگی جا رہی ہے حتیٰ کہ دریا میں غرق ہو رہے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ایک بادل بھیجے گا جو فرشتوں سے پر ہوگا آگے آگے نبی کریمؐ ہوں گے ان کے ہاتھ میں نور کا نیزہ ہوگا شیطان

نور فاذا نظر الشيطان اليه ادبر فيقول له اصحابه الى اين تفر ذلك الظفر فيقول انى ارى ما لا ترون انى اخاف من عقاب رب العلمين فيصل النبیؐ و يضربه ضربة بالحربة بين كتفيه منه فيهلك بتلك الضربة هو مع جميع عساكره فعند ذلك يعبد الله على الاخلاص ويرتفع الكفر والشرك ويملك امير المؤمنين الدنيا اربعين الف سنة ويولد لكل شيعة الف ولد من صلبه۔

اس نیزے کو دیکھ کر میدان سے بھاگ نکلے گا۔ اس کے ساتھی پوچھیں گے کہاں بھاگ رہا ہے کہے گا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تمہیں نظر نہیں آتا میں خدا کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ رسول خداؐ اس کے کندھوں کے درمیان نیزے کا وار کریں گے وہ ہلاک ہو جائے گا اس کا لشکر بھی ہلاک ہو جائے گا پھر پورے خلوص سے اللہ کی عبادت کی جائے گی۔ حضرت علی پوری دنیا کے بادشاہ ہوں گے اور ان کی حکومت ۴۰ ہزار سال تک رہے گی ہر شیعہ کی صلب سے ایک ہزار لڑکا پیدا ہوگا۔

اس روایت سے کئی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں

(۱) حضرت علی کئی بار رجعت کریں گے۔ اس عقیدہ اور ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ میں کوئی فرق نہیں۔

(۲) حضرت علی کی قیادت میں شیعہ کی جنگ شیطان سے ہوگی۔ حضرت علی شکست کھا جائیں گے تو کیا حضرت علی کو صرف اس لیے زندہ کیا جائے گا کہ دنیا دیکھ لے شیطان سے شکست کھا گئے ہیں۔

(۳) فوج شیعہ میں دنیا بھر کے اولین و آخرین شیعہ ہوں گے مگر ایسے بزدل کہ بھاگ جائیں گے بلکہ ڈوب مریں گے۔ یہ معلوم نہیں کہ ڈر کے مارے یا شرم کے مارے۔

(۴) اللہ و رسول خداؐ نے بتایا ہے کہ شیطان کو شکست دینے کا ہتھیار اللہ کا ذکر ہے۔ اعوذ پڑھو لاحول پڑھو شیطان بھاگ جاتا ہے مگر شیعہ کا بھاگ جانا شاید اس وجہ سے ہو کہ [illegible] کا تعلق [illegible] ہوگا

(۵) جب رسول خداؐ نے ہی شیطانی فوج کو تباہ کرنا ہے تو شیعوں کے سامنے حضرت علی کو شیطان سے شکست دلانے کی کیا ضرورت ہوگی۔

(۶) حضرت علی کے ماتحت تمام انبیاء کا جنگ کرنا۔ انبیاء کی توہین معلوم ہوتی ہے۔

ایک پہیلی

۱۔ انوار نعمانیہ کی روایت گذر چکی ہے کہ امام مہدی آخر الزمان [illegible]

۲۔ بصائر الدرجات ص۳۹

ثم يكون من بعده اى بعد الامام المهدى اثنى عشر مهديا فاذا حضرته الوفاة فيسلمها الى ابنه: اول المهديين له ثلاثة اسامى اسم كاسمى واسم ابى وهو عبد الله واحمد والاسم الثالث المهدى وهو اول المؤمنين۔

امام مہدی کے بعد ۱۲ مہدی اور ہوں گے جب مہدی کی وفات کا وقت آئے گا ان مہدیوں میں سے پہلے مہدی کو حکومت سونپ دے گا۔ اس کے تین نام ہوں گے ایک میرا نام اور میرے باپ کا نام عبداللہ کی طرح۔ دوسرا احمد اور تیسرا مہدی اور وہ پہلا مومن ہوگا۔

یعنی مہدی آخر الزمان کے بعد ۱۲ مہدی اور ہوں گے۔ کل ۱۳ مہدی ہوئے۔ ان بارہ مہدیوں میں سے پہلا مہدی پہلا مسلمان ہوگا۔ پھر مہدی آخر الزمان کیا ہوں گے۔

۳۔ بصائر الدرجات ص۳۸

قال يا ابا حمزة ان منا بعد القائم احد عشر مهديا من ولد الحسين عليه السلام

امام جعفر فرماتے ہیں اے ابوحمزہ ہم سے امام مہدی کے بعد گیارہ مہدی ہوں گے جو امام حسین کی اولاد میں سے ہوں گے۔

یعنی مہدی آخر الزمان کے بعد ۱۱ مہدی ہوں گے کل بارہ مہدی ہوئے۔

۴۔ انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶۲

[illegible] الحسين [illegible] الدنيا [illegible]

امام مہدی کی وفات کے بعد [illegible]

ثلثمائة سنة وتسع سنين فاذا توفي الحسين ظهر امير المؤمنين حتى يكون هو له دولة

دنیا پر ۳۰۹ برس حکومت کریں گے۔ امام حسین کی موت کے بعد حضرت علی کی حکومت ہوگی۔

ان بیانات روایات کا خلاصہ یہ ہوا :-

۱ ۔ مہدی بارھواں امام آخر الزمان ہوگا۔

۲ ۔ مہدی کے بعد بارہ مہدی اور ہوں گے۔

۳ ۔ ان بارہ مہدیوں میں سے پہلا مہدی پہلا مومن ہوگا۔

۴ ۔ مہدی کے بعد بارہ مہدی ہوں گے۔

۵ ۔ مہدی کے بعد امام حسین کی حکومت ہوگی۔

۶ ۔ امام حسین کے بعد حضرت علی کی حکومت ہوگی۔

یہ ذکر نہیں کہ مہدی کے بعد بارہ مہدی بھی امام ہوں گے۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے اس طرح امام بارہ نہ ہوئے چوبیس ہوگئے۔

۵ سید نعمت اللہ الجزائری ایک اور الجھن پیدا کر گئے ہیں۔

وفي اعلام الورى قد جاءت الرواية الصحيحة انه ليس بعد دولة القائم دولة لاحد ... ان القائم عليه السلام يمضي من الدنيا قبل يوم القيامة باربعين يوما.

صحیح روایات میں ہے کہ امام مہدی کے بعد کسی کی حکومت نہ ہوگی اور امام مہدی قیامت سے صرف ۴۰ روز پہلے فوت ہوں گے۔

انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶۳ پر ایک روایت درج ہے کہ سب سے آخر حضرت علی کی وفات ہوگی۔ ان میں سے کس کو بھی آخر میں وفات پانے والا تسلیم کیا جائے حضور کے اس فرمان کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا کہ تقوم الساعة على اشرار الناس یہ تو داستان در داستان والی بات ہے۔ نہ جانے اس کا حل کیا ہے۔

روایات رجعت کے راویوں پر بحث :-

مسئلہ رجعت سے متعلق روایات مختلف راویوں سے مروی ہیں ان کی ثقاہت اور عدالت کا جائزہ لینا اس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے میں مدد دے گا۔

۱ ۔ پہلا راوی عبداللہ بن سبا ہے۔ جس کے متعلق گذشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ منافقانہ ایمان لایا تھا۔ دراصل یہودی تھا۔ غلو کرتا تھا۔ حضرت علی کو خدا کہتا تھا۔ اسی قول کی وجہ سے حضرت علی نے اس کی جلاوطنی کا حکم دیا تھا۔

۲ ۔ دوسرا راوی مفضل بن عمر کوفی ہے اس کے متعلق رجال کشی ص۲۰۶

عن حماد بن عثمان قال سمعت ابا عبد الله عليه السلام يقول للمفضل بن عمر الجعفي يا كافر يا مشرك

حماد کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر سے سنا وہ مفضل کو کہتے تھے اے کافر! اے مشرک!

اور ص۲۰۷ پر ہے

لعنه الله وبرئ منه قال انلعنه قال نعم فالعناه وابرءا منه برئ الله ورسوله.

اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ راوی کہنے لگے آپ اس پر لعنت کرتے ہیں۔ فرمایا ہاں ہم اس پر لعنت کرتے ہیں ہم اس سے بیزار ہیں اللہ اور رسولؐ اس سے بیزار ہیں۔

رجعت کی ۹/۱۰ روایات کا راوی یہی ہے جسے امام جعفر نے مشرک، کافر اور ملعون فرمایا۔

(۳) تیسرا راوی جابر جعفی ہے امام باقر سے اس کی ملاقات زندگی بھر میں صرف ایک بار ہوئی اور امام جعفر سے اس کی ملاقات مطلق نہیں ہوئی مگر امام باقر سے اس نے ۷۰ ہزار حدیث بیان کی۔

رجال کشی ص۱۲۵

عن جابر بن يزيد الجعفي قال حدثني ابو جعفر عليه السلام تسعين الف حديث لم احدثها احدا قط ولا احدث احدا ابدا.

جابر بن یزید جعفی کہتا ہے کہ امام باقر نے ۷۰ ہزار حدیث مجھ سے بیان کی میں نے کسی کو نہیں بتائی نہ بتاؤں گا۔

اور ص۱۲۶

عن زرارة بن اعين قال سألت ابا

زرارہ کہتا ہے میں نے امام جعفر سے جابر بن

عبد اللہ علیہ السلام عن احادیث جابر فقال ما رایتہ عند ابی قط الا مرۃ واحدۃ وما دخل علی قط۔

یزید کی حدیثوں کے متعلق پوچھا فرمایا کہ میں نے تو جابر کو دیکھا ہی نہیں میرے والد کے پاس ایک مرتبہ حاضر ہوا تھا۔

جس شخص نے ایک ملاقات کا یہ فائدہ اٹھایا کہ، ہزار حدیث روایت کرڈالی اس کے سچا ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

ان تینوں راویوں نے رجعت کا عقیدہ تیار کیا جس میں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ خود علمائے شیعہ اس گتھی کو سلجھانے سے عاجز آگئے ہیں مگر اس کے باوجود یہ عقیدہ ضروریات دین میں شمار ہوتا ہے جو عقیدہ ایسے تین راویوں کی روایات کی بنا پر ضروریات دین میں شمار ہوا جن کو امام نے مشرک کافر اور ملعون وغیرہ فرمایا تو اس دین کا کیا کہنا جس کی ضروریات ایسا عقیدہ ہو۔

مسئلہ رجعت اور علمائے شیعہ:۔

انوار نعمانیہ ۱: ۱۶۵

اقول الحق ان الاخبار الواردۃ فی باب الرجعۃ مختلفۃ جدا مع کثرتھا فمن جملۃ اختلافھا ترتیب ملک الائمۃ وکیفیۃ حکمھم فی الدنیا اھو علی طریق الاجتماع ام علی طریق الانفراد۔

میں کہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ رجعت کے بارہ میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان میں بڑا اختلاف ہے بالخصوص ائمہ کی حکومت کی ترتیب اور اس کی کیفیت میں بڑا اختلاف ہے آیا ان کی حکومت اجتماعی صورت میں زمانہ واحد میں ہوگی یا انفرادی صورت میں۔

علامہ دلدار علی مجتہد فرماتے ہیں:۔

اساس الاصول ص۴۰۷ طبع لکھنؤ۔

الاحادیث الماثورۃ عن الائمۃ مختلفۃ جدا لایکاد یوجد حدیث الاوفی مقابلتہ حدیث ما ینافیہ حتی لا یتفق خبرا الاوبازائہ ما یضادہ حتی صار ذلک سببا لرجوع بعض الناقصین عن اعتقاد الحق کما صرح بہ شیخ الطائفۃ فی اوائل التہذیب والاستبصار۔

حدیثیں جو ائمہ سے منقول ہیں ان میں سخت اختلاف ہے کوئی حدیث ایسی نہیں ملتی جس کے خلاف دوسری

حدیث نہ ہو کوئی خبر ایسی نہیں جس کے متضاد خبر نہ پائی جائے حتیٰ کہ بہت سے ناقص لوگ اس وجہ سے دین حق سے پھر گئے جیسا کہ ہمارے پیشوا نے تہذیب اور استبصار میں صراحت کی ہے۔

علامہ دلدار علی نے اپنے پیشرو سید نعمت اللہ الجزائری کی تائید کردی کہ رجعت کے بارے میں حدیثوں میں اختلاف ہی نہیں تضاد موجود ہے مگر ایک بات نئی کہہ گئے کہ اس تضاد کی وجہ سے بہت سے ناقص لوگ اعتقاد حق سے پھر گئے۔ یعنی جن لوگوں نے جھوٹ اور سچ میں تمیز کرلی حقیقت اور افسانہ میں فرق محسوس کرلیا وہ تو ٹھیرے ناقص اور جن لوگوں میں اتنی عقل نہیں کہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کرسکیں یا اتنی تمیز کے باوجود جھوٹ پر جمے رہے وہ ہوئے کاملین اور جس مذہب کے اصولی عقائد کی بنیاد وہ حدیثیں ہوں جو ملعون کافروں اور مشرکوں سے مروی ہوں وہ مذہب ہوا حق۔

مسئلہ رجعت کے متعلق اس گورکھ دھندا کو دیکھ کر آدمی سوچتا ہے کہ آخر اس جگ ہنسائی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ عقیدہ ضروریات دین میں کیوں شمار کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ:۔

۱ - عبد اللہ بن سبا نے جو مذہب ایجاد کیا اور اس میں جس کاریگری سے تقدس کا رنگ بھرا اسے کوئی صاحب علم آدمی تسلیم نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ ایک مجموعۂ اضداد تھا مگر جہلاء، نفس پرست اور نو مسلم جو دین سے ناواقف تھے انہیں بہلانے کا ایک بہانہ ڈھونڈ لیا گیا۔

۲ - ائمہ شیعہ کو حکومت ملی ہی نہیں۔ حضرت علی کی حکومت کو شیعہ برائے نام حکومت کہتے ہیں۔ سوال ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ جواب دیا کہ بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ائمہ کرام کی حکومت ۸۰ ہزار سال تک رہے گی۔

۳ - شیعہ لوگ اپنا مذہب چھپائے پھرتے ہیں اور ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں

تسلی دی گئی وقت آنے والا ہے کہ شیعہ کو کھانے پینے کی چیزیں جنت سے تازہ بتازہ ملیں گی۔ ہر شیعہ کے گھر ایک فرشتہ ملازم ہوگا یہ سنی جن کو اس وقت خوشحال اور حکمران دیکھتے ہو ان کی لاشیں نکال کر جلائی جائیں گی ان کی غذا پاخانہ اور پیشاب ہوگا۔

۴۔ سوال ہوا کہ آخیر کب ہوگا؟ جواب ملا قیامت سے پہلے ایک زمانہ آئے گا اسے رجعت کہتے ہیں اس میں وہ ساری تلافی ہوگی جو دنیا میں ائمہ اور عوام شیعہ کے ساتھ ظلم کی صورت میں روا رکھی گئی۔

۵۔ زمانہ رجعت میں تو ہم بدلہ لے لیں گے مگر قیامت میں کیا بنے گا؟ جواب ملا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں سنیوں کی تمام نیکیاں شیعوں کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گی اور شیعوں کے سارے گناہ سنیوں پر لادے جائیں گے۔ چنانچہ سید نعمت اللہ نے اپنے خاص رنگ میں یہ توجیہ پیش کر دی۔

انوار نعمانیہ ۱: ۱۶۵

لان الغرض الاصلی من تلك الدولة الاخذ الحقوق الماضية وقصاص الظالمين علی ما دتھم منھم لان علیاً قد ملك سلطانا لم يتمكن فيه من عزل الشريح القاضی ولا عزل من نصبه المتخلفون الثلثة ولا قدر علی محو بدعة ابتدعوھا بل يمكن ان يقال ان نسبة تلك الدولة المنتقلة الی امير المؤمنين علی والحسين واكثر من نسبته الی المھدی۔

رجعت کی اصل غرض گذشتہ غصب شدہ حقوق حاصل کرنا اور ظالموں سے بدلہ لینا ہے جو ان سنیوں سے شیعوں اور ائمہ پر ظلم ہوتے رہے۔ چونکہ حضرت علی کو برائے نام حکومت ملی تھی وہ قاضی شریح کو بھی معزول نہ کر سکے اور خلفائے ثلثہ نے جن عمال کو مقرر کیا تھا ان کو بھی معزول نہ کر سکے ان بدعات کو بھی نہ مٹا سکے جو خلفائے ثلثہ نے رائج کی تھیں۔ زمانہ رجعت میں حضرت علی اور امام حسین کی حکومت مستقل ہوگی اور امام مہدی کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔

عقیدہ ۶ :- بارہ امام رسول خدا کی طرح معصوم اور مفترضۃ الطاعت ہیں۔ ایک امر

میں رسول خدا پر فضیلت رکھتے ہیں کہ انہیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے کا اختیار ہے۔

۱۔ اصول کافی ص ۱۱۷ امام جعفر فرماتے ہیں

ما جاء به علیٌ اخذ به وما نھی عنه انتھی عنه جری له من الفضل مثل ما جری لمحمد ولمحمد الفضل علی جميع ما خلق الله عزوجل والمتعقب عليه فی شیئ من احكامه كالمتعقب علی الله وعلی رسوله والراد عليه فی صغيرة او كبيرة علی حد الشرك بالله كان امير المؤمنين باب الله الذی لا يؤتی الا منه وسبيله الذی من سلك بغيره يھلك وكذلك يجری لائمة الھدی واحد بعد واحدة۔

میں ان احکام پر عمل کرتا ہوں جو حضرت علی لائے ہیں اور ان کاموں سے باز رہتا ہوں جن سے انہوں نے منع کیا ان کی شان محمدؐ کی مثل ہے اور رسول خدا کی فضیلت تمام مخلوق پر ہے۔ علی کے حکم پر اعتراض کرنے والا ایسا ہے جیسے خدا اور رسولؐ کے حکم پر اعتراض کرنے والا اور ان کی کسی چھوٹی یا بڑی بات کا انکار کرنا اللہ سے شرک کرنے کے برابر ہے۔ علی۔ اللہ کے دروازہ ہیں جس کے بغیر کوئی اللہ تعالےٰ تک نہیں پہنچ سکتا وہ خدا کی راہ ہیں جو اس راہ کے بغیر کسی دوسری راہ پر چلا ہلاک ہوا اسی طرح تمام ائمہ کی عظمت اور شان ہے۔

امام جعفر نے حضرت علی کے حق میں جو الفاظ فرمائے ہیں اللہ تعالےٰ نے وہی الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمائے ہیں :- ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا دین شیعہ میں بارہ اماموں کی وہی حیثیت ہے جو نبی کریمؐ کی ہے۔

۲۔ اصول کافی ص ۲۷۸

عن محمد سنان قال كنت عند ابی ابی جعفر الثانی فاجريت اختلاف الشيعة فقال يا محمد ان الله تبارك وتعالی

محمد بن سنان کہتا ہے کہ میں امام محمد تقی کے پاس بیٹھا تھا میں نے شیعوں کے مذہبی اختلاف کا ذکر کیا فرمایا اے محمدؐ خدا تعالےٰ اپنی ذات

لم یزل متفردا بوحدانیتہ ثم خلق محمدا وعلیا وفاطمہ فمکثوا الف دھر ثم خلق جمیع الاشیاء فاشھدھم خلقھا واجری طاعتھم علیھا وفوض امورھا الیھم فھم یحلون ما یشاؤن ویحرمون مایشاؤن ولن یشاؤا الا ما یشاء اللہ تبارک وتعالیٰ۔

میں متفرد تھا اس نے محمدؐ، علی، فاطمہ کو پیدا کیا اور ان کو اپنی مخلوق پر گواہ بنایا اور ان کی اطاعت مخلوق پر فرض کی اور مخلوق کے تمام معاملات ان کے سپرد کئے یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال کہیں جسے چاہیں حرام کہیں یہ وہی چاہتے ہیں جو خدا تعالےٰ چاہتا ہے۔

۱ ۔ محمدؐ بن سنان نے جب شیعہ کے مذہبی اختلافات کا ذکر کیا تو امام نے وجہ بتائی کہ ائمہ کے اختیارات اس کا سبب ہے۔ ایک امام نے ایک چیز کو حلال کیا دوسرے نے حرام کر دیا تو اختلاف کیوں نہ ہو۔

۲ ۔ ائمہ کو پیدا کر کے خدا فارغ ہو گیا ائمہ جیسا چاہیں نظام کائنات چلائیں۔

۳ ۔ اگر ائمہ اپنی مرضی سے حلال وحرام میں تبدیلی کرتے ہیں تو خدا ہوئے اور اگر خدا کے حکم سے کرتے ہیں تو ان پر وحی کا آنا لازم ہوا تو نبی ہوئے۔ پہلی صورت قبول کی جائے تو توحید کا انکار لازم آتا ہے۔ دوسری صورت صحیح قرار دی جائے تو ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ یہ بھی کفر وہ بھی کفر۔

عقیدہ ۵ :۔ امام کے علوم صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ نہیں بلکہ ان کے علاوہ ان کے پاس یہ وسائل ہیں مصحف فاطمہ، کتاب علی، چمڑے کا تھیلا جس میں اولین وآخرین کے تمام علوم جمع ہیں۔ فرشتے ان کو بتاتے ہیں۔ ہر جمعہ امام کو معراج کرایا جاتا ہے ہر معراج میں نئی نئی ہدایات ملتی ہیں ہر سال شب قدر میں ان پر ایک کتاب نازل ہوتی ہے جس میں سال بھر کے لیے احکام اور ہدایات ہوتی ہیں۔ امام کو نجوم کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس ذریعہ سے بہت سی باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔

اصول کافی باب فیہ الصحیفۃ والجفر والجامعۃ ومصحف فاطمہ ابو بصیر کی طویل روایت کا کچھ حصہ۔

ثم قال یا ابا محمد وان عندنا الجامعۃ وما

پھر امام نے فرمایا اے ابو محمدؐ ہمارے پاس

یدریھم ما الجامعۃ قال قلت جعلت فداک وما الجامعۃ قال صحیفۃ طولھا سبعون ذراعا بذراع رسول اللہ واملاءہ من فلق فیہ وخط علی بیمینہ فیھا کل حلال وحرام وکل شیئ یحتاج الیہ الناس حتی الارش فی الخدش وضرب بیدہ فقال لی تأذن یا ابا محمد قال قلت جعلت فداک انما انا لک فاصنع قال فغمزنی بیدہ وقال حتی ارش ھذا کانہ مغضب ثم قال وعندنا الجفر وما یدریھم ما الجفر قال قلت وما الجفر قال وعاء من ادم فیہ علم النبیین والوصیین وعلم العلماء الذین مضوا من بنی اسرائیل ثم قال وعندنا المصحف فاطمہ علیھا السلام وما یدریھم ما مصحف فاطمہ قال مصحف فیہ مثل قرانکم ھذا ثلاث مرات واللہ ما فیہ من قرانکم حرف واحد۔

الجامع بھی ہے اور لوگ کیا جانیں جامعہ کیا ہے میں نے کہا قربان جاؤں جامع کیا ہے فرمایا وہ ایک کتاب ہے جس کا طول رسول خدا کے ستر ہاتھ کے برابر ہے۔ جو رسول خدا کے منہ سے بولی ہوئی اور حضرت علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں تمام حلال وحرام اور تمام وہ چیزیں جن کی لوگوں کو ضرورت ہے لکھی ہوئی ہیں حتیٰ کہ زخم کے چھل جانے کی دیت بھی اس میں ہے پھر ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا ابو محمدؐ اکیا تم مجھے اجازت دیتے ہو۔ میں نے کہا قربان جاؤں میں تو آپ ہی کا ہوں جو آپ چاہیں کریں پھر امام نے اپنے ہاتھ سے دبایا جیسے وہ غصہ میں ہیں کہ اس کی دیت بھی ہے۔ پھر فرمایا ہمارے پاس جفر بھی ہے اور لوگ کیا جانیں جفر کیا ہے میں نے کہا قربان جاؤں جفر کیا ہے فرمایا چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء اور وصیاء اور علمائے بنی اسرائیل کا علم ہے پھر فرمایا ہمارے پاس مصحف فاطمہ بھی ہے لوگ کیا جانیں مصحف فاطمہ کیا ہے وہ ایک مصحف ہے تمہارے اس قرآن سے تین گنا اور خدا کی قسم تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی اس میں نہیں ہے۔

امام کا آخری جملہ ایک معمہ بن گیا۔ اگر فرماتے کہ اس قرآن کا ایک کلمہ بھی مصحف فاطمہ میں

نہیں تو غیر ایک بات تھی مگر ایک "حرف بھی نہیں" کا مطلب یہ ہوا کہ عربی کے ۲۸ حروف میں سے کوئی حرف اس میں نہیں اس لیے لازماً وہ مصحف کسی اور زبان میں ہوگا۔

اصول کافی کے اسی باب میں مصحف فاطمہ کی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

ان الله تعالیٰ لما قبض نبیه صلی الله علیه وسلم دخل فاطمه حزن مالا یعلمه الا الله عزوجل فارسل الیها ملکا یسلی غمها و یحدث فشکت الی امیرالمومنین فقال اذا احسست بذلک وسمعت الصوت وقولی لی فاعلمته بذلک فجعل امیرالمومنین یکتب کل ما سمع حتی اثبت من ذلک مصحفا۔

رسول کریم کی وفات سے حضرت فاطمہ کو اتنا رنج ہوا کہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا کہ انہیں تسلی دے اور باتیں کرے حضرت فاطمہ نے حضرت علی کو یہ بات بتا دی انہوں نے فرمایا جب ایسا محسوس کریں مجھے بتائیں چنانچہ حضرت فاطمہ نے بتایا اور حضرت علی فرشتہ سے جو سنتے لکھتے جاتے حتی کہ یہ مصحف تیار ہوگیا۔

یعنی حضرت فاطمہ کا غم غلط کرنے کے لیے تسلی دینے والی باتوں کا مجموعہ مصحف فاطمہ ہے۔

اصول کافی ص ۱۳۵

یاخثیمة نحن شجرة النبوة و بیت الرحمة و مفاتیح الحکمة و معدن العلم و موضع الرسالة و مختلف الملائکة۔

امام جعفر نے فرمایا اے خثیمہ ہم نبوت کے درخت ہیں۔ رحمت کے گھر ہیں حکمت کی کنجیاں ہیں۔ علم کی کان ہیں۔ رسالت کا محل ہیں ہمارے پاس فرشتوں کی آمدورفت رہتی ہے۔

اصول کافی ص ۱۵۵ ہر جمعہ کو معراج ہونے کا بیان

فتصبح الانبیاء والاوصیاء قد ملئوا سرورا ویصبح الوصی الذی بین ظهرانیکم وقد زید فی علمه مثل الجم الغفیر۔

پس انبیاء اور اولیاء پھولے نہیں سماتے اور جو وصی تمہارے درمیان ہے اس کے علم میں جم غفیر کے برابر اضافہ ہوتا ہے۔

اصول کافی ص ۱۳۵

ولقد قضی ان یکون فی کل سنة لیلة یهبط فیها تفسیر الامور الی مثلها من السنة المقبلة۔

فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہر سال میں ایک رات ایسی ہو کہ اس میں تمام احکام کی تفسیر نازل کی جائے جو سال آئندہ کی اس رات تک ہونے والے ہیں۔

علامہ قزوینی شارح کافی نے شرح صافی کتاب التوحید جزء دوم ص ۲۲۷ پر فرمایا

برائے ہر سال کتاب علیحدہ است مراد کتاب است کہ دراں تفسیر احکام و حوادث کہ محتاج الیہ امام است تا سال دیگر نازل شوند بآں کتاب ملائکہ و روح در شب قدر بر امام زماں۔ اللہ تعالیٰ باطل کند بآں کتاب آنچہ را کہ می خواہد از اعتقادات امام خلائق و اثبات می کند درو آنچہ می خواہد اعتقادات۔

ہر سال کے لیے علیحدہ کتاب ہے۔ کتاب سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان احکام اور واقعات کی تفسیر جن کی امام کو آمدہ سال تک حاجت ہو ملائکہ اور روح القدس شب قدر میں یہ کتاب لے کر نازل ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے اللہ تعالےٰ جن عقائد کو چاہے باطل قرار دیتا ہے اور جنہیں چاہے قائم رکھتا ہے۔

شب قدر والی کتاب میں عقائد میں ترمیم و تنسیخ ہوتی ہے یعنی ہر سال نازل ہونے والی سابقہ کتاب کی ناسخ ہوتی ہے۔

اصول کافی ص ۱۴۷ سے شب قدر کے بیان میں ایک مستقل باب شروع ہوتا ہے ص ۱۵۱ پر امام باقر کی روایت ہے۔

انه ینزل فی لیلة القدر الی اولی الامر تفسیر الامور سنة سنة یؤمر فیها فی امر نفسه بکذا وکذا و فی امر الناس بکذا وکذا۔

شب قدر میں بلاشبہ امام کی طرف امام کی ذات کے لیے ایسے ایسے احکام نازل ہوتے ہیں اور لوگوں کے حق میں ایسے ایسے احکام نازل ہوتے ہیں۔

امام کے تخلیق دین اور شریعت کے جن ماخذوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے :۔

(۱) جو دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اس میں کمی رہ گئی ہے نامکمل ہے قابل ترمیم و تنسیخ ہے۔

(۲) حضور اکرمؐ پر وحی کا سلسلہ بند نہیں ہُوا بلکہ ائمہ پر ملائکہ اور روح القدس احکام لے کر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ گویا نبوت ختم نہیں ہوئی صرف نام بدلا ہے۔

(۳) دین کے عقائد اور شریعت کے احکام میں ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا

فروع کافی کتاب الروضۃ طبع لکھنؤ صـ۵۳ نجوم کے متعلق۔

عن معلی بن خنیس قال سألت ابا عبداللہ عن النجوم احق ھی؟ قال نعم ان اللہ عزوجل بعث المشتری الی الارض فی صورۃ رجل فاخذ رجل من العجم فعلمہ النجوم حتی ظن انہ قد بلغ ثم قال لہ انظر این المشتری فقال ما اراہ فی الفلک و ما ادری این ھو فنحاہ واخذ بید رجل من الھند فعلمہ حتی ظن انہ قد بلغ فقال انظر الی المشتری این ھو فقال ان حسابی لیدل انک انت المشتری قال فشھق شھقۃ فمات وورث علمہ اھلہ فالعلم ھناک۔

معلی بن خنیس کہتا ہے میں نے امام جعفر سے پوچھا کیا علم نجوم حق ہے فرمایا ہاں حق ہے مشتری ستارہ کو اللہ تعالےٰ نے آدمی کی شکل میں زمین پر بھیجا اس نے عجم کے ایک آدمی کو نجوم سکھایا اس کے خیال میں جب وہ کمل کو پہنچ گیا تو اس سے کہا دیکھو مشتری کہاں ہے اس نے کہا آسمان پر تو نہیں نہ جانے کہاں ہے مشتری نے اسے چھوڑ دیا اور ایک ہندی کو نجوم سکھایا۔ جب وہ کامل ہوگیا تو اس سے یہی سوال کیا ہندی نے کہا میرا حساب کہتا ہے تو مشتری ہے۔ مشتری نے چیخ ماری اور مرگیا اس کے علم کے وارث اہل ہند ہوئے ہیں۔

دوسری روایت اس کے بعد

عن ابی عبداللہ قال سئل عن النجوم و قال لایعلمھا الا اھل بیت من العرب و اھل بیت من الھند۔

امام جعفر سے نجوم کے متعلق پوچھا گیا فرمایا نجوم کا علم سوائے عرب کے ایک خاندان کے اور ہند کے ایک خاندان کے کوئی نہیں جانتا۔

پہلی روایت سے معلوم ہُوا کہ علم نجوم کے وارث اہل ہند ہیں۔ جو ہندو پنڈت اور

جوگی ہی ہوسکتے ہیں۔ دوسری روایت سے معلوم ہُوا کہ علم نجوم اہل عرب کے ایک خاندان میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اصل وارثوں سے یہ علم سیکھا۔ اور عرب کے خاندان سے مراد ائمہ ہی ہوسکتے ہیں کیونکہ ان کے پاس علم نجوم ہوتا ہے۔ گویا ائمہ نے یہ علم اہل ہند سے سیکھا اور اس علم نے امام کو فرائض امامت بجالانے میں مدد دی۔

کتاب علی کا تفصیلی تعارف ایک طویل روایت میں یوں کرایا گیا ہے۔

عن زرارہ قال سألت اباجعفر عن الجد فقال ما اجد احدا قال فیہ الابرأیہ الا امیرالمؤمنین قلت اصلحک اللہ فما قال فیہ امیرالمؤمنین فقال اذا عدا فالقینی حتی اقرئکہ فی کتاب قلت اصلحک اللہ حدثنی فان حدیثک احب الی من ان تقرئنیہ فی کتاب فقال لی الثانیۃ اسمع ما اقول لک اذا کان غدا فالقینی حتی اقرئک فی کتاب فاتیتہ من الغد بعد الظہر وکانت ساعتی التی کنت اخلوبہ فیھا الظھر والعصر و کنت اکرہ ان اسألہ الا خالیا خشیۃ ان یفتینی من اجل من یحضرہ بالتقیۃ فلما دخلت علیہ اقبل علی ابنہ جعفر فقال اقرأ زرارہ صحیفۃ الفرائض ثم قام لینام فبقیت انا وجعفر فی البیت فقام فاخرج الی صحیفۃ

زرارہ سے روایت ہے میں نے دادا کی میراث کے متعلق امام باقر سے پوچھا فرمایا سوائے حضرت علی کے میں کسی کو ایسا نہیں پاتا جس نے اپنی رائے سے بات نہ کی ہو میں نے کہا اللہ آپ کا بھلا کرے امیرالمؤمنین نے اس کے متعلق کیا کہا امام نے کہا کل مجھے ملنا ایک کتاب سے پڑھا دوں گا میں نے کہا اللہ آپ کا بھلا کرے آپ مجھے زبانی بتا دیجئے مجھے آپ کی زبان سے سننا زیادہ پسند ہے۔ فرمایا میری بات سنو کل مجھے ملنا ایک کتاب سے تمہیں پڑھا دوں گا دوسرے روز ان کے پاس گیا کہ ظہر اور عصر کے درمیان ان سے تنہائی میں ملتا تھا۔ تنہائی کے بغیر ان سے پوچھنا پسند نہیں تھا کہ لوگوں کے خوف سے تقیہ کرکے فتویٰ نہ دے دیں چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے جعفر سے کہا زرارہ کو علم فرائض کا صحیفہ پڑھا دو خود سونے کے لیے اٹھ گئے۔ اب میں اور امام جعفر تنہا رہ گئے جعفر نے ایک

من فخذ البعير فقال لست اقرئکها حتی یحل لی الله علیك ان لا تحدث بما تقرأ فیها احدا حتی اذن لك و لم یقل حتی یأذن لك ابی فقلت اصلحك الله لم تضیق علی و لم یأمرك ابوك بذالك فقال ما کنت بناظر فیها الا علی ما قلت لك فقلت فذالك لك و کنت رجلا عالما بالفرائض والوصایا بصیرا بها فلما القی الی طرف الصحیفة اذا کتاب غلیظ یعرف انه من کتب الاولین فنظرت فیها فاذا فیها خلاف ما بایدی الناس من الصلة والامر المعروف الذی لیس فیه اختلاف فاذا عامه کذالك فقرأته حتی اتیت علی اٰخره بخبث نفس و قلة تحفظ واسقام رأی وقلت وانا اقرأه باطل حتی اتیت علی اٰخره ثم ادرجتها و دفعتها الیه ثم لقیت اباجعفر فقال لی اقرأت صحیفة الفرائض فقلت نعم فقال کیف رأیت ما قرأت فقلت باطل

کتاب نکالی جو اونٹ کی ران کے برابر تھی۔ کہا یہ کتاب نہیں پڑھاؤں گا جب تک خدا کی قسم نہ کھاؤ کہ اس میں پڑھ کے کسی کو نہ بتاؤ گے جب تک میں اجازت نہ دوں امام نے اپنے والد کی اجازت کی شرط نہ لگائی میں نے کہا اللہ آپ کا بھلا کرے مجھ پر ایسی تنگی کیوں ہے؟ آپ کے والد نے تو آپ کو یہ نہ کہا تھا۔ جواب دیا تم اس کتاب کو اسی شرط سے دیکھ سکتے ہو میں نے کہا آپ کی خاطر یہ شرط منظور ہے میں فرائض اور وصایا کا صاحب بصیرت عالم تھا جب امام جعفر نے صحیفہ کا ایک کنارہ کھولا تو دیکھا کہ ایک موٹی سی کتاب ہے اگلے لوگوں کی (یہود و نصاریٰ کی) اس میں کے مسائل تمام لوگوں کی معلومات سے مختلف ہیں صلہ رحمی اور امر بالمعروف کے مسائل جن میں کسی کو اختلاف نہیں وہ بھی بالکل مختلف ہیں۔ میں نے یہ کتاب خباثت نفس سے پڑھی یاد رکھنے کا ارادہ نہیں تھا اور بری رائے تھی میں پڑھتا جاتا اور کہتا جاتا یہ باطل ہے ختم کر کے امام کے حوالے کی۔ امام باقر سے ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا تم نے فرائض کی کتاب پڑھی میں نے کہا ہاں پوچھا کیا رائے ہے میں نے کہا باطل ہے کسی کام کی نہیں لوگوں کے عقیدہ کے

لیس بشیء خلاف ما الناس علیه قال فان الذی رأیت فالله یا زرارہ هو الحق الذی رأیت املاء رسول الله وخط علی بیدہ فاتانا الشیطان فوسوس فی صدری فقال وما یدری انه املاء رسول الله وخط علی بیدہ فقال لی قبل ان انطق لا تشك ود الشیطان والله انك شککت وکیف لا ادری انه املاء رسول الله صلی الله علیه وسلم و خط علی بیدہ وقد حدثنی ابی عن جدی ان امیر المؤمنین حدثه بذالك

خلاف ہے امام نے کہا زرارہ تو سچ کہتا ہے خدا کی قسم جو کتاب تو نے دیکھی ہے وہ رسول کریمؐ نے لکھوائی اور حضرت علی نے لکھی پھر شیطان نے مجھے وسوسہ ڈالا کہ تمہیں کیسے علم ہوا کہ حضورؐ نے لکھوائی اور حضرت علی نے لکھی امام باقر میری طرف متوجہ ہوئے اور میرے بولنے سے پہلے ہی فرمایا۔ شیطان کا وسوسہ ہے شیطان کا دوست بن کر شک نہ کر خدا کی قسم تم نے شک کیا ہے مجھے کیونکر علم نہ ہو کہ یہ کتاب حضورؐ نے لکھوائی اور حضرت علی نے لکھی مجھے میرے والد نے میرے دادا سے بیان کیا ہے کہ امیر المؤمنین نے انہیں یہ بات بتائی تھی۔

کتاب علی کے متعلق اس طویل روایت سے کئی اہم راز معلوم ہوئے۔

۱ ۔ امام نے زرارہ کو دین کے متعلق کچھ بتانا اس شرط پر منظور کیا کہ وہ کسی کو نہ بتائے گا گویا دین چھپا رکھنے کی چیز ہے بتانے کی نہیں۔ اسلام تو اس کے بالکل برعکس مطالبہ کرتا ہے۔

۲ ۔ زرارہ علم الفرائض کا ماہر اور صاحب بصیرت تھا اس نے کتاب علی کو مسلمہ عقائد کے بالکل خلاف پایا جبھی تو کہا باطل ہے۔

۳ ۔ امام کسی کو اصل اور صحیح نہ بتاتے تھے۔ اس لیے زرارہ جیسے خاص اصحاب اس تاک میں رہتے کہ تنہائی میسر آئے تو امام سے کوئی صحیح بات معلوم کر سکیں یعنی امام جو کچھ ظاہر میں کہتے تھے دل میں وہ بات نہیں ہوتی تھی۔ اس دو رنگی کو اسلام کی اصطلاح میں نفاق کہتے ہیں۔ کیا امام کے متعلق یہ تصور دینا امام کی توہین نہیں۔

عقیدہ ۹:۔ جس طرح نبی کا تقرر من جانب اللہ ہوتا ہے امام کو بھی خدا ہی مقرر کرتا ہے کوئی شخص نہ تو خود امام بن سکتا ہے نہ لوگ بنا سکتے ہیں۔

خدا کی طرف سے ۱۲ لفافے سربمہر نازل ہوئے ہر امام کے نام کا علیحدہ لفافہ تھا جو احکام اس لفافہ میں لکھے ہوتے امام اس پر عمل کرتا تھا۔

اصول کافی صہ۱۷۱ ایک مستقل باب اسی عنوان سے ہے۔ امام جعفرؒ سے منقول ہے

ان الوصیۃ نزلت من السماء کتابا لم ینزل علی محمد کتاب مختوم الا الوصیۃ	وصیت مُہر شدہ آسمان سے نازل ہوئی نبی کریمؐ پر وصیت کے علاوہ کوئی مہر شدہ حکم نازل نہیں ہوا

امام حسینؓ کے نام کے لفافے میں درج تھا:-

قاتل فاقتل وتقتل واخرج باقوام للشهادة لاشهادة لهم الا معك ۔	لڑو۔ لوگوں کو قتل کرو خود قتل ہو جاؤ۔ شہادت کے لیے لوگوں کو ساتھ لے جاؤ انہیں شہادت صرف تمہاری معیت میں ملے گی۔

امام زین العابدین کے لفافے میں یہ وصیت تھی۔

اصمت واطرق لما حجب العلم۔	خاموش رہو سر جھکائے رکھو کیونکہ علم پوشیدہ ہو گیا۔

امام باقر کے لفافہ میں لکھا تھا۔

فسر کتاب الله وصدق اباك وورث ابنك واصطنع الامة وقم بحق الله عز وجل وقل الحق في الخوف والامن ولا تخش الا الله	کتاب اللہ کی تفسیر کر۔ اپنے آبا کی تصدیق کر امت کی تربیت کر خدا کے حق کو قائم کر خوف و امن کی حالت میں سچ کہہ اللہ کے بغیر کسی سے نہ ڈر۔

امام جعفر کا لفافہ۔

حدث الناس وافتهم وانشر علوم اهل بيتك وصدق اباءك الصالحين ولا تخافن الا الله وانت في حرز وامان۔	لوگوں سے حدیث بیان کر فتویٰ دے اہل بیت کے علوم کی اشاعت کر اپنے نیک باپ دادا کی تصدیق کر اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈر تو حفاظت اور امان میں ہے۔

ائمہ کے نام حکم بڑے واضح ہیں مگر ان کی تعمیل کا معاملہ ذرا الجھا ہوا ہے مثلاً کتاب اللہ کی تفسیر کا حکم ہے مگر کتاب اللہ غائب ہے تفسیر کس کی ہو۔ حدیث بیان کرنے کا حکم ہے مگر

امام کو کوئی قابل اعتبار آدمی نہیں ملتا حدیث کس سے بیان کرے۔ علوم کی اشاعت کا حکم ہے مگر امام دین کی بات بتانے سے پہلے قسم لیتا ہے کہ کسی کو نہ بتانا۔ حکم ہے اللہ سے ڈر مگر امامؒ ڈرتا ہے لوگوں سے۔ اور کوئی سچی بات کرتا ہی نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ائمہ نے طے کر لیا تھا کہ وصیت کی مخالفت لازماً کرنی ہے۔ وصیت کا معاملہ بناوٹی ہے یا وصیت میں بھی تقیہ کا دخل ہے۔ اگر وصیت درست ہے تو ائمہ کے طرز عمل سے حکم عدولی کے بغیر اور کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا۔

حضرت علی نے اپنے نام کے لفافہ کے مندرجات پڑھ کر فرمایا

نعم قبلت ورضيت وانتهكت الحرمة وعطلت السنن ومزق الكتاب وهدمت الكعبة وخضبت لحيتي من رأسي بدم عبيط صابرا محتسبا ابدا حتى اقدم عليك ثم دعا رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة والحسن والحسين واعلمهم مثل ما اعلم امير المؤمنين فقالوا له مثل قوله ۔	ہاں میں نے قبول کیا میں راضی ہو گیا اگرچہ میری بے عزتی کی جائے سنت رسولؐ معطل کی جائے قرآن پھاڑا جائے اور کعبہ کو گرا دیا جائے اور میری داڑھی میرے سر کے خون سے رنگین کر دی جائے ہمیشہ صبر کروں گا حتیٰ کہ آپ کے پاس پہنچ جاؤں پھر حضورؐ نے فاطمہ اور حسنین کو بلایا ان کو وہی بتایا جو حضرت علی کو بتایا تھا انہوں نے بھی وہی جواب دیا۔

حضرت علی کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حق پر قائم رہنے اور باطل کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کا معاہدہ کیا خواہ انہیں کتنی قربانی دینی پڑے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے اگر خلفائے ثلثہ بقول شیعہ باطل پر تھے تو حضرت علی کیوں خاموش رہے۔ مقابلہ کرنا اور قربانی دینا تو بجائے خود رہا احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کاروبار خلافت میں ان کے مشیر خاص رہے یہ صورت دو حال سے خالی نہیں یا وصیت فرضی ہے یا خلفائے ثلثہ حق پر تھے۔

اس سلسلے میں یہ راز نہ کھل سکا کہ امام جعفر کے بیٹے اسمٰعیل کی امامت کا اعلان ہو گیا لازماً ان کے نام کا لفافہ بھی ہو گا وہ تو بند کا بند ہی رہ گیا اور لفافوں کی تعداد بارہ کی جگہ تیرہ ہو گئی۔ بارہ لفافے تو خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے یہ تیرھواں لفافہ کہاں سے

آگیا۔

عقیدہ ۱۰:- ہر امام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رجسٹر ملتا ہے جس میں تمام شیعہ سنی کے نام مع ولدیت درج ہوتے ہیں امام ہر آدمی کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔

اصول کافی صفحہ ۱۳۶ امام رضا سے منقول ہے۔

انا لنعرف الرجل اذا رأیناه بحقیقة الایمان وحقیقة النفاق وان شیعتنا لمکتوبون باسمائهم واسماء آبائهم اخذ الله علینا وعلیهم المیثاق یردون موردنا و یدخلون مدخلنا لیس علی ملة الاسلام غیرنا وغیرهم۔

امام باقر نے فرمایا ہم آدمی کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں مومن ہے یا منافق ہمارے شیعہ کے نام معہ ولدیت ہمارے پاس لکھے ہوئے ہیں خدا نے ان پر ہم سے عہد لیا ہے وہ ہمارے نقوش قدم پر چلتے ہیں۔ سوائے ہمارے اور شیعہ کے کوئی دوسرا اسلام پر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ائمہ کی رہنمائی کا اہتمام تو خوب کیا مگر اس سے اماموں نے استفادہ کم ہی کیا مثلاً امام حسین کو جب کوفہ کے شیعوں نے خطوط لکھ کر بلایا تو امام اپنے رجسٹر سے ان کے نام کیوں نہ پڑھ لئے اور ان کے جھانسے میں کیوں آگئے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ دیکھ کر ہی پہچان سکتے ہوں مگر نام اور ولدیت سے یہ تو معلوم کر سکتے تھے کہ ہمارے شیعہ سے ہیں۔ جبھی تو ان کے بلاوے پر چلے گئے یہ اور بات ہے کہ انہوں نے یہ خط تقیہ کر کے لکھے ہوں۔ یا تقیہ کر کے یزید کی فوج کا ساتھ دیا ہو بہر حال امام کو ان شیعہ کے ہاتھوں مصائب دیکھنے پڑے۔

عقیدہ ۱۱:- اماموں کی باتیں اور ان کی حدیثیں ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

اصول کافی صفحہ ۲۷۵ ایک مستقل باب ہے

ان حدیثنا صعب مستصعب لا یحتمله الا صدور منیرة او قلوب سلیمة او اخلاق حسنة۔

ہماری حدیثیں سخت مشکل ہوتی ہیں۔ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کا سینہ منور ہو قلب سلیم ہو اور اخلاق حسنہ ہوں۔

بات تو ٹھیک ہے بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کی حدیثیں سمجھ ہی کوئی نہیں سکتا تو حدیثیں بیان کرنے کی غرض کیا ہے۔ اور خلفائے

ثلثہ اور امہات المومنین کے خلاف ائمہ کی جو حدیثیں بیان کی جاتی ہیں ان کا وہ مطلب شیعوں نے کیسے سمجھ لیا جو وہ بیان کرتے ہیں۔ ان کے متعلق اتنے وثوق سے کیوں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے تھے ویسے تھے کیوں نہ توقف کیا گیا کہ ائمہ کی حدیثوں کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا اس لئے خاموشی بہتر ہے۔

لا یحتمله کی تاویل یا تشریح یوں کی گئی ہے

عن بعض اصحابنا قال کتبت الی ابی الحسن صاحب العسکر جعلت فداک ما معنی قول الصادق حدیثنا لا یحتمله ملک مقرب ولا نبی مرسل ولا مؤمن امتحن الله قلبه للایمان فجاء الجواب معنی قول الصادق ای لا یحتمله ملک مقرب ولا نبی ولا مؤمن ان الملک لا یحتمله حتی یخرجه الی ملک غیره والنبی لا یحتمله حتی یخرجه الی نبی غیره والمؤمن لا یحتمله حتی یخرجه الی مؤمن غیره۔

ہمارے اصحاب شیعہ میں سے کسی نے کہا میں نے امام حسن عسکری کو لکھا کہ امام جعفر کے اس قول کا مطلب کیا ہے کہ ہماری حدیث کا متحمل کوئی نہیں ہو سکتا نہ مقرب فرشتہ نہ نبی نہ مومن جواب آیا کہ مطلب یہ ہے کہ کوئی مقرب فرشتہ ہماری حدیث دوسرے فرشتہ کو بتائے بغیر نہیں رہ سکتا اور نبی دوسرے نبی کو بتائے بغیر رہ نہیں سکتا اسی طرح کوئی مومن دوسرے مومن کو بتائے بغیر رہ نہیں سکتا۔

یعنی امام کی حدیث کی اشاعت کرنے پر ہر سننے والا مجبور ہو جاتا ہے۔

مگر ایک روایت میں اس کی صاف تردید کی گئی ہے۔ اصول کافی صفحہ ۲۵

عن ابی عبد الله علیه السلام قال ذکرت التقیة یوما عند علی ابن الحسین فقال والله لو علم ابو ذر ما فی قلب سلمان لقتله ولقد آخی رسول الله صلی الله علیه وسلم بینهما فما ظنکم بسائر الخلق

امام جعفر سے روایت ہے ایک روز امام زین العابدین کے سامنے تقیہ کا ذکر کیا گیا فرمایا خدا کی اگر ابوذر کو سلمان کے دل کا حال معلوم ہو جاتا تو اسے قتل کر دیتا حالانکہ حضور نے ان کے درمیان اخوت قائم کی تھی باقی مخلوق کا کیا پوچھنا ہو حقیقت یہ ہے

ان علم العلماء صعب متعصب ۔ کہ علماء (ائمہ) کا علم بڑا مشکل ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ائمہ کا عقیدہ تھا صحابہ رسول بھی تقیہ کرتے ہیں۔ اپنا صحیح عقیدہ کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے۔ دوسرے لوگ کس شمار میں ہیں۔ لہٰذا ائمہ کی حدیثیں یعنی صحیح عقیدہ ظاہر کرنا ممکن ہی نہیں۔

عقیدہ امامت اور ائمہ کے متعلق نادر باتیں:۔

۱۔ اصول کافی ص۲۳۳ امام باقر فرماتے ہیں۔

اذا حدثناکم الحدیث فجاء علی ما حدثناکم فقولوا صدق الله واذا جاء علی خلاف ما حدثناکم فقولوا صدق الله تؤجروا مرتین۔

جب ہم تمہارے سامنے کوئی حدیث بیان کریں اور وہ بات صحیح نکلے تو کہو اللہ نے سچ فرمایا اگر ہمارے کہنے کے خلاف واقع ہو جب بھی کہو اللہ نے سچ فرمایا ایسا کرنے پر دوہرا ثواب ملے گا۔

ظاہر ہے کہ ایسی حدیث مستقبل کے متعلق کوئی پیشگوئی ہو سکتی ہے۔

(۱) امام جو کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے اس لیے دونوں صورتوں میں کہو اللہ نے سچ فرمایا۔

(۲) سچ اور جھوٹ کو یکساں سمجھو۔

(۳) جھوٹ پر ایمان لانے میں دوہرا ثواب ہے۔

۲۔ اصول کافی ص۳۷

عن زرارۃ بن اعین عن ابی جعفر قال سألته عن مسئلة فاجابني ثم جاء رجل فسأله عنها فاجابه بخلاف ما اجابني ثم جاء آخر فاجابه بخلاف ما اجابني واجاب

زرارہ کا بیان ہے کہ میں نے امام باقر سے ایک مسئلہ پوچھا امام نے بتا دیا۔ دوسرا آدمی آیا اس نے وہی مسئلہ پوچھا امام نے اس کے برعکس بتایا تیسرا آدمی آیا وہی مسئلہ پوچھا امام نے سابقہ دونوں جوابوں کے

صاحبي فلما خرج الرجلان قلت یا ابن رسول الله رجلان من اهل العراق من شیعتکم قدما یسألان فاجبت کل واحد منهما بخیر ما اجبت به صاحبه فقال یا زرارۃ ان هذا خیر لنا وابقی لنا ولکم ولو اجتمعتم علی امر واحد لصدقکم الناس علینا ولکان اقل لبقائنا وبقائکم ثم قال قلت لابی عبدالله شیعتکم لو حملتموهم علی الاسنة او علی النار لمضوا وهم یخرجون من عندکم مختلفین قال فاجابني بمثل جواب ابیه۔

خلاف بتایا۔ جب وہ دونوں چلے گئے میں نے کہا اے ابن رسول وہ دونوں آپ کے پرانے شیعہ عراقی تھے آپ نے دونوں کو مختلف جواب دئیے فرمایا زرارہ! اس میں تمہاری اور ہماری بھلائی ہے اگر لوگ تمہیں ہماری حدیثیں بیان کرنے میں سچا سمجھ لیں تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں نہ تم۔ پھر کہا میں نے امام جعفر سے کہا تھا کہ آپ کے شیعہ ایسے ہیں کہ آپ انہیں نیزوں کی دھار پر یا آگ میں چلنے کا حکم دیں تو ایسا کر گزریں مگر وہ آپ کے پاس سے مختلف عقائد لے کر نکلتے ہیں تو انہوں نے وہی جواب دیا جو ان کے والد امام باقر نے دیا تھا۔

حاصل یہ ہوا کہ:۔

(۱) امام اپنے پرانے شیعوں کو بھی سچی بات نہیں بتاتے تھے۔

(۲) زرارہ نے امام کو یہ وجہ بتایا کہ یہ آپ کے پرانے شیعہ ہیں کیونکہ امام اپنے رجسٹر کی مدد سے پہچان گئے ہوں گے۔

(۳) امام باقر کے لفافہ میں لکھا تھا کہ ”خوف اور امن کی حالت میں سچ کہہ اللہ کے بغیر کسی سے نہ ڈر“ مگر اس حکم کی خوب تعمیل کرتے تھے کہ جان کے خوف سے سچی بات اپنے بیگانے کسی کو بھی نہیں بتاتے تھے۔

(۴) امام جعفر کے لفافہ میں لکھا تھا کہ ”اہل بیت کے علوم کی اشاعت کر اللہ کے بغیر کسی سے نہ ڈر“ مگر وہ جھوٹ کی اشاعت کرنے لگے اور اللہ کے بغیر سب سے ڈرنے لگے۔

زرارہ بھی معتبر شیعہ ہے اور صاحب اصول کافی بھی مستند محدث اور کتاب اصول کافی

کے متعلق امام نے فرمایا تھا ھذا کان لتشیعتیا مگر اس روایت سے ائمہ کی توہین ہوتی نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے امام نے خدا کی مخالفت کرنا اپنا مقصد زندگی سمجھ رکھا تھا۔

۳۔ مختصر بصائر الدرجات ص۹۴

عن ابی عبد اللہ قال جاء رجل فلما نظر الیہ ابو عبد اللہ قال اما واللہ لاضلنہ اما واللہ لادھشنہ مجلس الرجل فسألہ مسئلۃ فافتاہ فلما خرج قال ابو عبد اللہ لقد افتیتہ بالضلالۃ التی لاھدایۃ فیھا۔

امام جعفر فرماتے ہیں ایک آدمی ان کے پاس آیا اسے آتا دیکھ کر فرمایا بخدا میں ضرور گمراہ کروں گا وہم اور حیرانی میں ڈالوں گا۔ وہ بیٹھا مسئلہ پوچھا آپ نے فتویٰ دیا جب چلا گیا تو فرمایا میں نے اسے گمراہ کن فتویٰ دیا ہے میرے فتوے میں مطلق کوئی ہدایت نہیں۔

یعنی امام جعفر عموماً لوگوں کو گمراہ کرتے تھے گمراہ کن فتوے دیتے تھے۔ حالانکہ ان کو اپنے لفافہ میں یہ ہدایت ملی تھی کہ "اہل بیت کے علوم کی اشاعت کر" کیا اہل بیت کے علوم کی اشاعت کرنا اور لوگوں کو گمراہ کرنا جھوٹے فتوے دینا ایک ہی بات ہے؟

۴۔ ایضاً ص۹۵

عن موسی بن ایشم قال کنت عند ابی عبد اللہ علیہ السلام اذا اتاہ رجل فسألہ عن رجل طلق امرأتہ ثلاثا فی مقعد فقال ابو عبد اللہ قد بانت منہ بثلاث ثم اتاہ اٰخر فسألہ عن تلک المسئلۃ بعینھا قال ھی واحدۃ وھو املک بھا ثم اتاہ اخر فسألہ عن تلک المسئلۃ بعینھا فقال لیس بطلاق فاظلم علی البیت لما رأیت منہ فالتفت الی فقال یا ابن ایشم ان

موسیٰ بن اشیم کہتا ہے میں امام جعفر کے پاس بیٹھا تھا ایک آدمی آیا اس نے ایسے آدمی کے متعلق پوچھا جس نے ایک مجلس میں بیوی کو تین طلاق دی تھیں۔ فرمایا اس سے جدا ہوگئی تین طلاقوں کی وجہ سے۔ دوسرا آدمی آیا بعینہ یہی مسئلہ پوچھا فرمایا ایک طلاق ہوئی تیسرا آیا اور یہی سوال کیا فرمایا کوئی طلاق نہیں موسیٰ کہتا ہے امام کے اس فعل سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا امام میری طرف متوجہ ہوئے اور

اللہ تعالیٰ فوض الملک الی سلیمان فقال ھذا عطاؤنا فامنن او امسک بغیر حساب وان اللہ تعالیٰ فوض الی محمد امر دینہ فقال ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا فما کان الی محمد فقد فوض الینا۔

فرمایا ابن اشیم! اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو حکومت دی اور فرمایا یہ ہمارا انعام ہے جو چاہے کر کوئی پرسش نہیں تبی کر تم کو اللہ نے دین کی نعمت عطا کی اور فرمایا رسولؐ جو تمہیں دیں لے لو اور جس سے منع کریں رک جاؤ۔ اسی طرح یہ دین ہمارے سپرد ہوا ہم جو چاہیں کریں۔

اسی صفحہ پر یونس سے بھی یہی روایت بیان ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین کے معاملے میں جو مقام اور اختیارات حضورؐ کو حاصل تھے وہی امام کو بھی حاصل ہیں نبی اور امام میں کوئی فرق نہیں البتہ نبی سے جب قرآن بدل دینے کا مطالبہ ہوا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ "مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الی" گویا امام بھی وہی کہتے جو وحی کے ذریعے کہلوایا جاتا۔ گویا ختم نبوت کا عقیدہ شیعہ کے ہاں مسلم نہیں۔

۵۔ رجال کشی ص۱۵۴ عمر بن رباح نے امام باقر کے تقیہ کرنے پر شیعہ مذہب سے توبہ کرلی۔

فانہ زعم انہ سأل ابا جعفرؑ عن مسئلۃ فاجابہ فیھا بجواب ثم عاد الیہ فی عام اٰخر وزعم انہ سألہ عن تلک المسئلۃ بعینھا فاجابہ فیھا بخلاف الجواب الاول فقال لابی جعفر ھذا بخلاف ما اجبتنی فی ھذہ المسئلۃ عامک الماضی فذکر انہ قال لہ ان جوابنا خرج علی وجہ التقیۃ فشک فی امرہ وامامتہ

عمر بن رباح کا خیال ہے اس نے امام باقر سے ایک مسئلہ پوچھا انہوں نے بتا دیا۔ دوسرے سال آکر وہی مسئلہ پوچھا امام نے اس کے الٹ جواب دیا۔ اس نے کہا گزشتہ سال آپ نے اس کے الٹ بتایا تھا۔ فرمایا ہمارا وہ جواب تقیہ کی وجہ سے تھا اسے امام کے مذہب اور انکی امامت میں شک پڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ جب دین کے مسائل بتانے میں تقیہ کا سکہ چلتا ہے تو کسے خبر حق کیا ہے باطل کیا ہے بلکہ وثوق سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ امام کا اپنا مذہب کیا ہے۔ تقیہ کا ہتھیار ممکن ہے کہیں کام آسکے مگر اس کا یہ اثر تو یقینی ہے کہ ائمہ کا مذہب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ بصائر الدرجات ص ۹۶

الذی اذا سمع الحدیث ینسب الینا ویروی عنا فلم یحتمله قلبه واشمئز منه جحده واکفر من دان به ولا یدری لعل الحدیث من عندنا خرج والینا اسند فیکون بذلك خارجا من دیننا۔

جس نے ہماری طرف منسوب حدیث سنی اور ہم سے روایت کی گئی حدیث سنی اس کے دل نے اس حدیث کا انکار کیا یا اس حدیث کے ماننے والوں کو اس نے کافر کہا اور وہ نہیں جانتا کہ شاید یہ حدیث ہم سے بیان کی گئی ہو۔ پس وہ حدیث کا منکر اور ہمارے دین سے خارج ہو گیا۔

حدیث قبول کرنے کے لیے یہ شرط نہیں کہ امام سے ثابت ہو صرف امام سے منسوب ہونا کافی ہے ظاہر ہے کہ یہاں ثبوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سارا کام نسبت پر چلتا ہے مشکل یہ ہے کہ ایک طرف بتایا جاتا ہے کہ امام سچی بات اپنوں کو بھی نہیں بتاتے دوسری طرف اتنی پابندی کہ امام کی جھوٹی بات کا انکار کرنے والا دین سے خارج۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔

ان روایات کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ائمہ نے اپنا صحیح مذہب کسی کو نہیں بتایا۔

۲۔ ائمہ عموماً جھوٹے فتوے دیتے تھے اور ارادۃً لوگوں کو گمراہ کرتے تھے۔

۳۔ ائمہ کو اختیار ہے کہ اللہ و رسول کے جس حلال کو چاہیں حرام قرار دے دیں اور اس کے برعکس۔

۴۔ ائمہ کو منزل من اللہ مخصوص لفافوں میں یہ ہدایات دی گئی تھیں دین حق پھیلائیں خوف اور امن ہر حالت میں اللہ سے ڈریں مخلوق سے نہ ڈریں مگر ائمہ نے ہمیشہ ٹھیک ان ہدایات کے خلاف کام کیا۔ اور اس کے باوجود معصومین بھی ہیں اور صادقین بھی۔

بارھویں امام کے متعلق سید نعمت اللہ الجزائری محدث کا ذاتی واقعہ

انوار نعمانیہ ۱۸۰:۱۴۱ سید صاحب بیان کرتے ہیں ہم ۵۲۲ھ میں تجارت کی غرض سے گھر سے نکلے۔

واتفق انا مرنا فی البحر ونعد بنا الجهات التی کنا نصل الیها ورغبنا فی المکاسب ولم یدل علی ذلك حتی وصلنا علی جزائر عظمة کثیرة الاشجار۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اکتساب مال کی رغبت میں ہم سمندر میں چلے جا رہے تھے حتیٰ کہ ہم ایک ایسی جگہ جا اترے جو عظیم جزیرے تھے درختوں کی کثرت تھی۔

ہم نے جزیرے کا نام پوچھا معلوم ہوا اس کا نام مبارکہ ہے بادشاہ کا نام طاہر ہے دار الحکومت ظاہر یہ ہے ہم دن بھر چلتے رہے زاہریہ پہنچے ایسا خوبصورت شہر کبھی نہ دیکھا تھا تعجب ہوا کہ شیر چیتے سانپ وغیرہ باندھے ہوئے ہیں کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتے ہمیں بادشاہ کے سامنے حاضر ہونے کا حکم ملا۔

فحضرنا داره ودخلنا الی بستان فی وسطه قبة من فضة والسلطان فی تلك القبة وعنده جماعة..... هؤلاء قادمون؟ قلنا نعم وکانت تحیتهم ای تحیة الناس له ومخاطبتهم یا بن صاحب الامر فقال خیر مقدم ...... فقال انا طاهر بن محمد بن الحسین بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب

ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے ایک باغ کے درمیان ایک چاندی کے قبہ میں بادشاہ بیٹھا گرد ایک جماعت تھی۔ پوچھا یہ نو وارد ہیں ہم نے کہا جی ہاں لوگ اسے یا ابن صاحب الامر کر کے پکارتے تھے۔ پھر اس نے ہمیں خوش آمدید کہا پھر اس نے کہا میں طاہر بن محمد ...... بن علی بن ابی طالب ہوں پھر ہمیں مہمان کے طور پر ٹھہرنے کا حکم ہوا ہم آٹھ دن مہمان رہے۔ شہر کا کوئی ایسا آدمی نہیں جو

ثم امرنا باقامة الضيافة فبقينا على ذلك ثمانية ایام ولم یبق فی المدینه احد الا جاءنا ..... وبقینا فی تلک المدینه سنة کاملة فعلنا و تحققنا ان المدینة مسیرة شهرین وبعدها مدینة اسمها الرابقه سلطانها القاسم علی بن صاحب الامر مسیرة ملکها شهرین وهی تلک القاعدة وبعدها مدینة الصافیه سلطانها ابراهیم بن صاحب الامر وبعدها مدینة اخری اسمها ظلوم سلطانها عبد الرحمٰن بن صاحب الامر مسیرة شهران وبعدها مدینة اخری اسمها غناطیس سلطانها هاشم بن صاحب الامر وهی اعظم دخلا ومسیرة ملکها اربعة اشهر فیکون مسیرة هذه المدن الخمس المملکة مقدار سنة لا یوجد فی اهل تلک الخطط والضیاع غیر المومنین الشیعة القائل بالبراءة والولایة .... سلاطینهم اولاد امامهم یحکمون بالعدل وبه یأمرون ولیس علی وجه الارض مثلهم ولو جمع اهل الدنیا لکانوا اکثر عددا منهم علی اختلاف الادیان والمذاهب ولقد اقمنا عندهم سنة کاملة نترقب ورود صاحب الامر الیهم لانهم زعموا انها سنة

ہماری ملاقات کو نہ آیا ہو ہم اس شہر میں پورا ایک سال رہے ہم نے تحقیق کی شہر کی وسعت ۲ ماہ کی مسافت کے برابر ہے پھر دوسرے شہر میں گئے اس کا نام رابقہ ہے اس کا بادشاہ صاحب الامر کا دوسرا بیٹا قاسم تھا۔ اس کی وسعت بھی اتنی تھی۔ پھر ہم شہر صافیہ میں گئے اس کا بادشاہ صاحب الامر کا تیسرا بیٹا ابراہیم تھا پھر ہم شہر ظلوم میں گئے اس کا بادشاہ صاحب الامر کا چوتھا بیٹا عبد الرحمٰن تھا۔ پھر ہم غناطیس میں گئے اس کا بادشاہ صاحب الامر کا پانچواں بیٹا ہاشم تھا یہ سب سے زیادہ وسیع حکومت تھی اس کی وسعت ۴ ماہ کی مسافت کے برابر تھی ان پانچ حکومتوں کی وسعت ایک سال کی مسافت تھی ان ممالک میں شیعہ مؤمنین کے بغیر کوئی نہیں بستا تھا جو سب ولایت ائمہ کے قائل اور تبرا باز تھے۔ ان کے بادشاہ امام مہدی کے لڑکے تھے ایسے عدل و انصاف سے حکومت کرتے تھے کہ ان کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اگر تمام دنیا کے تمام مذاہب کے لوگ جمع کئے جائیں تو ان کے مقابلے میں شیعہ مومنین کی تعداد زیادہ تھی ہم وہاں سال بھر رہے۔ صاحب الامر کی آمد کے منتظر رہے لوگوں کا خیال تھا کہ اس سال امام آئے گا۔

ورودہ فلم یرافقنا اللہ انظر الیه .....

مگر اللہ نے ہمیں زیارت کا موقع نہ دیا۔

آخر میں محدث فرماتے ہیں کہ شیخ مفید کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وادی یمن میں ہے۔

فی الیمن وادیقال له شمروح او شمیریح ولعل هذا هو اسم المکان الذی یختص به علیه السلام۔

یمن میں ایک وادی ہے جس کا نام شمروح یا شمریح ہے شاید یہ نام اس جگہ کا ہے جو امام مہدی کے لیے مختص ہے۔

محدث صاحب کا بیان بڑا دلچسپ اور ایمان افروز ہے مگر چند سوال ذہن میں ابھرتے ہیں

(۱) یہ واقعہ ۵۴۲ھ کا ہے۔ یہ پتھر اور دھات کے زمانہ کی بات ہے نہ زمانہ قبل از تاریخ کی بلکہ خلفائے عباسیہ کے دور کی بات ہے اس عہد کی تاریخ مختلف قوموں نے مختلف زبانوں میں لکھی ہے۔

(۲) چھٹی صدی ہجری میں کرۂ ارض پر کسی ایسی سلطنت کا وجود نہیں پایا جاتا جس کی آبادی خالص شیعہ مومنین کی ہو۔

(۳) اس حکومت کی وسعت سال بھر کی مسافت کے برابر ہے۔ مسافت کا پیمانہ پیدل سفر ہی سمجھا جا سکتا ہے اس طرح ۳۶۰ منزل بنتی ہے ایک منزل ۱۸ میل کی ہوتی تھی اس طرح ۶۴۸۰ میل بنتے ہیں اگر یہ فاصلہ سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جائے تو دنیا کوئی ایسا ملک بلکہ اعظم بھی نہیں ملتا جس میں خالص شیعہ آباد ہوں۔ لطف یہ کہ یہ وادی ملک یمن میں ہے۔ یمن کا رقبہ دیکھئے پھر اس وادی کی وسعت دیکھئے اور اس وادی کو یمن میں رکھ کے دیکھئے۔

(۴) امام مہدی کے بیٹے تو مزے سے حکومت کر رہے ہیں اور خود امام ابھی تک غائب ہے۔ کسی کے ڈر سے یا کسی حکمت کے تحت۔ ڈر تو ہو نہیں سکتا کیونکہ امام کی جرأت اور شجاعت پر حرف آتا ہے اور حکمت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ

(ل) اگر ۳۱۳ خالص شیعہ ہوتے تو امام ظاہر ہو جاتا۔

(ب) اگر کم سے کم ۷، ایسے شیعہ دنیا میں موجود ہوتے تو امام ظاہر ہو جاتا۔ تو معلوم ہوا کہ امام کے پانچوں بیٹوں کی وسیع سلطنت میں جو سارے کے سارے خالص شیعہ مؤمنین بستے ہیں وہ کروڑوں سے کیا کم ہوں گے مگر ان میں ۷، انفر بھی خالص سچے شیعہ نہیں ہیں۔ بلکہ سب منافق ہیں اور صاحب الامر کے بیٹوں کے ساتھ کہیں وہی سلوک نہ کریں جو ان کے اجداد نے امام حسین کے ساتھ کیا تھا۔

(۵) اگر محدث الجزائری اس طویل سچی آپ بیتی کے بعد اتنا فرما دیتے کہ "پھر میری آنکھ کھل گئی" تو مطلق کوئی تعجب نہ ہوتا۔ ویسے تو یہ معمہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ امامت اور خاندان نبوت کی خانہ جنگیاں

امامت کے متعلق شیعہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ امامت کا منصب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ملتا ہے اور وہی امام مقرر کرتا ہے۔ مگر اس کے برعکس واقعات ایسے ملتے ہیں کہ اس مسئلہ پر بڑے بڑے اختلافات اور جھگڑے ہوتے رہے۔ چند ایک واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی کا اختلاف اصول کافی ص۱۵۰

هكذا احكم الله ليلة ينزل فيها امره ان حجدتها بعد ما سمعتها من رسول الله فادخلك النار كما اعمى بصرك يوم حجدتها على علي بن ابي طالب قال فذلك عمي بصري وقال وما علمك بذلك فوالله ان عمي بصره الا من صفقة جناح الملك قال فاستضحكت ثم تركته يوم ذلك

اسی طرح اللہ کا حکم اس رات میں نازل ہوتا ہے رسول خدا سے یہ بات سننے کے بعد بھی انکار کرو گے تو اللہ تمہیں جہنم میں داخل کرے گا جیسا اس نے تمہاری آنکھ پھوڑی جب تم نے علی بن ابی طالب کے سامنے انکار کیا تھا۔ ابن عباس نے کہا ہاں میری آنکھ اسی وجہ سے پھوٹی پھر امام نے فرمایا تمہیں کیا خبر بخدا ابن عباس کی آنکھ فرشتہ کے پر مارنے سے پھوٹی۔ امام کہتے ہیں کہ پھر مجھے

لسخافة عقله ثم لقيته فقلت يا ابن عباس ما تكلمت بصدق مثل الامس قال لك علي ابن ابي طالب ان ليلة القدر في كل سنة وانه ينزل في تلك الليلة امر السنة وان لذالك ولاة امر بعد رسول الله فقلت له من هم قال انا واحد عشر من صلبي ائمة محدثون فقلت لا اراها كانت الامع رسول الله فتبدى لك الملك الذي يحدثه فقال كذبت يا عبد الله رأت عيناي الذي حدثك به علي ولم تره عيناه ولكن وعاه قلبه ووقر في سمعه ثم صفقك بجناحه فعميت قال وقال يا ابن عباس ما اختلفنا في شيء فحكمه الى الله فهل حكم الله في حكمين حكمه بامرين قال لا فقلت ههنا هلكت واهلكت۔

ہنسی آگئی۔ پھر میں نے ابن عباس سے کلام کرنا ترک کر دیا۔ کیونکہ وہ ایک احمق شخص تھا پھر اس سے میری ملاقات ہوئی میں نے کہا ابن عباس! تم نے ایسی سچی بات کبھی نہیں کی جیسے کل کی تم سے علی نے کہا تھا کہ ہر سال لیلۃ القدر میں سال بھر کے احکام نازل ہوتے ہیں یہ منصب حضورؐ کے بعد اہل بیت کو حاصل ہے تم نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں علی نے فرمایا وہ میں ہوں اور میری اولاد سے گیارہ ائمہ۔ تم نے کہا ایسا نہیں بلکہ میں تو یہ بات نبی کریمؐ سے مختص سمجھتا ہوں پھر فوراً وہ فرشتہ ظاہر ہوا جو علی سے باتیں کر رہا تھا اس نے کہا ابن عباس تو جھوٹا ہے میری آنکھوں نے وہ دیکھا جو علی نے کہا۔ اور فرشتہ کی آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ اس کے دل نے یاد کر لیا جو سنا۔ پھر اس نے اپنا پر مارا اور تم اندھے ہو گئے۔ علی نے کہا جس بات میں ہمارا اختلاف ہو جائے فیصلہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے تم نے انکار کے رنگ میں کہا کیا ایک امر میں اللہ کے فیصلے متضاد بھی ہوتے ہیں علی نے کہا نہیں امام فرماتے ہیں اس وقت میں نے کہا ابن عباس تو خود بھی ہلاک ہوا دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

صافی شرح کافی میں ہلکت واہلکت کا ترجمہ "جہنمی شدی وجہنمی کردی" لکھا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ :-

(۱) حضرت علی فرماتے ہیں کہ بارہ امام رسول کریمؐ کی مانند ہیں۔

(۲) اماموں پر شب قدر میں ہر سال اللہ کی طرف سے نئے احکام نازل ہوتے ہیں جیسے حضورؐ پر نازل ہوتے تھے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس کا ان دونوں امور میں اختلاف تھا۔ وہ اسے حضورؐ سے مختص سمجھتے تھے۔ اور حضرت علی کے بیان کردہ عقیدہ سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ

(ا) نبوت ختم نہیں ہوئی یعنی ختم نبوت کا عقیدہ غلط ہے۔

(ب) اسلام دین کامل نہیں اور حضورؐ اسے ادھورا چھوڑ گئے یہ کمی اماموں پر نزول احکام کے ذریعے پوری ہوتی رہتی ہے۔

(ج) قرآن مکمل اور آخری کتاب نہیں بلکہ نزول وحی کا سلسلہ بارہ اماموں تک جاری رہے گا۔

(د) کتاب اللہ اور سنت رسول نجات اور ہدایت کیلئے کافی نہیں۔ اور ابن عباس یہ باتیں ماننے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انھیں سزا یہ ملی کہ فرشتہ کے پر مارنے سے نابینا ہوگئے اور آخرت میں جہنم کی بشارت سنائی گئی۔

معلوم ہوا کہ امامت کے مسئلہ میں پہلے امام سے ان کے چچازاد بھائی نے اختلاف کیا وہ بھائی جس نے رسول کریمؐ سے قرآن سنا سیکھا اور سمجھا اور حضورؐ سے ہی دین سیکھا اور اپنایا جسے اسلامی دنیا ترجمان قرآن اور حبر الامۃ کہتی ہے۔ امامت کے متعلق ان کا عقیدہ وہی تھا جو اسلام سکھاتا ہے البتہ دین شیعہ کے مطابق نہیں اس لیے بقول شیعہ امامت کے مسئلہ میں اختلاف روز اول سے اور گھر سے ہی شروع ہوگیا۔

جب عباسیوں کا دورِ حکومت آیا تو اس ڈر سے کہ خلفائے عباسی اپنے اسلاف کی توہین برداشت نہ کرتے ہوئے کہیں شیعہ کے خلاف انتقامی کارروائی شروع نہ کر دیں، شیعہ نے ابن عباس کی تعریف میں روایات گھڑنا شروع کر دیں۔ اور شیعہ مجتہد مولوی محمد نے

فیصلہ دیا کہ جن روایات میں ابن عباس کی توہین پائی جاتی ہے وہ شیعہ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں (دیکھئے ان کی کتاب تشیید المبانی) اور اپنے فیصلے کو مضبوط بنانے کے لیے فرمایا کہ اگر یہ روایات صحیح ہوتیں تو علمائے شیعہ امام معصوم کے فرزند عبداللہ فلح کی طرح ابن عباس کو بھی برا سمجھتے مگر روایات کے صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ یوں نہیں ہوتا بلکہ فن رجال سے ہوتا ہے اگر یہ روایات عند الشیعہ صحیح نہیں ہیں تو کتب رجال میں ان کے رواۃ پر جرح موجود ہوتی مگر ایسا نہیں پایا جاتا اس لیے یہ برات محض عباسیوں سے ڈر کر تقیہ کرنے کی ایک آسان صورت ہے۔

اگر عباسیوں کی طرح خلفائے ثلثہ کے خاندانوں میں حکومت اور اقتدار آجاتا تو خلفائے ثلثہ کی توہین کے متعلق روایات کو بھی شیعہ موضوع قرار دے دیتے اور ان کی مدح میں روایات گھڑلی جاتیں۔ مگر وہ مدح جو موضوع روایات کے ذریعے کی جائے اور وہ مدح جو خود خدا اپنی کتاب میں کرے بھلا کب ایک جیسی ہوسکتی ہے ممدوحین قرآن جھوٹے مداحوں سے بے نیاز ہیں۔

شیعہ کے نزدیک مدعی امامت بھی کافر ہے اور منکر امامت بھی اس لئے ابن عباس امامت کا انکار کر کے شیعہ کے نزدیک کافر ہوگئے اور جہنمی قرار پائے۔ چنانچہ رجال کشی ص۱۲ پر ابن عباس کو بھیڑیا کہا گیا ہے۔

۲۔ امام حسین کی شہادت کے بعد امامت پر اختلاف کا دوسرا واقعہ پیش آیا۔

محمد بن الحنفیہ نے امامت کا دعویٰ کیا۔ کہ حضرت علیؓ کے بیٹے اور زین العابدین کے چچا تھے۔ انہوں نے زین العابدین کی امامت کا انکار کیا آخر یہ مقدمہ حجر اسود کے سامنے پیش کیا گیا۔ احتجاج طبرسی ص۱۶۲ اور اصول کافی۔

فاردت ان تعلم فانطلق بنا الى الحجر الاسود حتى نتحاكم اليه وتسأله من ذلك قال الباقر وكان الكلام بينهما وهما بمكة فانطلقا حتى اتيا الحجر الاسود فقال علی

اگر تو حقیقت جاننا چاہتا ہے تو آ حجر اسود کے پاس چلیں اس کو حکم بنائیں امام باقر کہتے ہیں کہ ان میں یہ گفتگو مکہ میں ہوئی دونوں حجر اسود کے پاس آئے۔ امام زین العابدین

بن الحسین لمحمد بن الحنفیہ ابتدأ و ابتهل الی اللہ واسأله ان ینطق لك ثم سئلہ فابتهل محمد فی الدعاء وسئل اللہ ثم دعا الحجر فلم یجبه فقال علی بن الحسین اما انك یاعم لو کنت وصیا و اماما لاجابك فقال له محمد فادع انت یا ابن اخی فدعا اللہ علی بن الحسین بما اراد ثم قال اسئلك بالذی جعل فیك میثاق الانبیاء و میثاق الاوصیاء و میثاق الناس اجمعین لما اخبرتنا بلسان عربی مبین من الوصی والامام بعد الحسین بن علی ابن ابی طالب فتحرك الحجر حتی کاد ان یزول عن موضعه ثم انطقه اللہ بلسان عربی مبین فقال اللهم ان الوصیة والامامة بعد الحسین بن علی وابن فاطمه بنت رسول اللہ فانصرف محمد و هو یتولی علی بن الحسین۔

نے کہا چچا آپ ابتدا کریں گڑگڑا کر اللہ سے دعا کریں۔ اس پتھر کو اللہ گویائی عطا فرمائے پھر اس سے پوچھو چچا نے ایسا ہی کیا مگر پتھر نے کوئی جواب نہ دیا بھتیجے نے کہا چچا! اگر آپ امام اور وصی ہوتے تو حجر اسود آپ کو لازماً جواب دیتا۔ چچا نے کہا اب تم دعا کرو زین العابدین نے دعا مانگی اور کہا اے حجر اسود میں تجھے اس ذات کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس نے تیرے اندر انبیاء اوصیاء اور تمام انسانوں کا عہد رکھا ہے عربی زبان میں صاف بتا دے کہ امام حسین کے بعد وصی اور امام کون ہے حجر اسود میں جنبش آئی قریب تھا کہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ پھر اللہ نے اسے گویائی دی اور کہا اے اللہ حسین کے بعد امامت اور وصیت علی بن حسین اور فاطمہ بنت رسول اللہ کے بیٹے کے لیے ہے یہ سن کر محمد بن الحنفیہ واپس ہوئے اور وہ امام زین العابدین کے دوست بن گئے۔

خلاصہ ہ۔ (۱) محمد بن الحنفیہ نے اپنے بھتیجے امام زین العابدین کے مقابلہ میں امامت کا دعویٰ کیا اور مدعی امامت شیعہ کے نزدیک کافر ہے۔

۲ - امام زین العابدین کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول سے کوئی دلیل نہیں تھی اس لیے حجر اسود کو حکم بنایا اگر امامت کے لیے کوئی نص ہوتی تو پیش کرتے۔ معلوم ہوا کہ

امامت کے منصوص ہونے کی شکل بعد کی تیار کردہ ہے۔

۳ - امامت جیسے عظیم منصب کے لیے دلیل شرعی ہونا ضروری ہے جو کتاب اللہ یا سنت رسولؐ سے ہو پتھر خواہ کتنا مقدس کیوں نہ ہو اس کا فیصلہ دلیل شرعی نہیں بن سکتا۔

۴ - بارہ لفافوں والا معاملہ بھی گڑبڑ نظر آتا ہے۔ ورنہ چپکے سے چچا کے کان میں کہہ دیتے کر دیکھو یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنے سے اللہ کا انکار لازم آتا ہے۔

۵ - حضرت علی نے اپنے بیٹے کو لفافوں کی بات نہ بتائی۔ ورنہ دعویٰ نہ کرتے اور بقول شیعہ کافر بھی نہ ہوتے چنانچہ جلاء العیون ص۲۴۲ پر محمد بن الحنفیہ کو کافر غیر ناجی لکھا ہے۔

۶ - محمد بن الحنفیہ، دوست تو بن گئے مگر یہ ذکر نہیں کہ ان کی امامت پر ایمان بھی لائے۔

(۳) امامت کے مسئلہ میں امام حسن کی اولاد اور امام حسین کی اولاد میں مستقل عداوت قائم ہو گئی چنانچہ شیعہ کے ائمہ معصومین نے اس دشمنی کا اظہار بڑے زہریلے الفاظ میں کیا ہے۔

احتجاج طبرسی ص۱۹۲

لیس منا احد الا وله عدو من اهل بیته فقیل له بنوا الحسن لا یعرفون الحق؟ قال بلی ولکن یحملهم الحسد بمتحهم۔

امام جعفر فرماتے ہیں ہم میں سے کوئی ایسا شخص نہیں کہ اس کے گھر والوں میں سے ہی کوئی ان کا دشمن نہ ہو ان سے پوچھا گیا کیا امام حسن کی اولاد نہیں جانتی کہ حق کس کا ہے فرمایا ہاں وہ جانتے ہیں مگر حسد مانع ہے۔

احتجاج طبرسی ص۱۹۵ امام جعفر فرماتے ہیں۔

ولو توفی حسن بن الحسن علی الزنا والربوا وشرب الخمر لکان خیرا مما توفی علیه۔

اگر حسن بن الحسن زناکار، سود خوار، شرابخور ہو کر مرتا تو اس حالت سے بہتر تھا جس پر مرا۔

معلوم ہوا کہ امامت کے مسئلہ نے اہل بیت کے درمیان مستقل عداوت کا بیج بو دیا۔ امام حسن کی اولاد مسئلہ امامت کے متعلق جو خیالات لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئی اس سے بہتر تھا کہ وہ زانی ہوتے، سود خوار ہوتے یا شرابی ہوتے۔ واقعی دوسری صورت میں صرف

گناہ ہوتا کفر تو لازم نہ آتا۔

اہل بیت کی دشمنی میں نہ لفافے رکاوٹ بن سکے نہ نص کام آئی۔

۴۔ امام باقر کے زمانہ میں زید بن علی کے بیٹے نے امامت کا دعویٰ کیا اور اپنے بھائی امام باقر اور اپنے بھتیجے کی امامت کا انکار کر دیا بلکہ اعلان جہاد کر دیا۔ اصول کافی کی ایک طویل روایت کا آخری حصہ لیا جاتا ہے۔ جو زید بن علی زین العابدین نے راوی احول کو سنایا۔

قال فقال لی یا ابا جعفر کنت اجلس مع ابی علی الخوان فیلقمنی البضعة السمینة ویبرد لی اللقمة الحارة حتی تبرد شفقة علی ولم یشفق علی من حر النار اذا اخبرك بالدین ولم یخبرنی۔

احول کہتا ہے پھر زید نے مجھ سے کہا اے احول! میں اپنے والد زین العابدین کے پاس دسترخوان پہ بیٹھتا تھا وہ مرغن بوٹی کے لقمے میرے منہ میں ڈالتے اور گرم لقمہ ٹھنڈا کرتے یہ مجھ پر شفقت تھی مگر انہوں نے مجھے دوزخ کی گرمی سے بچانے کی فکر نہ کی کہ دین (امامت) کی خبر تجھے دی اور مجھے نہ دی۔

احول نے جواب دیا مگر لاجواب

فقلت جعلت فداك من شفقته علیك من حر النار لم یخبرك خاف علیك لا تقبله فتدخل النار واخبرنی فان قبلت نجوت وان لم اقبل لم یبال ان ادخل النار۔

میں نے کہا قربان جاؤں صرف آپ کو دوزخ سے بچانے کے لیے اس امر کی اطلاع نہیں دی انہیں اندیشہ تھا کہ آپ نے انکار کیا تو جہنم ہے اور مجھے یہ مسئلہ بتا دیا اگر قبول کروں تو نجات پاؤں اگر انکار کروں تو میرے جہنم جانے سے ان کا کیا بگڑتا۔

اس روایت سے ائمہ کا یہ دستور یا اصول معلوم ہوا کہ اپنے محبوبوں کو امامت کا راز نہیں بتاتے تھے البتہ دشمنوں کو جو ان کے نزدیک مبغوض ہوتے انہیں بتا دیتے تاکہ اپنے محبوب انکار کر کے دوزخی نہ بن جائیں دشمن ایسا کریں تو انہیں جہنم کی سزا مناسب ہے۔

۲۔ ائمہ نے جسے امامت کا راز نہیں بتایا وہ انکار کر دے تو کوئی حرج نہیں۔

۳۔ ائمہ نے سنیوں کو امامت کا راز نہیں بتایا معلوم ہوا کہ وہ ائمہ کے محبوب ہیں۔

۴۔ ائمہ نے شیعوں کو امامت کا راز خفیہ طور پر بتا دیا کیونکہ وہ ائمہ کے دشمن ہیں۔

(۵) امام جعفر کی وفات کے بعد پھر امامت کا جھگڑا پیدا ہو گیا۔

(۱) امام جعفر کے پانچ بیٹے تھے۔ اسماعیل، موسیٰ کاظم، عبداللہ، علی اور محمد (جلاء العیون ص۶۱۲)

(۲) حسب قواعد امام جعفر کے بڑے بیٹے اسماعیل کی امامت کا خدا کی طرف سے اعلان ہو گیا لازماً ان کے نام کا لفافہ بھی ہو گا۔ مگر وہ اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے یعنی خدا نے بھول کر ان کی امامت کا اعلان کر دیا تھا۔ یعنی خدا کو بدا ہو گیا تھا۔

(۳) امام جعفر نے اپنے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظم کی امامت کا اعلان کر دیا۔

(۴) امام جعفر نے اپنی بیوی حمیدہ مادر موسیٰ کاظم کو بھی امام بنا دیا۔ یعنی امامت کیلئے عورت بھی موزوں ہو سکتی ہے۔ حالانکہ امامت مثل نبوت ہے اور نبوت کے لیے عورت کو کبھی منتخب نہیں کیا گیا۔

(۵) شیعوں کی ایک جماعت اسی وجہ سے اسماعیل کی امامت پر سلسلہ امامت کو ختم کر کے اثنا عشریہ سے علیحدہ ہو گئی۔

(۶) چھٹا واقعہ:۔

امام حسین کے نواسے اور امام حسن کے پوتے عبداللہ محض تھے۔ محض اس لیے کہ انکی والدہ حسینی تھی اور والد حسنی۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمد نفس زکیہ کو امام بنانا چاہا یہ بڑے متقی اور عالم تھے انہوں نے کئی بار امام جعفر سے کہا کہ میرے بیٹے نفس زکیہ کی بیعت کر لو۔ مگر امام جعفر نے نہ مانا۔ انہوں نے غصہ میں آ کر کہا کہ امام حسن نے اپنے چھوٹے بھائی امام حسین کو امامت دی تھی۔ امام حسین کو کیا حق تھا کہ امامت اپنی اولاد کو دے جاتے اس امر میں اولاد حسن بلکہ قریش عبداللہ محض کے ساتھ متفق تھے (اصول کافی ص۲۲۶)

ان چھ واقعات سے معلوم ہوا کہ:۔

۱۔ امام مقرر کرانے کے لیے مختلف اوقات میں اہل بیت کے مختلف افراد کی طرف سے کوششیں ہوتی رہیں۔

۲ - ان کوششوں میں معاملہ اختلاف رائے سے گزر کر جھگڑے تک پہنچتا رہا۔

۳ - آسمانی منزل من اللہ لفافوں والی بات اگر فرضی نہ ہوتی تو کسی ایک موقع پر سہی لفافوں کا حوالہ دے کر بات ختم کی جا سکتی تھی۔

۴ - لوگ اپنے اختیار سے اپنی پسند کے مطابق امام مقرر کرتے رہے اس لیے امام کا تقرر خدا کی طرف سے ہونا محض ڈراوا ہے۔

۵ - امامت کے مسئلہ پر اغیار تو کیا اہل بیت میں بہت کم اتفاق رائے ہوا ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ نہ ضروریات دین سے ہے نہ منصوص ہے۔

۶ - کسی اختلاف کے موقع پر فیصلہ کے لیے کوئی نص پیش نہیں کی گئی۔

۷ - باغ فدک کے سلسلے میں صدیق اکبر نے حضورؐ کی حدیث پیش کی تو حضرت فاطمہ مطمئن ہوگئیں اور اس سلسلے میں پھر کبھی بات نہیں اٹھائی مگر شیعہ اب تک مطمئن نہیں کہتے ہیں کہ اگر حدیث ہوتی تو فاطمہ سے کیونکر پوشیدہ رہتی یعنی گیارہ درختوں والی حدیث اہل بیت سے پوشیدہ رہنا ممکن نہیں تو امامت کے بارے میں کوئی نص ہوتی تو ائمہ سے کیونکر پوشیدہ رہتی اور وہ کیوں نہ پیش کرتے۔ معلوم ہوا لفافوں والی بات اور نص کا دعویٰ دونوں بے بنیاد ہیں۔

امام مظلوم

حضرت امام حسین نے وطن سے دور جس بے نوائی کی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی اور جس عظیم قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کنبہ کو شہید کرایا اس کی مثال تاریخ انسانی میں ڈھونڈے نہیں ملے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے اس عظیم فرزند پر یہ مصائب کس جانب سے آئے کون سے ہاتھ ان کے لیے آگے بڑھے اور کیوں۔

اس واقعہ کے عینی شاہد یا تو قاتل ہیں یا مقتولین کے گروہ میں سے جو بچ گئے۔ اس لیے سادہ طریق تحقیق تو یہ ہے کہ بچے کھچے مظلومین سے پوچھا جائے کہ تمہارا قاتل کون ہے اور قاتل گروہ سے پوچھا جائے کہ تمہارا جواب دعویٰ کیا ہے۔ اگر مدعی کے

بیان کے بعد ملزم اپنے جرم کا اقرار کر لے تو کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اقرار جرم کے بعد ملزم، ملزم نہیں رہتا بلکہ مجرم قرار پاتا ہے۔

موضوع :- قاتلین حسین کون تھے؟ شیعہ یا غیر شیعہ۔

جواب کے لیے مقدمات :-

(۱) مدعی کون ہے؟

(۲) مدعا علیہ کون ہے یعنی مدعی کا دعویٰ کس کے خلاف ہے۔

(۳) گواہ کون ہیں۔

(۴) کیا وہ عینی شاہد ہیں یا ان کی شہادت سماعی ہے۔

(۵) اگر یہ شہادت مدعی کے بیان کے موافق ہے تو دعویٰ ثابت اگر خلاف ہے تو مردود ان امور کی روشنی میں واقعہ کا جائزہ لینا چاہیے۔

مقدمہ اوّل :- مدعی امام حسین، آپ کے اہل بیت اور آپ کے ہمراہی ہیں ان پر ظلم ہوا۔ یہ خیال رہے کہ شیعہ کے نزدیک امام معصوم ہوتا ہے یعنی گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہوتا ہے اور مفترض الطاعۃ ہے۔

مقدمہ دوم :- مدعا علیہ وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے امام کو بلایا اور ظلم سے قتل کیا۔

مقدمہ سوم :- قاعدہ کی رو سے گواہ، مدعی اور مدعا علیہ سے جدا کوئی اور ہونا چاہیے۔

مقدمہ چہارم :- کوئی عینی شاہد نہیں جو چشم دید واقعہ بیان کر سکے کیونکہ کربلا چٹیل میدان تھا اس کے گرد کوئی آبادی نہ تھی اس لیے جو گواہ پیش ہوگا اس کی شہادت سماعی ہوگی۔

مقدمہ پنجم :- چونکہ شہادت سماعی ہے اس لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ گواہ نے یہ واقعہ قاتلین کی زبانی سنا یا مقتولین کی زبان سے جو صورت بھی ہو یہ دیکھنا ہوگا کہ شہادت مدعی کے دعویٰ کے مطابق ہے تو قبول ورنہ مردود۔ اگر شہادت مدعی کے بیان کے خلاف ہے تو لازم آئے گا کہ گواہ نے مدعی کو جھوٹا قرار دیا اور امام معصوم کو جھوٹا قرار دینے والے کی شہادت کیونکر قبول ہو سکتی ہے لہٰذا کوئی ایسی روایت یا خبر خواہ کسی راوی کی اور خواہ کسی کتاب سے لی گئی ہو تو لازماً مردود ہوگی۔

اس تحقیق کے بعد جو مجرم ثابت ہو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اسے مجرم سمجھے ورنہ وہ اس آیت کا مصداق ہوگا ومن یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بہتانا و اثما مبینا

دعویٰ کی تفصیل :- ۱- بیانات مدعیان

۱- بیان مدعی ۱ حضرت امام حسین نے میدان کربلا میں دشمن کی فوج کو مخاطب کرکے فرمایا

ویلکم یا اهل الکوفة انسیتم کتبکم وعهودکم التی اعطیتموها واشهدتم الله علیها ویلکم ادعوتم اهل بیت نبیکم وزعمتم انکم تقتلون انفسکم دونهم حتی اذا اتوکم سلمتموهم الی ابن زیاد ومنعتموهم عن ماء الفرات بئس ما خلفتم نبیکم فی ذریته مالکم لا سقاکم الله یوم القیامة -	اے اہل کوفہ! حیف ہے تم پر۔ کیا تم اپنے خطوط اور وعدوں کو بھول گئے ہو جو تم نے خدا تعالیٰ کو اپنے اور ہمارے درمیان دیکر لکھے تھے کہ اہل بیت آئیں ہم ان کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں گے حیف ہے تم پر تمہارے بلاوے پر ہم آئے اور تم نے ہمیں ابن زیاد کے حوالے کردیا اور ہمارے لیے فرات کا پانی بند کردیا واقعی تم لوگ رسولؐ کے بڑے خلاف ہو کہ حضورؐ کی اولاد کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اللہ تمہیں قیامت کے دن سیراب نہ کرے۔

(ذبح عظیم بحوالہ ناسخ التواریخ صفحہ ۳۳۵)

امام کے بیان سے دو باتیں ثابت ہوئیں

۱۔ اہل کوفہ نے امام کو خطوط لکھ کر کوفہ بلایا اور عہد دیا کہ امام کی مدد کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہوں گے۔

۲۔ جنہوں نے خطوط لکھ کر کوفہ بلایا انہوں نے امام پر پانی بند کیا اور امام کو قتل کے لیے ابن زیاد کے حوالے کیا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ بلانے والے شیعہ تھے یا کوئی اور گروہ تھا۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین صفحہ ۲۵ مجلس اول میں تصریح کردی۔

تشیع اہل کوفہ حاجت باقامت دلیل ندارد و سنی بودن کوفی الاصل خلاف اصل محتاج دلیل است اگرچہ ابو حنیفہ کوفی است۔	اہل کوفہ کے شیعہ ہونے کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں کوفیوں کا سنی ہونا خلاف اصل ہے جو محتاج دلیل ہے اگرچہ ابو حنیفہ کوفی تھے۔

شیعہ عالم شوستری کی شہادت کے مطابق اہل کوفہ کا شیعہ ہونا اظہر من الشمس ہے۔

پھر بھی مزید دو شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

(ا) جب مقام زبالہ پر امام حسین کو امام مسلم کی شہادت کی خبر ملی تو امام نے فرمایا

قد خذلنا شیعتنا یعنی ہمارے شیعہ نے ہمیں ذلیل کیا ہے (خلاصۃ المصائب صفحہ ۴۹)

(ب) جلاء العیون اردو۔ امام نے معرکہ کربلا میں شیعہ کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

"تم پر اور تمہارے ارادہ پر لعنت ہو۔ اے بیوفایان جفا کار! تم نے ہنگامۂ اضطراب واضطرار میں ہمیں اپنی مدد کے لیے بلایا۔ جب میں نے تمہارا کہنا مانا اور تمہاری نصرت اور ہدایت کرنے کو آیا اس وقت تم نے شمشیر کینہ مجھ پر کھینچی۔ اپنے دشمنوں کی تم نے یاری اور مددگاری کی اور اپنے دوستوں سے دستبردار ہوئے"

ان بیانات سے ثابت ہوگیا کہ امام کو شیعوں نے بلایا۔ انہوں نے پانی بند کیا اور انہوں نے ہی قتل کے لیے ابن زیاد کے حوالے کیا۔

جلاء العیون میں امام کے بیان کے دوران "شمشیر کینہ" کا لفظ قابل توجہ ہے یعنی کوفی شیعہ کے دلوں میں کوئی پرانا بغض تھا اس لیے انتقام لینے کی غرض سے یہ ناٹک کھیلا تاریخی اعتبار سے اس دیرینہ عداوت کی وجہ اس کے بغیر کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام کے شیدائیوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں نے اہل کوفہ سے اپنا آبائی مذہب چھڑا کر اسلام کی دولت عطا کی اور صدیوں کی پرانی سلطنت عرب مسلمانوں کے زیر نگیں آگئی۔ آخر قومی اور مذہبی تعصب بروئے کار آکے رہا۔

نتیجہ :- مدعی ۱ کے بیان کے مطابق امامؑ کے قاتل اہل کوفہ شیعہ تھے کوئی اور نہیں تھا۔

بیان مدعی ۲ امام زین العابدین

یا ایھا الناس ناشدتکم باللہ ھل تعلمون انکم	اے لوگو! میں تمہیں خدا کی قسم دلاتا ہوں

کتبتم الی ابی وخدعتموہ واعطیتموہ من انفسکم العھد والمیثاق والبیعۃ وقاتلتموہ وخذلتموہ فتبًا لکم ما قدمتم لانفسکم وسوءۃ لرایکم بایۃ عین تنظرون الی رسول اللہ اذ یقول لکم قتلتم عترتی وانتھکتم حرمتی فلستم من امتی قال فارتفعت الاصوات الناس بالبکاء ویدعوا بعضھم بعضا ھلکتم وما تعلمون۔

احتجاج طبرسی طبع ایران ص۱۵۹

کیا تمہیں علم نہیں کہ تم نے میرے والد کو خطوط لکھے اور انہیں دھوکا دیا تم نے پختہ وعدہ اور بیعت کا عہد دیا اور تم نے انہیں قتل کیا ذلیل کیا۔ خرابی ہو تمہارے لیے جو کچھ تم نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے اور خرابی ہو تمہاری بُری رائے کی تم کس آنکھ سے رسول کریمؐ کو دیکھو گے جب وہ فرمائیں گے تم نے میری اولاد کو قتل کیا میری بے حرمتی کی تم میری اُمت سے نہیں ہو پس رونے کی آواز بلند ہوئی اور ایک دوسرے کو بددعا دینے لگے کہ تم ہلاک ہو گئے جس کا تمہیں علم ہے۔

اس بیان سے ثابت ہے کہ بلانے والوں سے مخاطب ہیں اور وہی قاتل ہیں۔ ردِ عمل میں ان کا اعتراف بھی موجود ہے۔

بیان دیگر :۔

لما اتی علی بن الحسین زین العابدین بالنسوۃ من کربلا وکان مریضًا واذا نساء اھل الکوفۃ ینتدبن مشققات الجیوب والرجال معھن یبکون فقال زین العابدین بصوت ضئیل قد نھکتم العلۃ ان ھؤلاء یبکون ومن قتلنا غیرھم۔

(احتجاج طبرسی ص۱۵۶)

جب زین العابدین مرض کی حالت میں عورتوں کے ساتھ کربلا سے آ رہے تھے تو اہل کوفہ کی عورتیں گریبان چاک کئے بین کرنے لگیں اور مرد بھی رو رہے تھے۔ پس زین العابدین نے پست آواز میں فرمایا کیونکہ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے کوفہ والے روتے ہیں مگر یہ تو بتاؤ ہمیں قتل کس نے کیا؟

ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون ص۵۰۳ پر امام کا بیان انہی الفاظ میں نقل کیا ہے

”امام زین العابدین نے بآواز ضعیف فرمایا کہ تم ہم پر گریہ اور نوحہ کرتے ہو لیکن یہ تو بتاؤ ہمیں قتل کس نے کیا ہے؟“

امام کے اس سوال اور اس لہجے کے اندر اس کا جواب پوشیدہ ہے۔

مدعی ۲ کے بیان سے یہ نتیجہ نکلا کہ :۔

(۱) اہل کوفہ نے خط لکھے (۲) اہل کوفہ نے امام کو دھوکا دیا (۳) اہل کوفہ نے امام کو قتل کیا۔ (۴) اہل کوفہ شیعہ تھے (۵) قاتلین حسین کو نبی شیعہ امت رسولؐ سے خارج ہیں۔ (۶) قاتلین حسین روئے اور ان کی عورتوں نے گریبان چاک کئے اور بین کئے بلکہ مستقل سنت قائم کر گئے۔

یہ خیال رہے کہ دونوں مدعی معصوم ہیں اس لیے اپنے دعویٰ میں صادق ہیں۔

بیان مدعی ۳ زینب بنت علیؓ ہمشیرہ امام حسین

جب اسیران کربلا سے آئے کوفہ میں داخل ہوئے تو کوفہ کے مردوں اور عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا تو حضرت زینب نے فرمایا

ثم قالت بعد حمد اللہ والصلوٰۃ علی رسولہ اما بعد یا اھل الکوفۃ یا اھل الختل والغدر والخذل الی ان قالت الا بئس ما قدمت لکم انفسکم ان سخط اللہ علیکم وفی العذاب انتم خالدون تبکون ای اجل واللہ فابکوا فانکم احری بالبکاء فابکوا کثیرا واضحکوا قلیلا ......

ماذا تقولون ان قال النبی لکم ماذا فعلتم وانتم آخر الامم باھل بیتی واولادی بعد مفتقد منھم اساری ومنھم ضرجوا بدم

حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا اے اہل کوفہ! اے ظالمو! اے غدارو! اے رسوا کرنے والو..... بہت بُرا ہے جو تم نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے یہ کہ اللہ تم پر ناراض ہوا اور تم ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہو۔ تم روتے ہو! ہاں روتے رہو کیونکہ تمہیں رونا ہی زیب دیتا ہے خوب روؤ اور کم ہنسو ..... کل نبی کریمؐ کو کیا جواب دو گے جب آپ پوچھیں گے تم آخری امت ہو تم نے میرے بعد میرے اہل بیت اور میری اولاد سے کیا سلوک کیا ان میں سے بعض کو قیدی بنایا بعض کو خاک و خون میں لوٹایا۔

اس خطبہ کا ترجمہ باقر مجلسی نے جلاء العیون ص۵۰۳ پر یہ دیا ہے۔

"اما بعد اے اہل کوفہ! اے اہل غدر و مکر و حیلہ! اتم ہم پر گریہ اور نالہ کرتے ہو اور تو دتم نے ہمیں قتل کیا ہے ابھی تمہارے ظلم سے ہمارا رونا بند نہیں ہوا اور تمہارے ستم سے ہماری فریاد و نالہ ساکن نہیں ہوا۔۔۔۔ تم نے اپنے لیے آخرت میں توشہ و ذخیرہ بہت خراب بھیجا ہے اور اپنے آپ کو ابد الآباد جہنم کا سزاوار بنایا ہے تم ہم پر گریہ و نالہ کرتے ہو حالانکہ تم خود ہی نے ہم کو قتل کیا ہے۔۔۔۔ تمہارے یہ ہاتھ قطع کئے جائیں اے اہل کوفہ! تم پر وائے ہو تم نے جگر گوشۂ رسول کو قتل کیا اور پردہ دار اہل بیت کو بے پردہ کیا کس قدر فرزندان رسول کی تم نے خونریزی کی اور حرمت کو ضائع کیا۔"

نتیجہ:- (۱) اہل کوفہ نے مکر و حیلہ سے امام کو بلایا۔

(۲) امام سے غداری کی اور اہل بیت کو قتل کیا۔

(۳) یہ سب کچھ کر لینے کے بعد رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

(۴) ان کو ابدی جہنم کی خوشخبری سنائی گئی۔

(۵) قاتل وہی تھے جو بلانے والے تھے۔ شیعہ تھے۔ تو اس جرم کے مرتکب اور ابدی جہنم کے مستحق وہی شیعہ ٹھیرے۔

بیان مدعی ۴ حضرت فاطمہ دختر امام حسین

احتجاج طبرسی ص ۱۵۷

اما بعد یا اهل الکوفة یا اهل المکر والغدر والخیلاء ...... فکذبتمونا وکفرتمونا ورأیتم قتالنا حلالا واموالنا نهبا کانا اولادا لترك او کابل کما قتلتم جدنا بالامس وسیوفکم یقطر من دمائنا اهل البیت لحقد متقدم قرت بذلك عیونکم وفرحت قلوبکم اجتراء منکم علی الله ومکرتم والله خیر الماکرین۔

اما بعد اے اہل کوفہ! اے اہل مکر و فریب ..... تم نے ہمیں جھٹلایا اور ہمیں کافر سمجھا ہمارے قتل کو حلال اور ہمارے مال کو غنیمت جانا جیسا کہ ہم ترک و کابل کی نسل سے تھے۔ جیسا کہ تم نے کل ہمارے جد (علی) کو قتل کیا تھا تمہاری تلواروں سے ہمارا خون ٹپک رہا ہے سابقہ کینہ کی وجہ سے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں دل

خوش ہوئے تم نے خدا کے مقابلے میں جرأت کی اور مکر کیا اور اللہ اس مکر کی خوب سزا دینے والا ہے۔

دختر امام مظلوم کے بیان کا نتیجہ:-

(۱) کوفہ کے شیعوں نے اہل بیت کو کافر سمجھا اور ان کا خون حلال سمجھا۔

(۲) شیعوں کو اہل بیت سے کوئی پرانی دشمنی تھی۔

(۳) حضرت علیؓ کے قاتل شیعہ ہیں۔

(۴) اہل بیت کو قتل کر کے یہ لوگ خوش ہوئے۔

وہ رونا پیٹنا محض ایکٹنگ تھی۔

بیان مدعی ۵ ام کلثوم ہمشیرہ امام حسین

جب کوفی عورتوں نے اہل بیت کے بچوں کو صدقہ کی کھجوریں دینا شروع کیا تو مائی صاحبہ نے فرمایا صدقہ ہم پر حرام ہے یہ سن کر کوفی عورتیں رونے پیٹنے لگیں اس پر مائی صاحبہ نے فرمایا

"اے اہل کوفہ ہم پر تصدق حرام ہے۔۔۔۔ اے زنان کوفہ تمہارے مردوں نے ہمارے مردوں کو قتل کیا ہم اہل بیت کو اسیر کیا ہے پھر تم کیوں روتی ہو"

(جلاء العیون ص ۵)

نتیجہ ظاہر ہے۔

ان پانچ مدعیان کے بیانوں میں قدر مشترک یہ ہے

(۱) اہل کوفہ نے امام حسین کو دعوت دی۔ خطوط لکھے۔

(۲) دعوت دینے والے شیعہ تھے۔

(۳) ان بلانے والے شیعہ نے امام کو قتل کیا۔ اہل بیت کو اسیر کیا ان کا مال لوٹا۔

(۴) قاتلین حسین کی عورتوں نے گریبان چاک کئے بین کئے۔

(۵) قاتلین حسین شیعہ امت رسول سے خارج ہیں۔

ایک اور ہستی کا بیان ملاحظہ ہو جسے مدعی بھی کہہ سکتے ہیں اور گواہ بھی وہ ہے امام باقر انھوں نے یہ واقعات لازماً اپنے والد امام زین العابدین سے سنے ہوں گے اور

وہ تو دبھی بقول شیعہ امام معصوم ہیں۔

جلاء العیون ص ۳۴۶

"جب امیرالمؤمنین سے بیعت کی۔ پھر ان سے بیعت شکستہ کی اور ان پر شمشیر کھینچی اور امیرالمؤمنین ہمیشہ ان سے بمقام مجادلہ اور محاربہ تھے۔ اور ان سے آزار و مشقت پاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو شہید کیا اور ان کے فرزند امام حسن سے بیعت کی اور بعد بیعت کرنے کے ان سے عذر اور مکر کیا۔ اور چاہا کہ ان کو دشمن کو دے دیں۔ اہل عراق سامنے آئے اور خنجر ان کے پہلو پر لگایا اور خیمہ ان کا لوٹ لیا یہاں تک کہ ان کی کنیز کے پاؤں سے خلخال اتار لیے اور ان کو مضطرب اور پریشان کیا تا کہ انہوں نے معاویہ سے صلح کر لی اور اپنے اہل بیعت کے خون کی حفاظت کی اور ان کے اہل بیت کم تھے۔ پس ہزار مرد عراقی نے امام حسین کی بیعت کی اور جنہوں نے بیعت کی تھی خود انہوں نے شمشیر امام حسین پر چلائی اور ہنوز بیعت امام حسین ان کی گردنوں میں تھی کہ امام کو شہید کیا۔"

اس بیان سے بات بالکل واضح ہو گئی۔

سابقہ کینہ کے شواہد:۔

فاطمہ دختر امام حسین کے بیان میں سابقہ کینہ کے الفاظ ہیں ان کی تاریخی تعبیر یہ ہے

۱۔ جلاء العیون ص ۲۴۳ پر بیان ہے کہ عبدالرحمن ابن ملجم نے حضرت علی کی بیعت کی تھی اور بیعت کر کے جناب امیر کو شہید کیا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ خارجی تھا۔ مگر تاریخ سے اس بات کا نشان تک نہیں ملتا کہ خارجیوں نے کبھی حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی ہو۔ وہ تو کھلم کھلا مخالف تھے اور تقیہ بھی نہیں کرتے تھے جب ابن ملجم نے جناب امیر کی بیعت کی تو شیعان علی میں شامل ہو گیا۔ یعنی حضرت علی کا قاتل بھی شیعہ تھا۔

۲۔ احتجاج طبرسی طبع ایران ص ۱۴۸ امام حسن کا بیان

فقال اری واللہ معاویۃ خیرا لی من ہؤلاء انھم یزعمون لی شیعۃ وابتغوا قتلی و انتہبوا ثقلی واخذوا مالی۔

خدا کی قسم میں معاویہ کو ان اپنے شیعوں سے اچھا سمجھتا ہوں وہ میرے شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے قتل کرنا چاہا اور میرا مال لوٹ لیا۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے شیعوں نے حضرت علی کو قتل کیا امام حسن کو قتل کرنا چاہا اور ان کا مال لوٹا اور امام حسین کو قتل کر کے دم لیا۔ غالباً اسی بنا پر حضرت علی نے اپنے دس شیعہ دے کر امیر معاویہ سے ایک آدمی لے لینے کی آرزو کی تھی۔

نہج البلاغہ جلد اول ص ۱۸۹ حضرت علی فرماتے ہیں

فاخذ منی عشرۃ واعطانی رجلا منھم ۔ گویا امیر معاویہ کے ساتھی ایمان اور وفاداری میں اتنے قابل اعتماد تھے کہ حضرت ان کا ایک آدمی لے کر اس کے بدلے دس شیعہ دینے کو تیار تھے۔ قرآن مجید میں ایک اور دس کی نسبت کا ذکر ہے۔

اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ۔

اے مسلمانو تمہارے بیس صابر آدمی کفار کے ۲۰۰ پر غالب آ سکتے ہیں۔

ممکن ہے حضرت علی نے بھی تقابل میں اسی کی رعایت ملحوظ رکھی ہو۔

امام حسن اور امام حسین کو امیر معاویہ پر اعتماد تھا اور انہوں نے ان دونوں کی حفاظت بھی کی۔ دونوں حضرات نے امیر معاویہ کی بیعت بھی کر لی اور ان سے وظیفہ بھی لیتے رہے اس کے برعکس شیعہ نے ایک بھائی کو قتل کرنا چاہا دوسرے کو قتل کر دیا۔

اب مدعا علیہ کے جواب دعویٰ کو دیکھنا ہے اگر اس میں اقرار جرم موجود ہے تو شہادت کی ضرورت نہیں اگر انکار کرے تو گواہ ضروری ہیں۔

بیان مدعا علیہ:۔

مجالس المؤمنین میں قاضی نور اللہ شوستری بیان فرماتے ہیں

اکنوں از اعمال سیئہ خویش نادم گشتہ ام

اب ہم اپنی بداعمالیوں پر نادم ہیں چاہتے

خواہیم کہ دست در دامن توبہ و انابت زدیم شاید خدا وند عز و جل و علا توبۂ مارا قبول کردہ بر ما رحمت کند و ہر کس ازاں جماعت کہ بہ کربلا رفتہ بودند عذرے می گفتند۔ سلیمان بن صرد گفت ہیچ چارہ نمیدانیم جز آنکہ خود را در عرصۂ تیغ آوریم چنانچہ بسیارے بنی اسرائیل تیغ در یکدیگر نہادند قال تعالیٰ انکم ظلمتم انفسکم الآیہ و مجموعہ شیعہ زانوئے استغفار در آمدہ۔ ص ٢٣١

ہیں توبہ کریں شاید اللہ تعالیٰ ہم پر رحمت فرماکر ہماری توبہ قبول کرلے اور اس جماعت سے جتنے لوگ (ابن زیاد کی فوج میں امام کو قتل کرنے) کربلا میں گئے تھے سب عذر کرنے لگے سلیمان بن صرد نے کہا اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو تیغ بدست میدان میں لائیں جیسے بنی اسرائیل نے ایک دوسرے کو قتل کیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا الخ یہ کہہ کر تمام شیعہ استغفار کے لیے زانو کے بل گر پڑے۔

نوٹ :۔ یہ سلیمان بن صرد وہی شخص ہے جس کے مکان میں جمع ہوکر شیعہ نے امام کو کوفہ آنے کا دعوت نامہ تیار کیا تھا۔

مدعا علیہ نے اقرار جرم کرلیا۔ اور توبہ بھی کرلی مگر فائدہ ؟

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مدعا علیہ نے اقرار جرم کرلیا۔ اور ثابت ہوگیا کہ امام حسین کے قاتل کوفہ شیعہ ہیں جنہوں نے امام کو گھر بلا کر بے دردی سے قتل کیا۔ مگر احتیاطاً مزید چھان بین کرلینی چاہیے ممکن ہے کسی اور کا ہاتھ بھی ہو۔

خلاصۃ المصائب ص ٢٠١

لیس فیھم شامی ولا حجازی بل جمیعھم من اھل الکوفہ۔

امام حسین کے قاتلوں میں کوئی ایک بھی شامی یا حجازی نہیں تھا بلکہ سب کے سب کوفی تھے۔

ظاہر ہے وہ اہل کوفہ وہی تو تھے جو شیعہ تھے اور امام کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔
مگر حیرت ہے کہ اماموں کو قتل کرنے والوں کے متعلق شیعہ کے ہاں ایک عجیب فتویٰ ہے

جلاء العیون ص ٤١٣

" احادیث کثیرہ میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہے کہ پیغمبروں اور ان کے اوصیاء کو اور ان کی ذریت کو قتل نہیں کرتا مگر ولد الزناء اور ان کے قتل کا ارادہ نہیں کرتا مگر فرزند زنا فلعنۃ اللہ علیہم اجمعین الی یوم الدین "

مدعیان نے ان کوفی شیعوں کو جہنم کی بشارت تو دے دی تھی اب ائمہ اطہار کے اس فتویٰ سے ان کی دنیوی حیثیت بھی متعین ہوگئی۔ ممکن ہے کوفہ کے شیعوں کو یہ فتویٰ نہ پہنچا ہو مگر علم نہ ہونے سے حکم تو نہیں بدل جاتا آخر یہ ائمہ اطہار کا فتویٰ ہے کسی عام آدمی کا نہیں۔
ایک امر غور طلب باقی رہ گیا ہے کہ جلیلہ امام کے قاتل اہل کوفہ شیعہ ثابت ہوگئے مگر یزید کا حصہ اس میں ضرور ہوگا کیونکہ وہ حاکم وقت تھا۔ مدعا علیہم سے ہی اس کے متعلق پوچھتے ہیں۔ شاید وہ اسے بھی اپنے ساتھ شامل کریں۔

١ - احتجاج طبرسی ص ١٦٢ امام زین العابدین نے یزید سے سوال کیا میں نے سنا ہے تو میرے والد کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یزید نے جواب دیا۔

قال یزید لعن اللہ ابن مرجانہ فواللہ ما امرتہ بقتل ابیک ولوکنت متولیا لقتالہ ما قتلتہ۔

یزید نے کہا اللہ ابن زیاد پر لعنت کرے بخدا میں نے اسے تیرے والد کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اگر میں خود معرکہ کربلا میں ہوتا تو انہیں ہرگز قتل نہ کرتا۔

مدعا علیہ نے یزید کی صفائی پیش کردی مگر صرف اس کا بیان کافی نہیں حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔

٢ - خلاصۃ المصائب ص ٢٥٣ جب شمر نے امام کا سر یزید کے سامنے پیش کیا اور انعام کا مطالبہ کیا تو

فغضب یزید ونظر الیہ نظرا شدیدا وقال ملاء اللہ رکابک نارا ویل لک اذا علمت انہ خیر الخلق فلم قتلتہ

پس یزید نے غضبناک ہوکر شمر کی طرف دیکھا اور کہا اللہ تیری رکاب کو آگ سے بھر دے تیرے لیے ہلاکت ہو جب تجھے علم تھا کہ یہ ساری مخلوق سے افضل ہیں تو تو نے انہیں کیوں

اخرج من بین یدی لا جائزۃ لک عندی۔	قتل کیا۔ دور ہوجا میری آنکھوں سے تیرے لیے کوئی انعام نہیں۔

۳۔ اور جلاء العیون ص۵۲۹ پر ہے کہ انعام کے طالب کو قتل کر دیا۔

اگر یزید نے قتل کا حکم دیا تھا تو شمر کہہ دیتا کہ آپ نے حکم دیا میں نے تعمیل کی اور یہ بات روایت میں مذکور ہوتی۔ مگر ان میں سے کوئی صورت بھی موجود نہیں۔

۳۔ تنج الاحزان طبع ایران ص۳۲۱

کسے وارد شد خبر آورد و گفت دیدۂ تو روشن کہ سر حسین وارد شد آں نظر غضبناک کرد و گفت دیدہ ات روشن مباد۔	کسی نے یزید کو اطلاع دی تیری آنکھیں روشن ہوں حسین کا سر آگیا یزید نے نگاہ غضب سے دیکھا اور کہا تیری آنکھیں بے نور ہوں۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ مجرموں نے یزید کو بری قرار دیا ہے۔ غالباً اسی بنا پر امام زین العابدین کو تسلی ہوگئی اور یقین آگیا امام حسین کے قتل میں یزید کا ہاتھ نہیں اس لیے انہوں نے یزید کی بیعت کر لی بلکہ یہاں تک کہہ دیا۔

انا عبد مکرہ ان شئت فامسک وان شئت فبع۔	اے یزید میں تمہارا غلام ہوں چاہے مجھے رکھے چاہے فروخت کر دے۔

(روضہ کافی، جلاء العیون)

یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قاتلین حسین کوفی شیعہ تھے جیسا کہ مدعیان کا دعویٰ ہے اور مدعا علیہم نے اقرار جرم کر لیا۔ البتہ ایک مسئلہ حل طلب ہے۔

اصول کافی طبع نولکشور ص۱۵۸ پر ایک اصول بیان ہوا ہے۔

ان الائمۃ یعلمون متی یموتون وانھم لا یموتون الا باختیار ھم۔	تحقیق ائمہ کرام کو اپنی موت کے وقت کا علم ہوتا ہے اور وہ اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

اس اصول کے پیش نظر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ امام حسین کو علم تھا کہ اہل کوفہ غدار ہیں مجھے بلا کر قتل کریں گے کیونکہ امام کو ما کان وما یکون کا علم ہوتا ہے اور امام کے پاس رجسٹر بھی ہوتا ہے پھر آپ کوفہ کیوں گئے؟

اگر یہ کہا جائے کہ ان کی اصلاح کے لیے گئے تھے تو خود جاتے اپنے اہل بیت کو کیوں ساتھ لے گئے اپنی شہادت اور اہل بیت کی رسوائی کا علم ہونے کے باوجود یہ اقدام کیوں کیا؟

۲۔ امام نے جب اپنے اختیار سے موت قبول کی اور اسے پسند کیا تو سالہا سال سے ان کی موت پر رونا پیٹنا کس وجہ سے ہے۔ اگر محبت سے ہے تو محبت کا تقاضہ ہے کہ اپنی پسند محبوب کی پسند کے تحت ہو۔ اگر امام کی پسند کے خلاف احتجاج ہے تو یہ بھی غیر معقول البتہ اپنے فعل پر ندامت ہے کہ امام کو قتل کیوں کیا تو یہ بات معقول نظر آتی ہے۔

۳۔ بقول شیعہ حضرت علی نے تقیہ کیا اصحاب ثلثہ کی بیعت کر کے تقیہ کرنے کا ثواب بھی حاصل کیا بلکہ نو حصہ دین بچا لیا اور اپنی جان بھی بچالی۔ امام حسین نے تقیہ کیوں نہ کیا اپنے والد کی سنت کی پیروی بھی ہو جاتی۔ تقیہ کا ثواب بھی ملتا۔ جان بھی بچ جاتی اور اہل بیت بھی مصائب سے بچ جاتے۔

تقیہ کے فضائل کی بحث طویل ہے۔ البتہ چند ایک باتیں بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اصول کافی باب التقیہ ص۴۸۲ امام جعفر فرماتے ہیں

یا ابا عمر ان تسعۃ اعشار الدین فی التقیۃ ولا دین لمن لا تقیۃ لہ۔	اے ابو عمر ۹/۱۰ حصہ دین تقیہ کرنے میں ہے جو تقیہ نہیں کرتا بے دین ہے۔

۲۔ تفسیر امام حسن عسکری طبع ایران ص۱۲۹

قال رسول اللہ مثل المؤمن لا تقیۃ لہ کمثل جسد لا راس لہ۔	رسول خدا نے فرمایا تارک تقیہ مومن کی مثال ایسی ہے جیسے بدن بغیر سر کے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح سر کے بغیر بدن بے کار ہے اسی طرح تقیہ کے بغیر ایمان کسی کام کا نہیں۔

۳۔ ایضاً

قال علی بن الحسین یغفر اللہ للمؤمنین من کل ذنب ویطہرہ فی الدنیا ما خلا ذنبین ترك التقیۃ وتضییع حقوق الاخوان۔

امام زین العابدین نے فرمایا اللہ تعالیٰ مؤمن کے تمام گناہ بخش دے گا اور دنیا سے پاک کر کے نکالے گا مگر دو گناہ نہیں بخشے گا اول تقیہ کا ترک کرنا دو بھائیوں کے حقوق ضائع کرنا۔

"من کل ذنب" سے ظاہر ہے کہ شرک اور ائمہ کو قتل کرنا بھی قابل معافی گناہ ہیں ہاں تارک تقیہ کے لیے نجات نہیں۔ گویا اہل کوفہ امام کو قتل کر کے بھی گناہوں سے پاک ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے اور امام نے جان دے کر بھی کچھ نہ پایا کیونکہ ترک تقیہ کا ناقابل معافی گناہ ان کی گردن پر رہا۔ ہائے امام مظلوم کی دہری مظلومیت! لطف یہ کہ یہ بات امام مظلوم کے بیٹے کی زبان سے کہلوائی گئی ہے۔

اسی وجہ سے عبد الجبار معتزلی نے اپنی کتاب مغنی میں شیعہ سے ایک سوال کیا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے تقیہ ہر ضرورت کے وقت جائز ہے اور خوف جان ہو تو تقیہ فرض ہے ایسی حالت میں جو تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے مارا گیا وہ ملعون موت مرا اس نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ مگر کربلا میں امام حسین نے اپنی جان ہی نہیں دی اہل بیت کو شہید کرایا ان پر مصائب آئے تو اس کی اصل وجہ امام حسین کا تقیہ نہ کرنا ہے اگر وہ تقیہ کر کے یزید کی بیعت کر لیتے تو خدا کی نافرمانی بھی نہ ہوتی اور جان بھی بچ جاتی حالانکہ امام حسن نے تقیہ کر کے امیر معاویہ کی بیعت کر لی حضرت علی نے تقیہ کر کے خلفائے ثلثہ کی بیعت کر لی۔ اس لیے آپ حضرات شیعہ کیا کہتے ہیں کہ امام حسین کی موت کس قسم کی تھی؟

ابو جعفر طوسی نے تلخیص شافی ص۱۸۲ پر اس سوال کو یوں نقل کیا ہے

ثم لما عرض علیہ ابن زیاد الامان وان یبایع یزیداً کیف لم یستجب حقناً لدمہ ودماء من معہ من اہلہ وشیعتہ وموالیہ ولم لقی بیدہ الی التہلکۃ وبدون ہذا الخوف سلم اخوہ الحسن الامر الی معاویۃ فکیف یجمع بین فعلیہما

جب ابن زیاد نے امام حسین کو اس شرط پر امان دی کہ یزید کی بیعت کر لیں تو امام نے اسے کیوں قبول نہ کیا۔ اپنی جان اور اپنے متعلقین کی جان بچا لیتے انہوں نے ترک تقیہ کر کے ان جانوں کو ہلاکت میں کیوں ڈالا۔ حالانکہ ان کے بھائی امام حسن نے بلا خوف جان۔ حکومت امیر معاویہ کے سپرد کر دی تھی دونوں بھائیوں کے فعل کو کیسے جمع کر سکتے ہو۔

شریف مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی کی طرف سے جواب یہ دیا گیا

لما رأی لا سبیل الی العود ولا الی دخول الکوفۃ سلك طریق الشام سائراً نحو یزید بن معاویۃ لعلمہ علیہ السلام بانہ علی ما بہ ارغف من ابن زیاد واصحابہ فصار علیہ السلام حتی قدم علیہ عمر بن سعد من العسکر العظیم وکان من امرہ ما قد ذکر وسطر فکیف یقال انہ القی بیدہ الی التہلکۃ وقد روی انہ قال لعمر بن سعد اختاروا منی اما الرجوع الی المکان الذی اقبلت منہ او ان اضع یدی علی ید یزید فہو ابن عمی لیری فی رایہ واما ان یسیروا الی ثغر من ثغور المسلمین فاکون رجلا من اہلہ لی ما لہ وعلی ما علیہ۔

جب امام نے دیکھا کہ مدینہ کو لوٹنے کا کوئی راستہ نہیں نہ کوفہ میں داخل ہونے کی کوئی صورت ہے تو شام کو روانہ ہوئے کہ یزید کے پاس جائیں تا کہ اس مصیبت سے نجات ملے جو ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں سے ہو رہی تھی آپ روانہ ہوئے تو عمر و سعد لشکر عظیم لے کر سامنے آ گیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے اس لیے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ امام نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان ہلاکت میں ڈالی۔ حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ امام نے ابن سعد سے فرمایا تین میں سے ایک صورت اختیار کر لو یا تو مجھے واپس مدینہ جانے دو یا یزید کے پاس جانے دو کہ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا وہ میرے چچا کا بیٹا ہے۔ وہ میرے حق میں جو رائے قائم کرے سو کرے۔ یا اسلامی سرحدوں کی طرف جانے دو میں مسلمانوں میں مل کر جہاد کروں گا ان کے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہوں گا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ امام حسین یزید سے بیعت کرنے پر راضی تھے۔ مگر فوج نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا معلوم ہوتا ہے ابن زیاد وغیرہ ذمہ دار لوگ امام کو گرفتار کر کے لے جانا

چاہتے تھے تاکہ انعام کے حقدار ہوسکیں۔

دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیعان کوفہ کی فوج بھی تقیہ کرکے امام کے خلاف لڑ رہی تھی۔ گویا دو تقیوں میں تصادم ہوگیا فرق اتنا ہے کہ امام تقیہ کرنے پر آمادہ ہوگئے اور فوج عملاً تقیہ کر رہی تھی۔

تلخیص شافی ص۴۷ پر اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

واجتمع کل من کان فی قلبه نصرته و ظاهره مع اعدائه۔	امام کے مقابل جو فوج جمع ہوئی انکے دلوں میں امام کی محبت اور اس کی نصرت کی آرزو تھی ظاہراً وہ دشمن کے ساتھ تھے۔

شریف مرتضٰی اور طوسی نے عبدالجبار معتزلی کا جواب تو دے دیا مگر ایک اور پیچ پڑ گیا۔

مختصر بصائر الدرجات ص۶

قال ابوعبدالله ای الامام لا یعلم ما یصیبه ولا الی ما یصیر امر فلیس بحجة الله علی خلقه۔	جو امام آنے والے مصیبت کا علم نہیں رکھتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا وہ امام ہی نہیں نہ مخلوق پر خدا کی حجت ہے۔

یعنی امام کو آنے والے مصائب کا علم تھا۔ انہوں نے اپنے اختیار اور پسند سے موت قبول کی جب اس کا علم تھا تو کربلا گئے کیوں؟ عبدالجبار کا اعتراض "کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالا" بدستور قائم ہے۔ کیونکہ تقیہ کا فائدہ تو جب ہوتا کہ کربلا روانہ ہونے سے پہلے کرتے اس موقع پر تقیہ کے ارادہ کا اظہار بے موقع ہے اور بناوٹ معلوم ہوتی ہے۔

شیعہ حضرات کبھی یہ بھی جواب دیتے ہیں کہ یہ روایت مناظرہ کی کتابوں میں ہے حدیث کی کتابوں میں نہیں لہٰذا حجت نہیں۔ یہ بات درست سہی مگر ان کے بڑوں کو کیوں نہ سوجھی سید شریف مرتضٰی نے شافی میں اور ابو جعفر طوسی نے تلخیص میں اس روایت کو کیوں جگہ دی جب تحریف قرآن کا مسئلہ چلے تو طوسی کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ یہاں طوسی کیوں ناقابل اعتماد قرار پایا۔ معلوم ہوا کہ امام حسین کے دامن سے ترک تقیہ کا داغ دھویا نہیں جا سکتا اور سوال کا یہ حصہ بدستور قائم ہے کہ بتاؤ کہ تمہارے اصول کے مطابق امام حسین کی موت کس قسم کی تھی؟

ائمہ کی موت اپنے اختیار میں ہونے کا اصول تقاضا کرتا ہے کہ امام حسین نے یہ موت اپنے اختیار سے پسند کی محبان حسین بھی محبوب کی پسند کو محبوب رکھیں اور انکی یاد میں اپنی جان دے دیں۔ رونا پیٹنا جوانمردی نہیں۔

اس موقع پر ایک دو باتیں مزید ضمناً بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے

۱۔ شیعہ کہتے ہیں امام معہ رفقاء پیاسے مرے مگر جلاء العیون ص۴۵۴

"جب پانی نہ ملا تو امام نے خیمہ کے پیچھے بیلچہ مارا شیریں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا امام نے خوب پیا اور رفقاء کو بھی پلایا"

۲۔ شیعہ کہتے ہیں کہ امام کی نعش کو گھوڑوں کے نیچے روندا گیا مگر اصول کافی اور جلاء العیون ص۵۰۳ پر لکھا ہے

"امام کی نعش پر ایک شیر آکے بیٹھ گیا اور اس نے کسی کو امام کی نعش کے قریب نہ آنے دیا"

ان متضاد باتوں میں سچائی کی تلاش کیجئے۔

۳۔ ملا باقر مجلسی کا بیان ہے امام کا جسم ان کی موت کے بعد آسمان پر اٹھا لیا گیا اور فرشتے اسی کا طواف کرتے رہتے ہیں۔

"جسم تو آسمان پر گیا زمین پر کس کو روندا گیا۔ کربلا میں روضہ کس کا بنایا گیا؟ روضہ میں دفن کون ہے؟ کربلا میں جا کر زیارت کس کی ہوتی ہے۔ اگر میت کے بغیر کربلا میں روضہ بنایا جا سکتا ہے تو ہر جگہ روضہ بنا لینے میں کیا قباحت ہے!"

واقعی شیعہ کے بیانات سے تضاد رفع کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور سوال ضمناً غور طلب ہے۔

شیعہ تسلیم کرتے ہیں امام کو ہم نے قتل کیا۔ یزید کا اس میں ہاتھ نہیں۔ پھر حیرت ہوتی ہے کہ امام جب شیعہ تھے تو شیعوں نے قتل کیوں کیا؟ معلوم ہوتا ہے معاملہ برعکس ہے امام اہل السنت تھے ان کا مذہب وہی تھا جو باقی عرب کا تھا۔ اسی وجہ سے کوفہ کے شیعوں

نے دھوکا دے کر امام کو بلایا اور قتل کیا۔ امام کو معلوم تھا کہ وہ شیعہ ہیں مگر ان کی اصلاح کی خاطر چلے گئے۔ ائمہ سے شیعوں کی پرانی دشمنی کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔

ائمہ کے علم کی وسعت کا جو عقیدہ شیعہ کے ہاں مسلمہ ہے کہ ما کان وما یکون کا علم امام کو ہوتا ہے اس کے پیش نظر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ جب حضرت علی کو علم تھا کہ امام حسن نے معاویہ کے حق میں حکومت سے دست بردار ہونا ہے، امیر معاویہ نے یزید کو حکومت دینی ہے اور یزید کی فوج نے امام حسین کو قتل کرنا ہے تو اصل مجرم کون ہوا۔ حضرت علی یا امام حسن یا یزید؟

اس نکتہ سوال کا جواب اصول کافی صفحہ ۲۷ پر ملتا ہے امام تقی سے روایت ہے۔

فھو یحلون ما یشاؤن ویحرمون ما یشاؤن۔	ائمہ جس چیز کو چاہیں حلال کر لیں جسے چاہیں حرام کر لیں۔

یعنی امام حسین نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا قتل حلال کر لیا، امام حسن نے اپنے بھائی کا قتل حلال کر لیا معلم ہرا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس قتل کا مرتکب مجرم نہیں۔ کیونکہ فعل حلال کرنے والا ثواب کا مستحق ہے مجرم نہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ صحابہ نے کئی بار رسول کریم کو کفار کے نرغے میں چھوڑا اور بھاگ گئے پھر بھی اہل السنت انہیں کامل الایمان سمجھتے ہیں اگر شیعہ نے ایک بار امام سے یہ سلوک کیا تو کافر کیوں ہو گئے۔

بات بڑی اونچی ہے مگر اس میں کئی سقم ہیں۔

۱۔ تاریخ سے کوئی ایک واقعہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ نے حضورؐ کو کفار کے نرغہ میں چھوڑ کر بھاگ جانے کی غلطی ہو اس لیے یہ دعوٰی ہی جھوٹا ہے۔

۲۔ صحابہ کو کامل الایمان تو خود خدا کہتا ہے اور خدا کا رسول کہتا ہے۔ اس لیے جو... خدا اور رسول کو قابل اعتماد نہ سمجھے وہ آزاد ہے جو چاہے کہتا پھرے۔

۳۔ اہل السنت کو کوئی حق نہیں کہ کسی کو کافر کہیں بلکہ وہ تو روٹھنے والوں کو منانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ

(ا) امام حسین فرما گئے ہیں نحن خذلنا شیعتنا

(ب) امام زین العابدین کہہ گئے ہیں فتبا لکم ما قدمتم لانفسکم ...... فلستم من امتی

(ج) زینب بنت علی کہتی ہیں وفی العذاب انتم خالدون

(د) امام باقر کہہ گئے ہیں کہ جنہوں نے بیعت کی تھی خود انہوں نے شمشیر امام حسین پر کھینچی اور ہنوز بیعت امام حسین ان کی گردنوں میں تھی کہ امام کو شہید کیا۔

(ہ) نور اللہ شوستری شیعوں کی طرف سے کہہ گئے ہیچ چارہ نمیدانیم جز انیکہ خود را در عرصہ تیغ آوریم۔

اہل علم و دانش تو دہی فیصلہ کریں کہ جو امام کو دھوکا دے۔ جو حضورؐ کی امت سے خارج ہو۔ جس کے لیے ابدی جہنم ہو۔ جو واجب القتل سمجھا جائے اسے کامل الایمان ہی کہیں گے؟

۴۔ صحابہ پر بہتان ہے کہ حضورؐ کو کفار کے نرغہ میں چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے۔ مگر یہاں تو بات دور تک پہنچتی ہے۔ امام کو دھوکا دیا۔ گھر بلایا۔ امام کے ساتھ ہو کر یزید کے خلاف لڑنے کا حلفیہ عہد دیا امام آئے تو آنکھیں بدل لیں۔ یزید کی فوج میں شامل ہو گئے۔ پانی بند کیا۔ امام کو نہایت بے دردی سے شہید کیا۔ اہل بیت کو رسوا کیا۔ ان کا مال لوٹا۔ اس لیے کہاں وہ بہتان اور کہاں یہ تلخ حقائق۔ اور لطف یہ کہ اتنا کچھ کر چکنے کے بعد محبان اہل بیت بن کر سینہ کوبی کرنا اور جلوس نکالنا۔ حالانکہ جلاء العیون صفحہ ۵۱۹ اور صفحہ ۲۷۵ پر موجود ہے کہ رونا پیٹنا یزید اور اس کے گھر سے شروع ہوا۔ اس لیے اگر یہ یزید کی سنت سمجھ کر کیا جاتا ہے تو درست ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو غم مرنے والے کے پسماندگان کو ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اہل بیت پسماندگان نے تعزیہ دلدل۔ علم پنجہ وغیرہ کے جلوس نکال کر اور اجتماعی طور پر سینہ کوبی کر کے اظہار غم کیا ہو۔ اور اگر یہ عبادت ہے تو ظاہر ہے کہ ائمہ اور اہل بیت سے بڑھ کر عبادت گزار یہ ماتمی تو نہیں ہو سکتے ان سے یہ عبادت کیوں چھوٹ گئی۔

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) قتل امام حسین ہیں مدعی ائمہ معصومین اور اہل بیت ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ ہمیں شیعوں نے قتل کیا۔

(۲) قاتلین کوفی شیعہ اقرار جرم کرتے ہیں۔

(۳) گواہ امام باقر ہیں۔

اگر اس کے خلاف کوئی شخص دعویٰ کرے تو

ائمہ اور اہل بیت کا دعویٰ پیش کرے۔ مدعا علیہ کا اقرار جرم پیش کرے۔

امام جعفر یا امام باقر کی شہادت پیش کرے۔

اس کے بغیر بے تکی بات کوئی وزن نہیں رکھتی۔

عقیدہ خلافت

حضرت علی کی خلافت بلا فصل کا عقیدہ شیعہ کے ہاں ضروریات دین سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اقرار شہادتین کے ساتھ اس کا اعلان ہر اذان میں کیا جاتا ہے کہ اشہد ان علیا ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل گو شیعہ نماز میں صرف اقرار شہادتین پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ کتاب وسنت سے دلائل پر مبنی ہے۔ دلائل یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں ہے واجعل لی وزیرا من اھلی - حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے متعلق اللہ تعالےٰ سے یہ درخواست کی تھی چنانچہ منظور ہوگئی۔ اور حدیث میں آتا ہے حضورؐ نے فرمایا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ اس حدیث میں حضور اکرمؐ نے حضرت علی کو حضرت ہارون سے تشبیہ دی اور تشبیہ سے نبوت کے بغیر تمام مراتب ثابت کیے ان میں خلافت بھی آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے

یا ھارون اخلفنی فی قومی اسی طرح حضور اکرمؐ غزوہ تبوک میں حضرت علی کو خلیفہ بنا کر گئے تھے۔

یہ دلیل آیت قرآنی کے اجمال حدیث نبوی کی تفصیل اور فعل نبوی کی مثال کی بنا پر وزنی معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کچھ اشکال بھی پائے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت ہارونؑ تو حضرت موسیٰؑ کے شریک فی النبوت تھے جب حضرت موسیٰؑ نے درخواست کی واشرکہ فی امری تو جواب ملا قد اوتیت سؤلک یموسیٰ جب ہارونؑ کو نبوت کا منصب مل گیا تو خلافت جو نیابت کا حکم رکھتی ہے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) حضرت ہارونؑ تو حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے۔ اگر یہ تشبیہ درست ہے تو ظاہر ہے کہ جب مشبہ بہ بعد کو خلیفہ نہ بنا تو مشبہ کیسے خلیفہ بن سکتا ہے۔

(۳) اس اعتبار سے تشبیہ درست ہے کہ حضرت ہارونؑ کو عارضی طور پر حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں نیابت کا کام کرنا پڑا اسی طرح حضور اکرمؐ کی غیر حاضری میں غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی کو عارضی طور پر خلیفہ بنایا گیا حضورؐ کی واپسی پر خلافت ختم ہوگئی جیسے حضرت موسیٰؑ کی واپسی پر ہارونؑ کی خلافت ختم ہوگئی۔

(۴) آیت میں واجعل لی وزیرا کی درخواست ہے وزیر اور خلیفہ کے الفاظ نہ تو مترادف ہیں نہ یہ منصب ہی ایک ہے وزیر شئی دگر ہے خلیفہ چیزے دیگر اس لیے یہ تشبیہ بے محل نظر آتی ہے۔ ہاں اس دلیل سے حضرت علی کا قرب منزلت ثابت ہوتا ہے۔ خلافت بلا فصل بعد النبیؐ کا نشان بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ شیعہ نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب صـ۱۸۱ شیعہ کی معتبر کتاب

واعلم ان قول النبیؐ لمولانا علی ابن ابی طالب انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی یشتمل علی خصائص عظیمۃ غیر الخلافۃ۔	خوب سمجھ لو کہ حضور اکرمؐ کا فرمان انت منی الخ حضرت علی کی عظیم خصوصیات پر مشتمل ہے مگر اس سے خلافت ثابت نہیں ہوتی۔

گو بظاہر دلیل قرآنی تھی مگر خود شیعہ مجتہد نے خلافت علی کے بارے میں اسے

رد کر دیا۔ دلیل ۱۲ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک الخ

اس آیت میں دراصل حضورؐ کو خلافت علی کے عقیدہ کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے مگر حضورؐ نے کسی خوف کی وجہ سے اس کا اعلان کرنے سے گریز کیا۔

احتجاج طبرسی ص۳۲

فخشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قومہ واھل النفاق والشقاق ان ینفرقوا۔

پس رسولؐ خدا نے اپنی قوم اور منافقوں کے منتشر ہو جانے کے خوف سے اس عقیدہ کی تبلیغ نہ کی۔

چنانچہ جبرئیلؑ لوٹ کے دوبارہ آئے۔

فصل الخطاب ص۲۵۸

عن علی بن موسی الرضا عن ابیہ عن جدہ قال یوم غدیر خم یوم عظیم شریف ..... ثم انزل اللہ تعالی وعیدا وتھدیدا یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فی علی۔

علی بن موسیٰ رضا سے روایت ہے ..... کہ فرمایا یوم غدیر خم بہت بڑا عظیم دن تھا..... پھر اللہ تعالیٰ نے دھمکی اور وعید نازل فرمائی کہ اے رسولؐ! علی کے بارے میں جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کر۔

دوسری روایت

عن زار عن عبد اللہ قال کنا نقرأ علی عھد رسول اللہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المومنین۔

..... کہا ہم رسول کریمؐ کے عہد میں یوں پڑھا کرتے تھے اے نبیؐ! جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے وہ پہنچا کہ علی مومنوں کے مولیٰ ہیں۔

تیسری روایت

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فی علی فان لم تفعل عذبتک عذابا الیما۔

اے نبیؐ! علی کے بارے میں تیرے رب کی طرف سے جو تجھ پر نازل کیا گیا وہ پہنچا اگر ایسا نہ کیا تو تجھے دردناک عذاب دوں گا۔

اور اسی کتاب کے اسی صفحہ پہ ہے۔

عن محمد بن الحسن الشیبانی فی نھج البیان فی عداد الآیات المحرفة کقولہ تعالی بلغ ما انزل الیک فی علی محوا اسمہ

محمد بن حسن شیبانی بیان کرتا ہے کہ جن آیات میں تحریف کی گئی ہے ان میں آیت تبلیغ بھی ہے فی علی کا لفظ محو کر دیا گیا ہے۔

فصل الخطاب کے علاوہ ذیل کی مستند کتب شیعہ میں اس تحریف کا ذکر موجود ہے

ا۔ تفسیر قمی۔ علی بن ابراہیم قمی نقل کرتے ہیں من ربک فی علی

ب۔ تفسیر فرات بن ابراہیم میں ہے من ربک فی علی

ج۔ تاویل الروایات الباھرہ میں شیخ شرف الدین نجفی نے کہا من ربک فی علی

د۔ غایت المرام میں ہے من ربک فی علی

ہ۔ احتجاج طبرسی میں ہے من ربک فی علی

علامہ ابن الفارض نے روضۃ الواعظین میں اور سید رضی الدین بن طاؤس نے کشف الغین میں اور مظفر بن جعفر الرسالۃ الموضحہ میں ابن شہر آشوب نے المناقب فی علی میں اور مجلسی نے بحار الانوار میں من ربک فی علی لکھا ہے اور اردبیلیؒ نے کشف الغمہ میں فی علی کے علاوہ ان علیا مولی المؤمنین بھی نقل کیا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ خدا کے نازل کردہ قرآن سے فی علی اور ان علیا مولی المؤمنین کے الفاظ خارج کئے جا چکے ہیں پس شیعہ کے نزدیک یہ قرآن محرف ہے لہٰذا اس پر ان کے ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نیز ان روایات معلوم ہوا کہ موجودہ قرآن میں جب تک فی علی وغیرہ کے الفاظ بڑھائے نہ جائیں اس آیت سے خلافت علی بلا فصل ثابت نہیں ہوتی اسی بنا پر یہ تکلف کرنا پڑا کہ قرآن میں تحریف کی گئی ہے۔

ان روایات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ کسی نے فی علی لکھا کسی نے ان علیا مولی المؤمنین اور کسی نے عذاب الیم کی دھمکی بھی درج کر دی یعنی ان حضرات کا آپس میں اتفاق بھی نہیں پایا جاتا اور بات یہاں پہنچتی ہے کہ اصل آیت سے حضرت علی کی خلافت کا ثبوت نہیں ملتا۔

آیت مذکورہ کے نزول اور خلافت علی بلا فصل کی تفصیل :

احتجاج طبرسی طبع ایران صنٓ۳ پر بیان ہُوا کہ غدیر خم سے پہلے کسی انسان کو خلافت علی کا علم نہ تھا غدیر کے متعلق بیان ہُوا۔

قد بقی علیك من ذلك فریضتان مما یحتاج ان یبلغھما قولك فریضۃ الحج وفریضۃ الولایۃ والخلافۃ من بعدك۔	اس کے بعد آپ کے ذمے دو ایسے فرائض کی تبلیغ باقی ہے جن کا پہنچانا ضروری ہے ایک فریضہ حج دوسرا آپکے بعد ولایت اور خلافت کا کام

اور فصل الخطاب صنٓ۲۸۵

انہ حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المدینۃ وقد بلغ جمیع الشرائع قومہ غیر الحج والولایۃ ..... فلما بلغ غدیر خم قبل الجحفۃ ثلاثۃ امیال اتاہ جبرئیل۔	حضورؐ نے مدینہ سے روانہ ہوکر حج کیا اور قوم کو پوری شریعت پہنچا دی سوائے حج اور ولایت کے مسائل کے ..... جب آپ غدیر خم پر پہنچے تو آپ کے پاس جبرئیل آئے۔

اور احتجاج طبرسی صنٓ۳

عن ابی جعفر قال انہ حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المدینۃ وقد بلغ جمیع الشرائع قومہ غیر الحج والولایۃ۔	ابو جعفر فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے مدینہ سے جا کر حج کیا اور حج اور ولایت کے مسائل کے سوا ساری شریعت قوم کو پہنچا دی۔

چنانچہ ایک فریضہ یعنی حج کی ادائیگی کے لیے آپ تشریف لے گئے واپسی پر بقیہ دین کی تبلیغ کا حکم نازل جس کی ترتیب یہ ہے۔ (۱) پہلی بار حکم آیا تو

صنٓ۳ فقال یا جبریل انی اخشی قومی ان یکذبونی ولم یقبلوا قولی فی علی۔	حضورؐ نے فرمایا اے جبریل مجھے ڈر ہے کہ قوم میری تکذیب کر دے گی اور علی کے بارے میں میری بات نہیں مانے گی۔

دوسری مرتبہ جبریل امین اس انداز سے آئے۔

اتاہ جبریل علی خمس ساعۃ مضت من النہار بالزجر والانتھار۔	جبریل دوسری مرتبہ دن کے وقت زجر و توبیخ لیکر آئے۔

فصل الخطاب صنٓ۲۵۸ اس آمد کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

ثم انزل اللہ تعالی وعیدا وتھدیدا فان لم تفعل عذبتك عذابا الیما۔	پھر اللہ تعالیٰ نے دھمکی دی کہ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو دردناک عذاب دوں گا۔

تیسری مرتبہ جب عصمت یعنی حفاظت کی ضمانت کے ساتھ آئے تو حضورؐ نے آخر اعلان کر ہی دیا مگر فصیح العرب والعجم نے ان الفاظ میں اعلان کیا من کنت مولاہ فعلی مولاہ شیعہ کے نزدیک یہ مجمل مشترک اور کثیر المعنی لفظ حضرت علی کی خلافت بلا فصل کا اعلان ہے شیعہ کے نزدیک جس ترتیب اور جن کوششوں سے یہ آیت نازل ہوئی اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے :۔

۱ ۔ نبی کریمؐ نے اللہ کے حکم کی تعمیل کا معاملہ دو مرتبہ ٹالا تیسری دفعہ مبہم الفاظ میں تعمیل کی جو عدم تعمیل ہی کی ایک شکل ہے کیا نبی اور خدا کا تعلق ایسا ہی ہوتا ہے۔

۲ ۔ رسول خداؐ صحابہ سے اتنا ڈرتے تھے کہ اللہ کی نافرمانی تک کے لیے تیار ہوگئے۔

۳ ۔ حضورؐ کی حیات طیبہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ توحید رسالت اور معاد کی تبلیغ کیلئے پورے عرب کی مخالفت قبول کر لی مگر تبلیغ اور پوری وضاحت کے ساتھ تبلیغ سے باز نہ آئے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت علی کی خلافت کے اعلان کے بارے میں غیروں سے نہیں اپنوں سے ڈرتے رہے آخر دم تک کوئی واضح اعلان نہیں فرمایا۔

۴ ۔ حضورؐ کو حضرت علی کے بارے میں قوم سے خطرہ کیوں تھا کہ قوم اس فیصلہ کو قبول نہ کرے گی کیا حضرت علی اس کے اہل نہیں تھے ؟ یا حضورؐ پر کنبہ پروری کا الزام آتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔

۵ ۔ حضورؐ کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں کیا کوئی اور ایسا مقام بھی آیا کہ اللہ نے کوئی حکم دیا ہو اور حضورؐ اسے ٹالتے رہے ہوں۔

۶ ۔ ما انزل میں صیغہ مجہول کا ہے جو زمانہ گذشتہ کو چاہتا ہے یعنی اس آیت سے پہلے خلافت علی کا حکم نازل ہو چکا تھا مگر حضورؐ نے چھپائے رکھا۔ کیا رسول امین کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے ؟ جو شخص بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں دشمنوں کی زبان سے

بھی امین کہلاتا ہو وہ خدا کے دین کے معاملے میں معاذ اللہ خیانت کرے۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ میں ایسا تضاد تو دشمن بھی نہیں پیش کر سکے۔

۷ ۔ وحی کا ایک بات کے لیے بار بار آنا اور نبی کا بار بار ٹالنا اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ حضورؐ نے وحی کو مذاق سمجھ رکھا تھا۔ حضورؐ کا وحی کے ساتھ یہ سلوک تو وحی کے ساتھ استہزاء، توہین اور تلعب بالوحی ہے کیا حضورؐ کے متعلق کوئی باہوش آدمی یہ تصور کر سکتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس حدیث سے خلافت بلافصل کیسے ثابت ہوتی ہے۔

لفظ مولیٰ کی تحقیق:

لغت کی مشہور کتاب المنجد میں لفظ مولیٰ کے ۲۷ معنی لکھے ہیں مگر اس کے معنی حاکم نہیں لکھے۔ یعنی لغت عرب میں مولیٰ کا لفظ حاکم کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ان معنوں میں آتا ہے۔

سبع معلقات میں طرفہ کے معلقہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

فلو کان مولای امرأ هو غیره لفرج کربی او لا نظر نی عذی و لکن امرأ هو خانقی علی الشکر او التسائل او انا مفتد نی ۔	اگر میرا ابن عم کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو ضرور میری تکلیف دور کرتا یا دوسرے دن تک مہلت دیتا لیکن میرا ابن عم ایسا آدمی ہے جو میرا گلا گھونٹتا ہے شکریہ پر یا سوال پر یا میں فدیہ دوں ۔

پھر حضور اکرمؐ نے یہ لفظ حضرت زید بن حارثہ کے متعلق بھی فرمایا جیسا کہ

انت اخونا و مولانا (مشکوٰۃ ص ۲۹۳)

اور قرآن مجید میں آتا ہے۔

ان اللہ هو مولاہ و جبریل و صالح المؤمنین ۔

اور ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعوه و هذا النبی و الذین اٰمنوا ۔

اگر مولیٰ کے معنی حاکم لیے جائیں تو پہلی آیت کا مطلب ہوگا کہ جبریل اور صالح مومن رسول کریمؐ کے حاکم ہیں۔ اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ کے متبع رسولِ خدا کے حاکم ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ لغت کے اعتبار سے مولیٰ بمعنی حاکم استعمال ہونا ثابت نہیں ہے۔

علم معانی کے لحاظ سے تحقیق :-

اگر یہ فرض لیا جائے کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ آتا ہے (حالانکہ مفعل بمعنی افعل کسی جگہ کسی مادہ میں استعمال نہیں ہوتا) تو اولیٰ بالتصرف صلہ ٹھہرانا کہاں کی لغت ہے؟ اولیٰ بالمحبت یا اولیٰ بالتعظیم کیوں نہ مانا جائے جس کا قرینہ خود حدیث میں موجود ہے کہ

اللهم وال من والاه و عاد من عاداه یعنی اے اللہ تو اسے دوست رکھ جو علیؓ کو دوست رکھتا ہے اور اس سے دشمنی رکھ جو علیؓ سے دشمنی رکھتا ہے۔

یعنی حضور اکرمؐ نے خود لفظ مولیٰ کے معنی کی تعیین فرما دی۔ کہ عداوت کے مقابلے میں یہ لفظ استعمال فرمایا اور ظاہر ہے کہ عداوت کے مقابلے میں محبت کا لفظ استعمال ہوتا ہے حکومت کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔

روح المعانی میں ایک قول فیصل دیا گیا ہے

وقد انکر اهل العربیة قاطبة بل قالوا لم یجئ مفعل بمعنی افعل اصلا ۔	تمام اہل عربیت نے مولیٰ بمعنی اولیٰ کا انکار کیا ہے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں مفعل بمعنی افعل قطعاً نہیں آتا۔

لفظ مولیٰ کے معانی کی وسعت کو دیکھ کر شیعہ مجتہد نے فیصلہ کن بات کہہ دی۔

الا تری کیف لم یصرح النبی صلی اللہ علیه وسلم بالخلافة بعده بلا فصل یوم غدیر واشاره الیها بکلام مجمل مشترك بین معان یحتاج فی تعیین ما هو المقصود	کیا تو نہیں دیکھتا کہ حضورؐ نے غدیر کے دن اپنے بعد خلافت بلافصل کی ہرگز تصریح نہیں فرمائی بلکہ مجمل مشترک معانی کثیرہ میں جو کلام فرمائی وہ قرائن حالیہ یا مقالیہ کی محتاج ہے جن سے

منها الى قرائن حالية او مقالية۔

مقصود کا تعین کیا جا سکے۔

(فصل الخطاب ص۱۸۲)

مجتہد صاحب کے فیصلے کا ماحصل یہ ہے کہ جو کلام مقصود کی تصریح میں قرائن کی محتاج ہو اس سے اصولی مسائل ثابت نہیں کئے جا سکتے۔

ایک اور شیعہ مجتہد نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے کہ

قال تعالیٰ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک الخ والتبلیغ لا یکون الا بالتفسیر
(الاستغاثہ فی بدع الثلاثہ ص۱۲)

پوری تفسیر کے بغیر تبلیغ اصولاً ہوتی ہی نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ جب حضورؐ نے لفظ مولیٰ کی تفسیر نہیں فرمائی تو اس حکم کی نہ وضاحت ہوئی اور نہ تبلیغ ہوئی جس لفظ کی وضاحت یا تفسیر خود متکلم نے نہیں فرمائی اس سے ایک اصولی مسئلہ "خلافت بلا فصل" ثابت کرنا تکلف بے جا یا سینہ زوری کے سوا کچھ نہیں۔

شیعہ علماء میں سے میر حامد حسین لکھنوی نے اپنی کتاب طبقات الانوار میں اور مولوی علی محمد نے فلک النجات میں حضرت علیؓ کی خلافت پر سب سے بڑی دلیل اور نص جلی یہی حدیث ــــ من کنت مولاہ فعلی مولاہ پیش کی ہے اور اس حدیث کا تفصیلی جائزہ لینے سے واضح ہو گیا ہے کہ یہ دلیل مجمل مشترک اور معنی متعین کرنے میں دوسری دلیل کی محتاج ہے اس لیے خلافت جیسے اصولی عقیدہ کی بنیاد کیونکر بن سکتی ہے؟

چنانچہ شیعہ محدث نوری نے صاف اقرار کیا ہے کہ یہ حدیث مجمل مشترک ہے اپنے بیان میں دوسری دلیل کی محتاج ہے پھر خلافت بلا فصل کی دلیل کیسے بن سکتی ہے۔

محدث نوری نے شیخ صدوق پر خوب جرح کی ہے۔ شیخ مذکور نے تحریف قرآن کا انکار کیا ہے محدث نوری نے فصل الخطاب میں اس کو رد کیا ہے کہ اگر قرآن کی تحریف کا انکار کیا جائے تو حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے اس لیے تحریف قرآن کا اقرار کرنا درست ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کی آیت قرآن میں موجود تھی مگر صحابہ نے وہ آیت نکال دی۔

چنانچہ محدث نوری فصل الخطاب ص۳۴ پر شیخ صدوق کے متعلق لکھتا ہے۔

قلت لشدة حرصه على اثبات مذهبه يتحلق بكل ما يحتمل فيه تائيدً لمذهبه ولا يلتفت الى لوازمه الفاسدة التى لا يمكن الالتزام به فان ما ذكره من شبهة هى الشبهة التى ذكرها المخالفون بعينها وا ردوها على اصحابنا المدعيين لثبوت النص الجلى على امامة مولانا على عليه السلام واجابوها بما لا يبقى معه ريب وقد احياها بعد طول المدة غفلة او تناسيا مما هو مذكور فى كتب الامامية۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ صدوق اپنے مذہب کے ثابت کرنے کا اتنا حریص ہے کہ جس بات میں ذرہ بھر احتمال پاتا ہے اپنے مذہب کی تائید میں لے لیتا ہے اور اس کے نتائج فاسدہ کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ ان نتائج کو تسلیم کرنا اس کے امکان میں نہیں جو اعتراض اس نے تحریف قرآن پر کئے ہیں بعینہ وہی اعتراض ہمارے مخالفین حضرت علی کی امامت پر نص جلی کے موجود ہونے پر اصحاب شیعہ پر کرتے ہیں۔ اور ہمارے اصحاب نے ان کا جواب ایسے عمدہ طریقہ سے مدلل طور پر دیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں رہی مگر شیخ صدوق نے ایک طویل زمانہ کے بعد پھر ان اعتراضات کو زندہ کیا ہے اور جو کچھ کتب امامیہ میں لکھا ہے اس سے غفلت برتی ہے یا فراموش کر دیا ہے۔

خلافت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے بلا شبہ بہت کوششیں ہوتی رہیں مگر شریف مرتضیٰ علم الھدیٰ نے ان پر پانی پھیر دیا چنانچہ شافی ص۱۱۱ پر فرماتے ہیں۔

ولا شك فى انه عليه السلام لم يدع الامامة ظاهر الا عند البيعة۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی نے کبھی دعویٰ امامت کا اظہار نہیں کیا سوائے اس زمانہ کے جب ان کی بیعت ہوئی۔

ظاہر ہے کہ جس بات کے حضرت علی خود مدعی نہیں ہیں وہ بات ان کے متعلق ثابت کرنے کی کوشش واقعی ایک عجیب حرکت ہے۔

رہا حدیث پر جرح کا معاملہ۔ تو اصول کے اعتبار سے یہ حدیث مجمل مشترک [illegible]

پائی - اس اصطلاح کی حقیقت فنی اعتبار سے واضح کر دینا مناسب ہے

والمجمل - وھو ما خفی المراد منه بنفس اللفظ خفاء لا یدرک الا بالبیان من المجمل سواء کان ذلک لتزاحم المعانی المتساویة الاقدام کالمشترک اولغرابة المعانی -

نص مجمل وہ ہے جس سے مراد نفس لفظ میں پوشیدہ ہو اور وہ پوشیدہ معانی اس کے بغیر معلوم نہ ہو سکیں کہ اجمال کرنے والا خود بیان کرے کہ اس سے مراد فلاں معانی ہیں۔ یہ اجمال یا تو معانی کی وجہ سے ہو گیا ہو جو تمام برابر ہیں مثل مشترک کے یا بوجہ غرابت معانی کے۔

(نامی شرح حسامی)

یہ تو مجمل نص کی حقیقت ہوئی اس کا حکم یہ ہے :-

جواز معه الاعتقاد اجمالا ثم الاعتقاد تفصیلا بعد البیان ثم العمل فی وقته ولا تکلیف قبل البیان فلا شناعة فی اخلال الفعل

مجمل نص پر اجمالاً اعتقاد رکھنا جائز ہے پھر اس اجمال کی تفصیل بیان کر دینے کے بعد تفصیلی اعتقاد رکھنا ہے پھر اس کے وقت پر اس پر عمل کرنا ہے۔ مجمل کے بیان سے پہلے اس پر عمل کرنے کا انسان مکلف نہیں ہے۔

(نامی شرح حسامی)

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ حدیث مجمل مشترک ہے۔ اور یہ حضور اکرمؐ نے فرمائی ہے اس لیے اس اجمال کی تفصیل جب تک حضور اکرمؐ کی زبان مبارک سے نہ ہو اس کے تفصیلی معنی متعین نہ ہوں گے۔ یہ بات اصول کے خلاف ہے کہ اجمال تو حضورؐ کریں اور تفصیل ہر کس و ناکس کرنے لگے۔ لہٰذا اصولاً اس امر کی ضرورت ہے کہ اس اجمال کی تفصیل حضورؐ کی ایسی حدیث سے کی جائے جو متواتر ہو اور اپنے مدلول مطابقی خلافت بلافصل پر نص صریح غیر مؤول بھی ہو۔ اور حضورؐ کا ارشاد ہو کہ مولاہ کے معنی خلافت بلافصل ہے۔

لفظ مولیٰ مجمل کے علاوہ مشترک بھی ہے اس لیے مشترک کا حکم بھی اصول فقہ کے قاعدہ سے معلوم کر لینا ضروری ہے :-

حکم المشترک التامل فیه حتی یترجح

مشترک کا حکم یہ ہے کہ اس میں تامل کیا جائے

احد معنیه - التامل فی نفس الصیغة اوغیرھا من الادلة والامارات لترجیح احد معنیه -

اور یہ غور و فکر یا تو نفس لفظ میں ہوگا اور اشارات اور علامات میں جو ایک خاص معنی کی ترجیح کے لیے دلائل بن سکیں۔

یعنی ایک معنی پر دوسرے معنی کی ترجیح ثابت ہونے یا بیان کے بعد نص قابل عمل تو ہو سکتی ہے مگر اس نص سے اصول یا عقائد ثابت نہیں ہو سکتے۔

اب اس حدیث (من کنت مولاہ الخ) کو واقعاتی پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیے واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ حضور اکرمؐ نے غدیر خم پر فرمائے۔ اور بقول شیعہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دستار بندی کرائی گئی۔ یہ تینوں امور وضاحت طلب ہیں۔

اول دستار بندی :- دستار بندی سے بالعموم یہی بات یعنی خلافت یا جانشینی سمجھی جاتی ہے مگر یہ بات اس سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ پیش آ چکی تھی۔ اس لیے وہ پہلے ہی خلیفہ بلافصل بن گئے۔ جیسا کہ مشکوٰۃ باب اللباس میں ہے۔

عن عبد الرحمن بن عوف عممنی رسول الله صلی الله علیه وسلم فسدلھا بین یدی ومن خلفی

حضورؐ نے مجھے پگڑی بندھوائی تھی ایک پلو سامنے کر دیا تھا ایک پیچھے کر دیا تھا۔

دوم بیعت لینے کا معاملہ :- علامہ علی الحائری مجتہد شیعہ نے اپنی کتاب موعظ غدیر میں بیعت کی تفصیل دی ہے کہتے ہیں :-

"حضرت علیؓ کو ایک خیمہ میں بٹھایا گیا ایک ایک صحابی اندر جاتا اور بیعت کرتا تھا حتیٰ کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ نے بیعت کی"

یہ دلیل اس لحاظ سے وزنی ہے کہ لفظ مولیٰ کی وضاحت حضورؐ نے گو اپنی زبان مبارک سے نہیں فرمائی مگر اپنے فعل سے فرما دی۔ مگر عقلی اور عملی اعتبار سے یہ دلیل بناوٹی معلوم ہوتی ہے وہ یوں کہ

۱۔ تصور کیجئے ایک خیمہ میں حضرت علیؓ بیٹھے ہیں۔ باہر خلقت کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں سے ایک ایک آدمی خیمہ کے اندر باری باری جاتا ہے، حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے

اور بیعت تو عہد ہے لازماً وہ ہر ایک سے عہد لیتے ہوں گے اگر اس سارے عمل میں کم ازکم ۱ منٹ صرف ہوں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار آدمیوں سے بیعت لینے میں ۶۲۰۰ گھنٹے یعنی ۸ مہینے ۱۰ دن اور ۸ گھنٹے خرچ ہوئے کتنی طویل نشست تھی صحابہ کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ تین منٹ میں فارغ ہو کر اپنے کاروبار میں لگ گئے مگر حضرت علیؓ اتنی طویل مدت مسلسل ایک جگہ بیٹھے رہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد لاہوری نے کہیں خواب کا واقعہ بیان نہ کیا ہو۔

۲۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرمؐ غدیر کے واقعہ کے بعد صرف ۸۰ دن اس دنیا میں رہے پھر آپ کا وصال ہوگیا۔

۳۔ ان دونوں حقائق کو جمع کرنے سے نتیجہ نکلا کہ حضور اکرمؐ کا وصال بھی ہوگیا۔ تجہیز و تکفین بھی ہوگئی اور ابھی حضرت علیؓ اسی خیمے میں بیٹھے بیعت لے رہے ہیں اور ۱۷۸ روز بعد تک بیعت لیتے رہے۔

۴۔ حضورؐ کا وصال ہوگیا ہے۔ صحابہ ثقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہیں خلافت کا معاملہ زیر بحث ہے مختلف رائیں پیش ہو رہی ہیں۔ حضرت علیؓ تو ابھی غدیر پر ایک خیمہ میں بیٹھے بیعت لے رہے ہیں مگر جو صحابہ بیعت سے فارغ ہو کر واپس مدینہ طیبہ پہنچ گئے ہیں وہ تو ثقیفہ میں موجود ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک صحابی یہ نہیں کہتا کہ کس جھمیلے میں پڑے ہو بیعت خلافت کچھ تو ہو چکی ہے اور کچھ ہو رہی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔

۵۔ حضرت علیؓ حضور اکرمؐ کے وصال کے بعد ۱۷۸ دن ۸ گھنٹے بیعت میں مصروف رہنے کے بعد غدیر خم سے روانہ ہوتے ہیں اور مدینہ طیبہ پہنچتے ہیں تو خلافت صدیقی کے چھ ماہ گزر چکے ہیں اور حضرت علیؓ سے یہ نہ کہا کہ بیعت تو میں لیتا رہا ہوں تم کیسے خلیفہ بن گئے ہو بلکہ صدیق اکبر کی بیعت کرلی۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ۶ ماہ بعد صدیق اکبر کی بیعت کی تھی یہ عقدہ بھی علامہ حائری نے حل کر دیا۔ کہ حضرت علیؓ ۵ ماہ ۲۸ دن بعد غدیر خم سے روانہ ہوئے ۲ روز سفر میں لگ گئے ہوں گے۔ چھ ماہ بعد مدینہ منورہ پہنچتے ہی بلا چون و چرا صدیق اکبر کی بیعت کرلی۔

۶۔ حضورؐ کے وصال کے وقت حضرت علیؓ مدینہ منورہ میں موجود ہی نہ تھے کیونکہ خیمہ میں بیٹھے بیعت لے رہے تھے اس لیے حضورؐ کی تیمارداری اور تجہیز و تکفین اور حضورؐ کے جنازہ میں بھی حضرت علیؓ شریک نہ ہو سکے۔

یہ تو علامہ حائری کے بیان کا تاریخی اور واقعاتی تجزیہ ہے۔ ایک اور شیعہ مجتہد صاحب "فصل الخطاب" فرماتے ہیں کہ "اس حدیث سے خلافت علیؓ بلا فصل ثابت نہیں ہوتی"

پھر ایک اور شیعہ مجتہد صاحب "احتجاج طبرسی" اس حدیث کو حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کے بارے میں قابل قبول تسلیم نہیں کرتے۔

نبعثہ اللہ بالتعریض لا بالتصریح واثبت حجۃ اللہ تعریضا لا تصریحا بقولہ من کنت مولاہ الخ

احتجاج صفحہ ۱۳۰

اللہ تعالیٰ آپ کو تصریح کے ساتھ نہیں بلکہ تعریض سے مبعوث فرمایا اور اللہ کی حجت تعریض سے ثابت کی تصریح سے نہیں جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں علیؓ اس کے مولیٰ ہیں۔

اور صاحب استغاثہ نے یہ اصول بیان کر دیا کہ

والتبلیغ لا یکون الا بالتفسیر۔

تفسیر اور وضاحت کے بغیر تبلیغ ہو ہی نہیں سکتی۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ جس حدیث کو خلافت بلا فصل کے لیے نص کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے خود شیعہ مجتہد اور علماء اس حدیث کو خلافت بلا فصل کے لیے نہ بنیاد تسلیم کرتے ہیں نہ سند اور حجت مانتے ہیں۔

لفظ مولیٰ کی مزید تحقیق :-

لسان العرب باب ولی۔ ۱۵ : ۱۵۴

قال الزجاج الولی والمولی واحد فی کلام العرب۔

زجاج کہتے ہیں کہ کلام عرب میں ولی اور مولا مترادف ہیں منصور کہتے ہیں کہ حضورؐ کا قول ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ جس

وقال المنصور ومن هذا قول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن مولٰها ورواه بعضهم بغیر اذن ولیها لانهما بمعنی واحد وفیه قول سیدنا رسول الله صلی الله علیه وسلم من کنت مولاه فعلی مولاه ای من کنت ولیه فعلی ولیه الخ قال ابو العباس فی قوله من کنت مولاه فعلی مولاه ای من احبنی وتولانی فلیتوله والموالاة ضد المعاداة۔

عورت نے بغیر اجازت اپنے مولیٰ کے نکاح کیا اور دوسری میں ہے بغیر اذن ولی کے نکاح کیا کیونکہ دونوں لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں حضورؐ کے اس فرمان کا مطلب یہی ہے کہ جس کا میں ولی ہوں علیؓ بھی اس کا ولی ہے . . . .

ابو العباس کہتے ہیں کہ حضورؐ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جس نے مجھ سے محبت کی اور دوستی رکھی اس نے علیؓ سے دوستی رکھی اور دوستی کی ضد دشمنی ہے۔

اور تاج العروس باب الولی میں ہے :۔

”اگر ولی بمعنی اسم فاعل ہو تو بمعنی مطیع و فرمانبردار ہوگا اور اگر بمعنی اسم مفعول ہو تو بمعنی محسن و منعم ہوگا یعنی جس پر احسان یا انعام کیا گیا ہو“

لغت عرب میں ولایت بکسرہ واؤ یا بفتحہ واؤ بمعنی حکومت اور سلطنت کے نہیں آتے اور ولایت بالفتح تو ہمیشہ بمعنی نصرت آتا ہے۔ نیز لفظ مولیٰ مطلق بغیر اضافت بمعنی حاکم نہیں آتا ہاں کسی جزوی امر کی طرف اس کی اضافت ہو تو اس وقت اس کا معنی متولی ثابت ہوگا جیسے ولی المسجد مولی المسجد یا ولی بیت اللہ مگر لغت عرب میں مولیٰ بمعنی اولیٰ نہیں آتا چہ جائے کہ اولیٰ بالتصرف کے معنی لیے جائیں۔

قال تعالیٰ مأواکم النار هی مولٰکم ای مصیرکم وتحقیقه ان المولی موضع الولی وهو القرب فالمعنی ان النار هی موضعکم الذی تقربون منه وتصلون الیه وقال الکلبی والزجاج والفراء وابو عبیدة اللغوی اولی بکم وان هذا الذی قالوه معنی ولیس

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ ان کے قریب ہے یعنی ان کے پہنچنے کی جگہ ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد قرب ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے جہنم وہ جگہ ہے جس کے قریب وہ جا رہے ہیں اور اس تک پہنچ رہے ہیں کلبی زجاج فراء اور ابو عبیدہ

بتفسیر اللفظ لانه لو کان مولی واولی بمعنی واحد باللغة لصح استعمال کل واحد منهما فی مکان الاخر فکان یجب ان یصح ان یقال هذا مولی من فلان کما یقال هذا اولی من فلان ویصح ان یقال هذا اولی فلان کما یقال هذا مولی فلان ولما بطل ذلک علمنا ان الذی قالوه معنی لیس بتفسیر۔ (تفسیر کبیر ۱۹۳/۸)

لغوی کہتے ہیں مولٰکم کے معنی اولٰکم ہے اور یہ جو انہوں نے کہا ہے مفہوم کے اعتبار سے ہے لفظ مولیٰ کی تفسیر کے اعتبار سے نہیں۔ اگر لغت میں مولیٰ اور اولیٰ کے لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہوں تو ہر جگہ دونوں لفظوں کا استعمال صحیح ہوگا۔ اس لیے جب ہم کہتے ہیں کہ یہ اس سے اولیٰ ہے وہاں یہ بھی صحیح ہونا چاہیے کہ یہ اس سے مولیٰ ہے اسی طرح یہ فلاں کا مولیٰ ہے کی جگہ یہ فلاں کا اولیٰ ہے درست ہونا چاہیے اور جب ایسا کرنا باطل ہے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے مفہوم کے اعتبار سے کہا ہے لفظ کی تفسیر کے اعتبار سے نہیں کہا۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جن حضرات نے مولیٰ بمعنی اولیٰ کہا ہے انہوں نے حاصل معنی کا بیان کیا ہے لفظ کی تفسیر بیان نہیں کی ورنہ ان کا قول جمہور عرب کے خلاف ہوگا معلوم ہوا کہ اولیٰ کا صلہ تصرف بیان کرنا بالکل غلط ہے۔ بفرض محال یہ معنی تسلیم کر لیے جائیں تو اس میں کئی تغیر کرنے پڑیں گے اول مولیٰ بمعنی اولیٰ۔ پھر اولیٰ کو مقید کرنا قید تصرف سے پھر تصرف کو کسی خاص قید سے مقید کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مطلق تصرف تو محال ہے یعنی اولیٰ بالتصرف۔ بالمال یا بالجان، یا بالزوجہ یا بالبنات وغیرہ اگر تصرف مطلق ہو تو اس سے فرد کامل مراد ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تصرف کرنے میں تمام انسانوں میں ان سے حضرت علیؓ ہی اولیٰ ہیں یعنی حضرت علیؓ کو انسانوں کی جان میں مال میں بیویوں میں بیٹیوں میں دوکانوں میں مکانوں میں ہر چیز میں تصرف کرنے کا حق ہے۔ اگر تصرف مطلق مراد نہ لیں تو ظاہر ہے کہ نہیں لیا جا سکتا تو تصرف مقید بہ قید خلافت کے ہونا چاہیے یعنی اولکم بالخلافة بلا فصل من بعدی مگر اس قید سے مقید تصرف کا کہیں وجود ملتا ہے نہ

ثبوت پایا جاتا ہے۔

اصول روایت کے تحت حدیث کی تحقیق :-

قال اعلم ان ما تمسك الشيعة به على
هدم قواعد الاسلام بادعاء خلافة
علي بلا فصل ان قصة الغدير كما
هو المشهور موضوعة مكذوبة
لانه لا يخلو طريق من طرقها
من شيعي متهم بالكذب في نقل
فضل علي او كذاب او متروك
او منكر الحديث وضعيف الحديث
جدا او مجهول لا يدري من هو وما هو
فان قلت قد روى ان عليا
انشد الناس في الرحبة هل
سمع احدكم رسول الله يقول يوم غدير
من كنت مولاه الخ
اقول نعم قد روى ذلك من طرق
مختلفة والفاظ متفاوتة في
بعضها ذكر الغدير وفي بعضها
لا اثر فيها للغدير ولكن لا
يخلو طريق منها من شيعي متهم
بالكذب في رواية فضل علي او
كذاب او ضعيف او مجهول و
ان الحق مع المحدثين الذين طعنوا في

شیعہ نے قواعد اسلام کو متزلزل کرنے اور
دین اسلام کو منہدم کرنے کے لیے خلافت
بلافصل کے سلسلے میں جس دلیل سے تمسک
کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ غدیر کا قصہ
جیساکہ مشہور ہوگیا ہے موضوع اور جھوٹا
ہے۔ کیونکہ اس کی سند کے طرق سے کوئی
طریقہ ایسا نہیں جو کسی ایسے شیعہ سے خالی
ہو جو حضرت علیؓ سے روایت کرنے میں متہم
بالکذب نہ ہو یا کذاب متروک منکر الحدیث
ضعیف یا مجہول نہ ہو اگر تو کہے کہ مروی ہے
کہ رحبہ میں حضرت علیؓ نے لوگوں کو قسم دلائی
تھی کہ کیا تم میں سے کسی نے سنا کہ حضورؐ نے
غدیر کے دن فرمایا تھا من کنت مولاہ الخ
میں کہتا ہوں کہ ہاں یہ روایت کی گئی ہے
اور مختلف طرق سے اور مختلف الفاظ سے
بعض میں غدیر کا ذکر ہے بعض میں مطلق نہیں
لیکن ان میں سے کوئی طریقہ سند ایسا نہیں
جو کسی ایسے شیعہ سے خالی ہو جو حضرت علیؓ سے
روایت کرنے میں متہم بالکذب نہ ہو یا کذاب
ضعیف اور مجہول نہ ہو۔ اس لیے وہ محدثین
حق پر ہیں جنہوں نے قصۂ غدیر پر طعن کیا

قصة الغدير كالبخاري وابي حاتم وابن
ابي داؤد وابراهيم الحربي وابن حزم
وغيرهم والذين اثبتوا فقد اخطأوا
فيما زعموا والذين جعلوه متواترا
من المتأخرين الذين هم ليسوا
من ائمة النقد، فخطأهم اظهر
من ان يخفى فلا نغتر باقوال هؤلاء و
عوام من علماء الرد فضلا وعلماء اهل السنة
الذين لم يبلغوا مرتبة التنقيد بعد كالحكيم الترمذي
وامثاله من المتساهلين في الرواية والتحسين
والتصحيح۔

(تصحیح اغلاط حضرت تھانوی)

ہے مثلاً امام بخاری۔ ابی حاتم۔ ابن ابی داؤد۔
ابراہیم الحربی اور ابن حزم وغیرہ۔ جن محدثین
نے اسے ثابت کیا ہے انہوں نے اس سلسلے میں
ٹھوکر کھائی ہے جس میں انہوں نے زعم کیا ہے
اور متاخرین میں سے جنہوں نے اسے متواتر
کہا ہے وہ جرح و تعدیل کے امام نہیں ہیں
اس لیے ان کی رائے کا غلط ہونا ظاہر ہے۔
ایسے علماء کی رائے سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے
خواہ علماء شیعہ ہوں یا اہل سنت کے ان
علماء میں سے ہوں جو درجۂ تنقید تک نہیں پہنچے۔
جیساکہ حکیم ترمذی وغیرہ جو روایت حدیث اور
اس کی تحسین و تصحیح میں متساہل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حدیث من کنت مولاہ الخ کا مورد غدیر نہیں بلکہ اور ہے جس کی تفصیل
یہ ہے۔

عن ابن عباس عن بريدة قال
خرجت مع علي الى اليمن فرأيت
منه جفوة فلما رجعت شكوت الى
النبي صلى الله عليه وسلم فرفع رأسه
الي وقال يا بريدة من كنت مولاه
فعلي مولاه ان كان
قصة الغدير ثابتة
فهو في قصة بريدة و
معناه ما قلناه يعني

ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ بریدہ سے
بیان کرتے ہیں میں حضرت علیؓ کے ساتھ یمن
میں گیا۔ میں نے ان سے کچھ زیادتی دیکھی واپسی
پر میں نے حضور اکرمؐ سے ان کی شکایت کی
آپ نے میری طرف نظر اٹھائی اور فرمایا جو مجھے
درست رکھتا ہے وہ علیؓ کو بھی درست رکھتا
ہے۔ اگر غدیر کا قصہ ثابت ہو تو یہ بات
بریدہ کے واقعہ میں کہی گئی ہے اور اس کا
مطلب وہی ہے جو ہم نے کہا ہے کہ جسے مجھ

من كان يحبني فليحب عليا لاني احبه فانت تحبني فاحب عليا ولا تبغضه

سے محبت ہے اسے علیؓ سے بھی محبت کرنی چاہیے کیونکہ میں ان سے محبت کرتا ہوں جب تو مجھ سے محبت رکھتا ہے تو علیؓ سے بھی محبت رکھ اس سے بغض نہ رکھ۔

یعنی حضرت بریدہؓ نے حضرت علیؓ کے رویہ کے خلاف حضورؐ سے شکایت کی تو حضورؐ نے یہ الفاظ فرمائے۔ ایک شخصی رنجش دور کرنے کے لیے حضورؐ نے جو الفاظ فرمائے انہیں ایک بنیادی عقیدہ کی دلیل بنا لینا تکلف محض ہے۔

اب ہم اس روایت کی سند پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

علامہ ابن عقدہ نے یہ روایت سات سندوں سے نقل کی ہے۔ اور ان سات سندوں میں ایک راوی ابو اسحاق موجود ہے جو شیعہ ہے پھر سعید بن وہب اور عبیداللہ بن موسیٰ بھی ملتے ہیں یہ دونوں شیعہ ہیں۔

فالحاصل ان روایة سعيد وابی اسحاق لا يعتمد عليه من وجوه احدها ان ابا اسحاق متهم بالتشيع و ثانيها ان سعيد بن وهب لا يعتمد على روايته لانه شيعي وثالثها ان ابن عقده ساقط لانه رافضي كذاب وعبيد الله بن موسى خوقها من الشيعة۔

مختصر یہ کہ سعید اور ابو اسحاق کی روایت پر بوجوہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا اول یہ کہ ابو اسحاق پر تشیع کا اتہام ہے۔ دوم یہ سعید بن وہب شیعہ ہے اس کی روایت قابل اعتبار نہیں۔ سوم۔ ابن عقدہ ساقط رافضی کذاب ہے اور عبیداللہ بن موسیٰ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

اور امام طحاوی کی حدیث من کنت مولاہ الخ میں اخبرنی ابو اسحاق موجود ہے اور محدث عبدالرزاق شیعہ نے اس حدیث کو اخراج کیا ہے۔

واخرجه عبد الرزاق عن اسرائيل عن ابی اسحاق عن سعيد بن وهب قد رد جملة الروايات على ابی اسحاق وهو رافضي متهم۔

اب ان اسناد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

پہلی سند: اس میں یہ حدیث زید بن ارقم سے چھ سندوں سے منقول ہے۔

۱ - ما رواه عطية العوفی ثم الكوفی قال سمعت زيد ابن ارقم من كنت مولاه الخ

عطیہ کے متعلق تفصیلی بیان تحقیق فدک میں ہوگا۔

دوسری سند: ما رواه ابو عبيد عن ميمون ابی عبد الله قال قال زيد بن ارقم الخ۔

میمون ابو عبداللہ: امام شیعہ اس سے حدیث بیان نہیں کرتے تھے۔

قال احمد احاديث مناكير۔ وقال يحيى بن حصين لاشيء۔ وقال النسائي ليس بالقوی۔ وقال الحاكم ابو احمد ليس بقوی سقط حديثه۔

تیسری سند: ما روی علی بن الحسين قال حدثنا ابراهيم بن اسمعيل عن ابيه عن سلمة ... قال سمعت زيد بن ارقم الخ۔

اسمعيل بن يحيى وسلمة متروكان وابراهيم الراوی عنه ضعيف يروی احاديث مناكير فسقط هذه الطريقة۔

چوتھی سند: ما رواه ابو اسحاق السبيعي عن زيد بن ارقم اخرجه احمد بن محمد العاصمي قال حدثني الشيخ احمد بن محمد بن اسحاق ... قال اخبرنا علی بن الحسين بن علی المكی الرازی عن محمد بن كرام علی بن اسحاق قال ثنا حبيب بن حبيب اخو حمزه الزيات عن ابی اسحاق عن زيد بن ارقم۔

محمد بن کرام: فرقہ کرامیہ کا پیشوا اور مقتدا ہے۔

پانچویں سند: ما رواه سليمان الاعمش عن حبيب بن ابی ثابت عن ابی الطفيل عن زيد۔

ابو الطفیل: شیعہ رافضی تھا فلا يحتج بروايته۔

چھٹی سند میں بھی یہی ابو الطفیل موجود ہے۔

روایت کا دوسرا طریقہ براء ابن عازب سے ہے۔

روی عنه علی بن يزيد وابو هارون العبدی عن عدی بن ثابت

جرح: قال يزيد بن رابع رايته ولو احمل عنه لانه كان رافضيا وهو يروی حديث اذا رأيتم معاوية على المنبر فاقتلوه ولا شك فی كونه كاذبا وابو هارون العبدی اسوء حالا منه وعدی بن ثابت ايضا كان من كبار الشيعة فسقط حديث براء بن عازب۔

روایت کا تیسرا طریقہ سعد بن ابی وقاص سے ہے تین سندوں سے منقول ہے۔

(۱) رواہ موسیٰ بن یعقوب الزمعی عن ھاجر بن سمار عن عائشۃ بنت سعد عن ابیھا

جرح: موسیٰ ۔۔ قال ابن المدینی ضعیف الحدیث منکر الحدیث وقال النسائی لیس بالقوی

سعد ۔ ضعیف الحدیث منکر الحدیث ۔

(۲) اخرجہ الحاکم عن ابی زکریا یحیی بن محمد العنبری عن ابراھیم بن ابی طالب عن علی بن المنذر

بن فضیل عن مسلم الملائی عن خیثمہ بن عبد الرحمن عن سعد بن ابی وقاص

جرح: ۔۔ اما خیثمہ بن عبد الرحمن فکذبہ ابیین ۔

مسلم اعور ۔ متروک الحدیث ومنکر الحدیث

علی بن المنذر ۔۔ شیعی محض وکذا ابن فضیل شیعی ۔

(۳) ۔۔ رواہ احمد بن محمد العاصی بسندہ الی ابن عقدۃ عن عرفۃ بن زید بن حماد قال اخبرنا

ابی عن یحیی بن یعلی عن یحرب بن صبیح عن اخت حمید الطویل عن ابن جدعان عن سعید

بن مسیب عن سعد ابن ابی وقاص ۔

جرح: ابن عقدۃ ۔۔ شیعہ ہے وضاع ہے کذاب ہے ۔

یحییٰ بن یعلی ۔۔ وھو شیعی فسقط قصۃ غدیر فی سعد بن ابی وقاص ۔

چوتھا طریقہ ۔۔ حذیفہ بن اسید ہے ۔

رواہ عنہ ابوطفیل ۔۔ اس پر جرح گذر چکی ہے ۔

پانچواں طریقہ

اخرج ابن عقدہ عن عامر بن یعلی بن حمزۃ روایۃ طویلۃ من طریق عبد اللہ بن سنان

عن ابی الطفیل ۔ واخرج ابن عساکر عن معروف بن خربوذ عن ابی الطفیل

چھٹا طریقہ: روی بکر بن احمد العصری عن فاطمۃ بنت علی بن موسیٰ الرضا عن فاطمہ

وزینب وام کلثوم بنات جعفر بن کاظم

جرح: بکر بن احمد العصری شیعہ ہے ۔

ساتواں طریقہ: عن ابی ھریرۃ ۔ بن سندیں مطر الوراق عن شہر بن حوشب عن ابی

ھریرۃ ۔ یہ دونوں رافضی ہیں۔

معلوم ہوا کہ اصول روایت کے اعتبار سے یہ حدیث من کنت مولاہ الخ ساقط الاعتبار ہے ۔ اصول درایت کے لحاظ سے عقلی معیار پر پوری نہیں اترتی اور واقعات کے لحاظ سے جو تفصیل علامہ حائری نے دی ہے وہ حقیقت سے زیادہ خواب کی بات معلوم ہوتی ہے ۔ لہٰذا ایسی حدیث سے خلافت بلافصل کا بنیادی اور اعتقادی مسئلہ ثابت کرنا کسی طرح معقول نظر نہیں آتا۔

علماء شیعہ کی طرف سے خلافت علیؓ کے ثبوت میں چار اور احادیث بیان کی جاتی ہیں جو فتح الباری ۸ : ۱۰۶ پر یکجا بیان کی گئی ہیں ۔

(۱) ما اشاعۃ الرافضۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوصی الی علیّ بالخلافۃ وان یوفی دیونہ وقد اخرج العقیلی وغیرہ فی الضعفاء فی ترجمۃ حکیم بن جبیر من طریق عبد العزیز بن مروان عن ابی ھریرۃ عن سلمان انہ قال قلت یا رسول اللہ ان اللہ تعالیٰ لم یبعث نبیا الا بین لہ من یلی بعدہ فھل بین لک قال نعم علی ابن ابی طالب	جو بات شیعہ نے رائج کر رکھی کہ نبی کریمؐ نے اپنے بعد خلافت کی وصیت کی تھی اور یہ کہ حضرت علیؓ حضورؐ کا قرض بھی ادا کریں گے اس حدیث کو عقیلی وغیرہ محدثین نے ترجمہ حکیم بن جبیر میں درج کر کے ضعیف قرار دیا ہے ۔
(۲) عن سلمان قلت یا رسول اللہ من وصیک قال وصیی و موضع سری وخلیفتی علی اھلی وخیر من اخلفہ بعدی علی ابن ابی طالب ۔	سلمان بیان کرتا ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد آپ کا وصی کون ہوگا فرمایا ۔ علی یہ وصی ہوگا جو میرے اسرار کی جگہ ہے میرا خلیفہ ہوگا اور بہت اچھا خلیفہ ہوگا ۔
(۳) عن ابن بریدہ عن ابیہ رفعہ لکل نبی وصی وان علیا وصیی وولدی ۔	ابن بریدہ اپنے والد سے مرفوع حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اور میرا وصی علی ہے ۔
(۴) عن ابی ذر رفعہ انا خاتم النبیین و علی خاتم الاوصیاء	ابوذر رسول کریمؐ سے بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں خاتم الانبیاء ہوں

اور دعا وغیرھا ابن الجوزی فی الموضوعات۔

اور علی خاتم الاوصیاء ہیں یہ تمام حدیثیں موضوع ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ چاروں حدیثیں وضعی ہیں جھوٹی ہیں۔ اور اصولی مسئلہ کی بنیاد صرف دلیل قطعی بن سکتی ہے جو نص صریح غیر مؤدل اور اپنے مدلول پر واضح ہو۔ اس لیے خلافت بلا فصل کے لیے یا تو قرآن کی آیت ہو جیسے یداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض ایسے ہی یا علی انا جعلناک خلیفۃ من بعد محمد یا حضور اکرمؐ کی متواتر حدیث ہوا اور یہ دونوں چیزیں آج تک تو مل نہیں سکیں ممکن ہے آئندہ کوئی ڈھونڈ نکالے۔

(۳) ان چار احادیث کے علاوہ تیسرے نمبر پر ایک اور حدیث بطور دلیل پیش کی جاتی ہے اللآلی المصنوعہ ۱ : ۳۲۵ حدیث لیلۃ الجن عبد اللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں۔

کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ وفد الجن فلما انصرف فتنفس قلت ما شانک یا رسول اللہ قال نعیت الی نفسی قلت فاستخلف قال من قلت ابا بکر فسکت ثم مضی ساعۃ ثم تنفس قلت ما شانک قال نعیت الی نفسی قلت فاستخلف قال من قلت عمر نسائت ثم مضی ساعۃ ثم تنفس فقلت ما شانک قال نعیت الی نفسی قلت فاستخلف قال من قلت علی ابن ابی طالب قال اما والذی نفسی بیدہ لئن اطاعوہ لید خلن الجنۃ اجمعین۔ موضوع الحمل فیہ علی مینا مولیٰ عبد الرحمن بن عوف غال فی التشیع لیس بثقۃ۔

جس رات جنوں کا وفد آیا میں حضورؐ کے ہمراہ تھا واپسی پر حضورؐ نے ٹھنڈا سانس بھرا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا بات ہے فرمایا موت قریب معلوم ہوتی ہے میں نے عرض کیا خلیفہ مقرر فرما دیجئے فرمایا کس کو میں نے عرض کیا ابو بکر کو آپ خاموش ہو گئے پھر کچھ وقفے کے بعد ایسا ہی سانس لیا میں نے عرض کیا حضور کیا بات ہے وہی جواب ملا۔ میں نے پھر وہی بات کہی فرمایا کس کو؟ عرض کیا عمر کو پھر آپ خاموش ہو گئے پھر یہی ہوا میں نے عرض کیا علی کو فرمایا خدا کی قسم لوگ اگر اس کی اطاعت کریں گے تو وہ سب کو جنت میں لے جائے گا۔

یہ حدیث موضوع ہے اس میں علی بن مینا مولیٰ عبد الرحمن بن عوف راوی ہے جو غالی شیعہ تھا قابل اعتبار نہیں ہے۔

میزان الاعتدال میں ہے کہ وہ ساقط الاعتبار ہے۔ تنزیہہ الشریعۃ میں کذاب لکھا ہے۔

ذخیرۂ احادیث میں صحابہ کا ایک عام رویہ جا بجا ملتا ہے کہ حضورؐ کوئی بات پوچھتے تو صحابہ کہہ دیتے کہ اللہ و رسولہ اعلم۔ خواہ صحابہ کو اس سوال کا جواب معلوم بھی ہوتا وہ اپنے فہم پر اعتماد کرنے کی بجائے اللہ و رسول کے سپرد کرتے تھے۔ اس حدیث میں ابن مسعود جیسے مزاج شناس رسول حضورؐ کو پے در پے تین مرتبہ ایک اہم مشورہ دیتے ہیں اور حضورؐ کے خاموش ہو جانے سے بھی یہ اشارہ نہیں پاتے کہ مجھے خاموش رہنا چاہیے۔ حدیث کے موضوع ہونے کی ایک عقلی دلیل تو یہی معلوم ہوتی ہے۔

ابن مسعود کی دوسری روایت اسی مضمون کی ہے جس میں ہے حدثنا یحیی بن ابی الاسلمی اور ابی عبد اللہ الجدلی عن ابن مسعود ہے۔ اول الذکر کے متعلق تہذیب ۱۱ : ۲۰۴ پر ہے کہ کوفی شیعہ تھا۔ اور ثانی الذکر کے متعلق ۱۲ : ۱۴۲ پر ہے کہ صحابہ سے بغض رکھنے والا شیعہ تھا۔

اسی کتاب کے ۱ : ۳۲۶ پر ابن مسعود کی روایت یوں بیان ہوئی ہے

قال لی رسول اللہ سالت اللہ تعالیٰ ان یقدمک ثلاثا فابی علیّ الا تقدیم ابی بکر۔

میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ علی کو خلفائے ثلثہ سے پہلے خلیفہ بنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار ہوا اور خلافت صدیقؓ کی تقدیم کا حکم ہوا۔

اس روایت سے تو خلافت صدیقی کے منصوص ہونے اور ماحور من اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

(۴) ایک اور حدیث خلافت بلا فصل کی دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔

انا مدینۃ العلم وعلیّ بابھا۔

قال یحیی بن معین لا اصل له وقال البخاری انه منکر ولیس له وجه صحیح وقال الترمذی انه منکر غریب وذکره ابن الجوزی فی الموضوعات وقال الشیخ تقی الدین ابن دقیق العید هذا الحدیث لم یثبتوه وقال الذهبی فی المیزان انه موضوع وقال شمس الدین الجزری انه موضوع وقال الذهبی فی المیزان داود بن سلیمان الغازی له نسخة موضوعة عن علی بن موسی الرضا وقال ابن عساکر منکر جدا اسنادا ومتنا وکان ابو سعد اسمعیل بن المثنی الاسترابادی یعظ بدمشق فقام الیه رجل فقال ایها الشیخ ما تقول فی قول النبی صلی الله علیه وسلم انا مدینة العلم وعلی بابها قال فاطرق لحظة ثم رفع راسه وقال نعم لا نعرف هذا الحدیث علی التمام قال الجوزجانی هذا حدیث منکر مضطرب قال المؤلف والسیوطی موضوع اضطرب فیه الرواة وفی سنده فضیل ضعفه یحیی بن معین

یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں امام بخاری کہتے ہیں یہ منکر ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں امام ترمذی نے فرمایا منکر ہے غریب ہے شیخ تقی الدین نے فرمایا یہ حدیث نبی کریم سے ثابت نہیں ابن جوزی نے اسے موضوعات میں لکھا ہے امام ذہبی نے میزان میں فرمایا یہ موضوع ہے۔ ابن جزری کہتے ہیں یہ موضوع ہے امام ذہبی نے فرمایا کہ داؤد بن سلیمان غازی کا ایک نسخہ موضوعہ تھا جو اس نے علی بن موسیٰ الرضا سے لیا تھا ابن عساکر کہتے ہیں کہ سند اور متن کے اعتبار سے نہایت منکر ہے۔ ابو اسعد اسماعیل استرآبادی دمشق میں وعظ کہہ رہے تھے کہ ایک آدمی اٹھا سوال کیا کہ شیخ اس حدیث کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔

...... آپ تھوڑی دیر سر جھکائے خاموش رہے پھر کہا ہمیں یہ حدیث معلوم نہیں ہے الجوزجانی نے کہا ہے یہ حدیث منکر مضطرب ہے سیوطی کہتے ہیں کہ موضوع ہے اس کی سند میں فضیل ہے جو موضوع حدیثیں بیان کرتا تھا۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ موضوع روایات بیان کرتا تھا۔

میزان الاعتدال ۱: ۱۹۴ پر ہے ہذا موضوع

اس مضمون حدیث سے زیادہ سے زیادہ حضرت علیؓ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے خلافت بلا فصل کا تو اشارہ تک نہیں ملتا۔

۵۱) ایک اور حدیث بیان کی جاتی ہے۔

عن بریدة قال قال رسول الله ان علیا منی وانا منه وهو ولی کل مؤمن من بعدی۔

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد بھی ہر مومن کا دوست ہے۔

میزان الاعتدال ۱: ۳۰۷ پر اس حدیث کے راوی اجلح کے متعلق درج ہے۔

قال ابن عدی شیعی۔ قال الجوزجانی مفتر۔ قال الترمذی هذا حدیث غریب لا نعرفه الا من سلیمان بن جعفر۔ قال ابو حاتم لیس بالقوی وقال ضعیف

کتاب شیعہ محمد بن علی الدردبیلی ۱: ۱۵۲ پر لکھا ہے کہ شیعہ تھا۔

شیعہ راوی کی اس ضعیف حدیث سے بھی حضرت علیؓ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے خلافت بلا فصل کی دلیل بنانا تو تکلف محض ہے۔

ان تمام احادیث کی تفصیلی جرح و تعدیل مطلوب ہو تو ذیل کی کتب رجال دیکھ لیں:۔

میزان الاعتدال	ذہبی
لسان المیزان	ابن حجر
تہذیب التہذیب	ابن حجر
تنزیہ الشریعہ عن اخبار الموضوعہ۔	علامہ ابن عراق۔

حدیث قرطاس

حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کی دلیل کے طور پر ایک اور حدیث پیش کی جاتی ہے جو حدیث قرطاس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ حدیث کا متن یہ ہے:۔

عن ابن عباس قال لما حضر رسول الله صلی الله علیه وسلم وفی البیت رجال فیهم

ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ جب حضورؐ کا مرض بڑھ گیا تو گھر میں کئی آدمی تھے ان

عمر بن الخطاب قال النبی هلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ فقال عمر قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبکم کتاب اللہ .....

وفی روایۃ سلیمان بن ابی مسلم الاحول قال ابن عباس یوم الخمیس وما یوم الخمیس ثم بکی حتی بل دمعہ الحصی قلت یا ابن عباس وما یوم الخمیس قال اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ وقال ائتونی بکتف اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ ابدا فتنازعوا ولا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموہ فذھبوا یردون علیہ فقال دعونی ذرونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعوننی الیہ فامرھم بثلاث فقال اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم وسکت عن الثالثۃ او قالھا فنسیتھا

(متفق علیہ)

میں عمر فاروق بھی تھے۔ حضورؐ نے فرمایا لاؤ میں تمہیں تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے حضرت عمرؓ نے کہا آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے کتاب اللہ تمہیں کافی ہے.....

سلیمان کی روایت میں ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ آہ! جمعرات کا دن! پھر آپ اتنا روئے کہ آنسوؤں سے زمین کے کنکر تر ہوگئے۔ میں نے کہا اے ابن عباس جمعرات کے روز کیا ہوا تھا۔ کہا کہ حضورؐ کی تکلیف شدت اختیار کر گئی تو آپ نے فرمایا کوئی ٹکڑا لاؤ میں تمہیں ایسی بات لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے اس پر لوگ جھگڑنے لگے اور نبیؐ کے پاس جھگڑنا مناسب نہیں پھر حاضرین نے کہا آپ کا کیا حال ہے کیا ہم سے جدا ہو رہے ہیں؟ پوچھو تو سہی تو لوگ حضورؐ سے پوچھنے لگے۔ آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ رہنے دو میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم بلاتے ہو پھر آپ نے تین باتوں کا حکم دیا فرمایا مشرکین کو عرب سے نکال دینا۔ وفدوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو میں کیا کرتا تھا۔ تیسری بات سے خاموشی اختیار کرلی یا راوی کہتا ہے کہ میں بھول گیا۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی خاص لفظ اس طرح مرکز توجہ بن جایا کرتا ہے کہ سارے مضمون کلام کو اس ایک لفظ کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ اس طویل حدیث میں بھی ایک لفظ "اھجر" مابہ النزاع بن گیا ہے۔ مجتہدین شیعہ نے اس کا قائل حضرت عمرؓ کو قرار دیا ہے۔ اور اس لفظ کی نسبت حضورؐ کی طرف کرنا توہین رسول ہے۔ گویا حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لیے اس ایک لفظ سے خوب کام لیا گیا ہے لہٰذا اس لفظ پر تفصیلی بحث کرنا ضروری ہے۔

(۱) لفظ ہجر کی تحقیق:-

ھجر یھجر باب نصر ینصر پر متعدی اور لازم دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ متعدی ہو تو ہجران سے مشتق ہے جس کے معنی "کسی کو چھوڑنا" آتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً واھجرھم ھجرا جمیلا یا واھجرنی ملیا یا انی ھاجر الی ربی کسی سے کلام ترک کرنا یا وطن چھوڑنا کے معنوں میں آتا ہے حدیث بالا میں یہی معنی موزوں ہیں۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرض موت میں تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں دنیا فانی کو ترک کرنا چاہتے ہیں ہمیں داغ مفارقت دینا چاہتے ہیں اس لیے فقالوا اھجر کے ساتھ استفھموہ بھی ہے یعنی پوچھو کیا ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں یہ پوچھنا اس وجہ سے ہوسکتا تھا کہ قرینہ کتابت کا موجود تھا۔

اگر ھجر لازمی معنوں میں استعمال ہو تو "فی" کے ساتھ ہوتا ہے جیسے اھجر فی نومہ او فی مرضہ المنجد میں یہی دو مثالیں دی گئی ہیں ھجر فی نومہ او فی مرضہ مگر حدیث بالا میں یہ لفظ "فی" کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں یہ لفظ پہلے معنوں میں یعنی ہجران یا ترک کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے اور فتح الباری ۸: ۹۳ پر ہے۔

ان قولہ اھجر الراجح فیہ اثبات ھمزۃ الاستفھام وبفتحات علی انہ فعل ماض

اھجر میں راجح بات ہمزۂ استفہام ثابت کرنا ہے ساتھ فتحات کے اس لیے کہ یہ ماضی ہے۔

ان قال ھجر۔

والھجر بالضم ثم السکون۔ الھذیان

ھجر بضمہ بمعنی ہذیان ہے اس سے مراد

والمراد به ما يقع هنا من كلام المريض الذى لا ينتظم كلامه ولا يعتد به لعدم فائدة و وقوع ذلك من النبى ممتنع لانه معصوم فى صحته و مرضه الى ان قال ويحتمل ان بعضهم قال ذلك عن شك عرض له و لكن يبعده ان لا ينكره الباقون عليه مع كونهم من كبار الصحابه ولو انكروه لنقل۔

ہے مریض کے کلام میں جو واقع ہوتا ہے اس میں نظم نہیں رہتا لہٰذا اسکی کلام غیر معتد بہ ہوتی ہے اور حضورؐ سے اس کا وقوع محال ہے کیونکہ آپ صحت و مرض دونوں حالتوں میں معصوم ہیں۔ اور اس بات کا احتمال جو بعض نے کہا ہے وہ شک سے ہے جو اسے پیش ہوا لیکن یہ امر حضورؐ سے بعید ہے اور باقی لوگوں نے اس کا انکار نہیں کیا حالانکہ وہ کبار صحابہ تھے اگر ایسا ہوتا تو وہ نقل ہو کر ہم تک پہنچتا۔

اسی طرح امام نووی شارح مسلم نے ۲ : ۴۲ پر لفظ ھجر کی تردید فرمائی ہے۔ کہ اس کی نسبت رسول کریمؐ کی طرف کرنا محال ہے کیونکہ آپ معصوم ہیں۔

اسی طرح ایک شیعہ عالم صاحب ملک النجات نے ۱ : ۳۱۸ پر تسلیم کیا ہے۔

يحتمل ان يكون قوله اَهَجَرَ فعلا ماضيا من الهجر بفتح الهاء وسكون الجيم والمفعول محذوف اى الحياة۔ وذكره بلفظ الماضى مبالغة لما رأى علامات الموت۔

اور احتمال ہے کہ قائل کا قول اَھجَر فعل ماضی ہو ھجر سے اور مفعول محذوف ہو یعنی حیات کو چھوڑ رہے ہیں اور ماضی سے اس کا ذکر بطور مبالغہ ہو جبکہ اس نے موت کی علامات دیکھی ہوں۔

ثابت ہوا کہ ھجر صیغہ ماضی کا ہے جس کے معنی چھوڑنا ہے یہاں مراد حیات کا چھوڑنا ہے فقالو اھجر میں جس شخص نے اس لفظ کی نسبت حضورؐ سے کی ہے اس نے ھجر صیغہ ماضی کا بولا ہے۔ ھجر بمعنی ہذیان کے نہیں۔ یہ احتمال بھی بعد والوں کو پیش آئے ورنہ صحابہ میں سے کوئی فرد بھی نہیں ملتا جس نے کہا ہو کہ ھجر بضمہ استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ ھجر یھجر باب نصر ینصر سے متعدی اور لازم دونوں طرح آتا ہے اور ظاہر ہے کہ فعل متعدی سے وقوع فعل مقصود ہوتا ہے کسی چیز پر اور فعل لازم سے صرف فاعل سے صدور فعل مقصود ہوتا ہے۔ متعدی کے معنی ہوں گے

چھوڑ جانا حیات کا، صحابہ کا، یا دنیا کا اور لازمی کی صورت میں معنی ہوں گے کہ مریض کلام کر رہا ہے اور اس کے منہ سے صدور ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ پہلے معنی موقع اور محل کے مناسب ہیں معنی ثانی کے لیے فی کے ساتھ استعمال ہونا ضروری ہے اور وہ یہاں موجود نہیں اس لیے دوسرے معنی مراد نہیں لیے جا سکتے۔

ایک سوال۔ اس موقع پر حاضرین کون تھے؟

حدیث مذکورہ بالا میں صرف اتنا ملتا ہے کہ وفیہ رجال۔ ایک جگہ اس کی تفصیل ملتی ہے شیعہ کی بنیادی کتاب۔ کتاب سلیم بن قیس ھلالی ص ۱۸۶ پر بیان ہوا ہے کہ ابن عباس نے حضورؐ کی موت کا ذکر کیا اور رو دئے پھر فرمایا

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين وهو اليوم الذى قبض فيه وحوله اهل بيته وثلاثون رجلا من اصحابه ايتونى بكتف اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده۔

حضورؐ نے پیر کے دن فرمایا (یہ وہ دن ہے جس میں آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس وقت آپ کے گرد اہل بیت تھے اور تیس صحابہ تھے کہ ایک ٹکڑا لاؤ میں تمہیں کچھ لکھ دوں کہ میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔

شیعہ راوی نے بیان کیا ہے کہ اس موقع پر اہل بیت کے علاوہ ۳۰ صحابی موجود تھے۔ اصل روایت میں ہے فقالوا اھجر۔ اگر قائل بقول شیعہ حضرت عمر تھے تو موقع کے گواہ ابن عباس یا ان ۳۰ صحابہ میں سے کسی ایک شخص کی زبانی صحیح روایت موجود ہونی چاہیے کہ اس کے قائل حضرت عمر ہیں۔ مگر ایسی کوئی روایت نہیں ملتی لہٰذا بعد والوں کی باتیں اتہام سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوسرا سوال۔ اس لفظ کا قائل کون ہے؟

یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں کہ اس قول کے قائل حضرت عمر ہیں مگر اس کا قائل تلاش کرنا بھی کوئی غیر ضروری چیز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر اہل بیت اور صحابہ کی جو جماعت موجود تھی اس کے دو گروہ ہو گئے ایک جماعت لکھانے کے حق میں تھی دوسری مانع۔ مانعین میں سرفہرست حضرت عمر کا نام آتا ہے۔ اور یہ لفظ ان لوگوں کی زبان سے نکلا جو لکھانے کے حق میں تھی۔ لہٰذا حضرت عمر تو تحقیق

کے پہلے مرحلے پر ہی بری الذمہ ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ فتح الباری ۸ : ۹۴

منهم من يقول قربوا يكتب لكم ما سئبان بعضهم كان مصمما على الامتثال والرد على من امتنع منهم۔

ان میں سے بعض نے کہا قریب کرو کہ تمہارے لیے لکھیں بعض اس حکم کے بجالانے پر مصر تھے اور منع کرنے والوں کی تردید کرتے تھے (یعنی فاروق وغیرہ کی تردید کرتے تھے کہ تم کیوں روکتے ہو)

اور ص۹۳ پر ہے

واذا عرف ذلك فانما قاله (لفظ هجر) من قاله منكرا على من توقف فی امتثال امره باحضار الكتف والدواة فكانه قال كيف تتوقف اتظن انه صلى الله عليه وسلم كغيره يقول الهذيان فی مرضه۔ امتثل امره واحضره ما طلب فانه لا يقول الا الحق۔

یہ ظاہر ہوگیا کہ ھجر کا قائل ان لوگوں میں سے تھا جو توقف کرنے والوں کی مخالفت کر رہا تھا۔ گویا اس نے کہا کیسے توقف کرتے ہو کیا تمہارا خیال ہے کہ حضورؐ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہیں اپنے مرض میں ہذیان کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا حکم بجالاؤ۔ اور جو کچھ انھوں نے طلب فرمایا ہے حاضر کرو کیونکہ حضورؐ تو حق کے بغیر کچھ نہیں کہتے۔

اور اشعۃ اللمعات میں ہے

یعنی چرا منع کنید از نوشتن۔ خیال میکنید کہ
مختلط شدہ است کلام۔ ایں اعتقاد بحضرت
او نتواں کرد۔ (۴ : ۶۱۰)

اور امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا

انما جاء هذا عن قائله استفهاما للانكار على من قال لا تكتبوا اى لا تتركوا امر رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا تجعلوه

ھجر کا لفظ اس کا قول ہے جس نے لکھنے سے انکار کرنے والے شخص سے یہ کہا تھا یعنی اس نے کہا تھا کہ حضورؐ کے حکم کو نہ چھوڑو اور حضورؐ کی بات کو اس شخص کی بات کی مانند نہ سمجھو

كامر من هجر فی كلامه لانه صلى الله عليه وسلم لا يهجر (۲ : ۴۳)

جس کے کلام میں اختلاط ہوتا ہے کیونکہ حضورؐ کے کلام میں اختلاط نہیں ہوسکتا۔

محدثین نے واضح کر دیا کہ لفظ ھجر بولنے والی جماعت وہ تھی جو فاروق اعظم کی رائے کی مخالف تھی کیونکہ حضرت عمر لکھنے میں مانع تھے اس لیے کہ حضورؐ کو تکلیف ہوگی انہیں حضورؐ کا آرام مطلوب تھا۔ مگر لکھانے والی جماعت کلام رسول کی اہمیت کے پیش نظر مصر تھی کہ حضورؐ کی کلام ترک نہ کی جائے۔ اور حضورؐ کی کلام کو عام بیماروں کی کلام پر قیاس نہ کیا جائے اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ لفظ ھجر ہمزہ استفہام انکاری کے ساتھ استعمال ہوا ہے اگر کسی روایت میں ہمزہ مذکور نہ ہو تو اسے مقدر مانا جائے گا جیسا کہ صاحب لمعات فرماتے ہیں۔

وکلام محمول بر استفہام انکاری است واگر در بعض
روایات حرف استفہام مذکور نہ باشد مقدر است
فافہم (۴ : ۶۱۰)

اور فتح الباری میں ہے

فقالوا ما شأنه اهجر استفهموه فذهبوا
يردون عليه بهمزة لجميع رواة البخاری
...... وحاصله ان قوله هجر الراجح فيه
اثبات همزة الاستفهام (۸ : ۹۳)

معلوم ہوا کہ روایت میں لفظ ھجر ہمزۂ استفہام انکاری کے ساتھ مذکور ہے اور یہ لفظ لازماً اس جماعت کی زبان سے نکلا جو لکھانے کے حق میں تھی اور ذکر ہو چکا ہے کہ یہ متعدی آیا ہے اور اس کا معنی چھوڑنا ہے اور اس کا قرینہ خود جملہ استفہموہ ہے یعنی ذرا پوچھو تو سہی کیا ہمیں داغ مفارقت تو نہیں دینا چاہتے اگر صحابہ نے کلام بے ارادہ بھی ہوتی تو صاف کہہ دیتے چھوڑو مریضوں سے ایسی باتیں حالت غشی میں ہوتی رہتی ہیں استفہموہ نہ کہتے۔

روایت میں حسبنا کتاب اللہ کا جملہ حضرت عمر کی زبان سے بیان ہوا ہے۔ اگر یہ لفظ یعنی اھجر بھی حضرت عمر کی زبان سے نکلتا تو کوئی وجہ نہیں کہ راوی اسے بیان نہ کرتا۔ اور وہ نقل ہو

کہ ہم تک نہ پہنچتا۔ لہٰذا حضرت عمر کی زبان سے یہ لفظ ثابت کرنا اتنا ہی محال ہے جتنا کسی ذریعہ کے بغیر آسمان پر چڑھنا محال ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے قریباً ۰۰ ، سال سے کوشش ہو رہی ہے عراق، ایران نجف اشرف ہندوستان بالخصوص لکھنؤ بلکہ دنیا بھر کے چوٹی کے شیعہ علماء کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح اس بات کا ٹھوس ثبوت مل جائے کہ لفظ اہجر حضرت عمر کی زبان سے نکلا لیکن بجز ایک سہارا ملا کہ سرالعالمین میں امام غزالی نے یہ کہا ہے۔ مگر یہ بھی کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ کچھ نہیں۔ شیعہ محدث الجزائری اعتراف کرتے ہیں کہ یہ امام غزالی کی تصنیف نہیں۔

نسب الکتاب الذی یسمی بسر العالمین وزکر

بعضہم کون الکتاب لہ (انوار نعمانیہ ۱: ۱۲۴)

جب یہ امام غزالی کی تصنیف ہی نہیں تو سند کیونکر بنی۔ اور اگر محدث الجزائری کے اعتراف کے باوجود یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ امام غزالی کی تصنیف ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اتنے بڑے مسئلہ میں چھٹی صدی کے صرف ایک عالم کی رائے جس کا تعلق عقلی تحقیق سے نہیں بلکہ تاریخی واقعہ سے ہو کو قول فیصل تسلیم کر لیا جائے اس کے ثبوت میں صحیح حدیث پیش کرنی چاہیے۔ اقوال علماء کو حدیث رسولؐ کے مقابلے میں پیش کرنا یا تو نری جہالت ہے یا جرأت رندانہ بہرحال اس بات کا امکان تو ہے کہ یہ کوشش مزید جاری رہے مگر یہ ممکن نہیں کہ اس بات کا کوئی حتمی ثبوت مل جائے کہ اہجر کا لفظ حضرت عمر کی زبان سے نکلا۔

حضرت عمر کا یہ کہنا کہ حسبکم کتاب اللہ ان کے مناقب میں شمار ہونے کے لائق ہے مگر نا سمجھ لوگ اسے ان کے معائب میں شمار کرتے ہیں۔ جیسا کہ فتح الباری میں مذکور ہے۔

وقد عد ہذا من موافقات عمر (۱: ۱۵۰)

اور اتفق العلماء علی ان قول عمر حسبنا کتاب اللہ من قوۃ فقہہ ودقیق نظرہ (۸: ۹۴)

تیسرا سوال ۔ حضورؐ کیا لکھانا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں مختلف رائیں بیان ہوئی ہیں مثلاً

(۱) فتح الباری ۸: ۹۵

قال الداؤدی وصیت بالقران وبہ حزم ابن التین۔

داؤدی کہتے ہیں کہ قرآن کے متعلق وصیت لکھوانا چاہتے تھے ابن التین کا خیال بھی یہی ہے۔

اس وجہ سے حضرت عمر کا قول موافقات عمر میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

(۲) شرح مسلم ۲: ۴۲

انہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یکتب استخلاف ابی بکر ثم ترک ذلک اعتمادا علی ما علمہ من تقدیر اللہ تعالیٰ ذلک کما ھم الکتاب فی اول مرضہ حین قال وا راساہ ثم ترک الکتاب وقال یابی اللہ والمؤمنون الا ابابکر ثم نبہ امتہ علی استخلاف ابوبکر بتقدیمہ ایاہ فی الصلوۃ۔

حضورؐ نے حضرت ابوبکر کی خلافت کی تحریر کا ارادہ فرمایا پھر اس امر پر اعتماد کرتے ہوئے جو آپ تقدیر الٰہی سے معلوم کر چکے تھے ارادہ ترک کر دیا جیسا کہ آپ نے اول مرض میں لکھانے کا قصد کیا تھا جب فرمایا تھا وا راساہ پھر ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا اللہ انکار کر دے گا اور مومن بھی۔ ابوبکر کے بغیر کسی کی خلافت قبول نہ کریں گے پھر ابوبکر کو نماز میں امام بنا کر حضورؐ نے ابوبکر کی خلافت کی عملاً تبلیغ فرما دی۔

یعنی دوسری رائے یہ ہے کہ حضور اکرمؐ چاہتے تھے کہ ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھا دیں یہ رائے معقول اور وزنی معلوم ہوتی ہے :-

(ا) حضورؐ جو تحریر میں لانا چاہتے تھے وہ عمل میں لا کے دکھا دیا کہ حضرت ابوبکرؓ کو مسجد نبوی میں اپنا قائم مقام بنا دیا۔ نماز اسلام کا پہلا رکن ہے اور اسلام اور غیر اسلام میں مابہ الامتیاز ہے اس لیے اس رکن کی ادائیگی میں حضرت ابوبکرؓ کو قیادت کے فرائض سونپنا دراصل ان کی خلافت کا فرمان تھا۔

(ب) اگر اس کے بغیر کوئی اور چیز ہوتی تو حضورؐ بعد میں لکھوا دیتے کیونکہ حضورؐ اس واقعہ کے بعد دو روز اس دنیا میں موجود رہے جیسا کہ درت النجفیہ میں لکھا ہے۔

والصحیح عندی وھو الاکثر والاشہر انہ لم تکن

میرے نزدیک صحیح بات وہی ہے جو اکثر مشہور

آخر الصلوٰۃ فی حیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم بالناس جماعۃ وان ابابکر صلے بالناس بعد ذلک یومین ثم مات (ص ۲۲۴)

ہے کہ حضورؐ کی یہ آخری با جماعت نماز نہیں تھی بلکہ ابوبکرؓ نے اس کے بعد دو دن نماز پڑھائی پھر حضورؐ وصال فرما گئے۔

(۳) مسند احمد طبع مصر ۱: ۹۰

عن علی ابن ابی طالب قال امرنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبق یکتب منہ ما لا تضل امتہ من بعدہ قال فخشیت ان تفوتنی نفسہ قال قلت انی احفظ واعی قال اوصی بالصلوٰۃ والزکاۃ وما ملکت ایمانکم۔

حضرت علی فرماتے ہیں حضورؐ نے مجھے قلم دوات لانے کا حکم دیا تاکہ ایسی چیز لکھائیں کہ آپ کے بعد امت گمراہ نہ ہو۔ مجھے خدشہ ہوا کہ حضورؐ کی صحبت سے محروم نہ ہو جاؤں اس لیے میں نے عرض کیا آپ فرمائیں میں خوب یاد رکھوں گا حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے نماز زکوٰۃ اور غلاموں کے بارے میں وصیت فرمائی۔

اس روایت سے کئی امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) حضور اکرمؐ نے حضرت علی کو قلم دوات لانے کا حکم دیا۔

(۲) حضرت علی نہ اٹھے اور نہ لائے۔ اس خیال سے کہ انہیں حضورؐ کے پاس سے اٹھ جانا گوارا نہ تھا۔

(۳) حضرت علی نے عرض کیا آپ فرمائیں میں یاد رکھوں گا۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ حضورؐ کا ارادہ حکم الٰہی سے ہے لہٰذا اسے عمل میں آکر رہنا ہے صورت خواہ کوئی ہو۔

(۴) حضرت علی کا خیال ٹھیک ثابت ہوا کہ حضورؐ جو کچھ لکھانا چاہتے تھے وہ آپ نے فرما دیا اور حضرت علی نے یاد بھی رکھا اور امت کو پہنچا بھی دیا۔

(۵) اصل حدیث میں جو تیسری چیز رہ گئی تھی کہ تمسکت عن اقبالۃ وہ بھی معلوم ہو گئی۔

(۶) حضورؐ نے اس وصیت میں سرفہرست نماز کو رکھا اور نماز کی قیادت حضرت ابوبکرؓ کو سونپی اس روایت سے رائے ۲ کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔

(۷) اگر حضرت عمر کے متعلق یہ کہا جائے کہ قلم دوات لانے میں مانع ہوئے اور حسبکم کتاب اللہ کہہ دیا تو حضرت علی کے متعلق بھی یہ کہنا درست ہے کہ قلم دوات لانے کو نہ اٹھے اور عرض کر دیا آپ فرمائیں میں یاد رکھوں گا۔ ان دونوں حضرات کے اس عمل کا محرک ایک ہی جذبہ تھا۔ محبت رسول ایک نے اپنے محبوب کو تکلیف دینا گوارا نہ کیا دوسرے نے اپنے محبوب کے پاس سے چند لمحوں کے لیے غیر حاضر رہنا گوارا نہ کیا۔ مجرم دونوں تھے مگر جرم محبت کے مجرم اور بس۔

ان کے علاوہ ایک رائے وہ ہے جو شیعہ علماء کی طرف سے پیش کی جاتی ہے کہ حضرت علی خلافت کا حکم لکھوانا چاہتے تھے۔

اس رائے پر کئی ایک عقلی اور تاریخی اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) جب حضرت علی کو حضورؐ نے حکم دیا تو وہ قلم دوات کیوں نہ لائے۔ اگر وہاں موجود نہ ہوتے تو خیر کوئی بات تھی مگر جب اہل بیت موجود ہیں آپ کو حکم دیا جاتا ہے آپ تعمیل نہیں کرتے۔

(۲) حضورؐ نے حضرت علی سے جو باتیں فرمائیں انھوں نے بیان کر دیں ان میں خلافت کا ذکر نہیں۔

(۳) اس واقعہ کے بعد جب حضورؐ دو روز تک صحابہ میں موجود رہے تو حضورؐ نے حضرت علی کو کیوں نہ وہ تحریر دے دی یا حضرت علی نے کیوں نہ لکھوا لیا۔

(۴) ابھی دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ غدیر کے موقعہ پر بقول شیعہ حضرت علی کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور بقول علامہ حائری ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ فرداً فرداً حضرت علی کے خیمہ میں جا کر بیعت کرتے رہے اور اس میں کئی مہینے صرف ہونے کا امکان ہے جس کا تفصیلی بیان گزر چکا ہے تو اس عملی مظاہرہ خلافت کے بعد خلافت کا فرمان لکھوانے کا مطلب کیا ہے کیا دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ عمل پہلے ہو اور اس کا حکم بعد میں دیا جائے۔ ہوتا یوں ہے کہ حکم پہلے ملتا ہے اس پر عمل بعد میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔ اگر اس لکھانے کا مقصد یہ تھا کہ یہ عملی بیعت ناکافی ہے۔ اس لیے مزید استحکام کے لیے تحریر بھی ہونی چاہیے۔ تو یہ بات صحابہ کرام کا مقام نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے جو نبی کریمؐ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ پر جان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔

(۵) شیعہ کے نزدیک امام معصوم ما کان وما یکون کا عالم ہوتا ہے اور حضرت علی امام اول ہیں۔

انہیں یہ علم تھا کہ حضورؐ کے بعد انہیں خلافت نہ ملنا مقدر ہو چکا ہے پھر لکھانا کیوں چاہتے تھے۔

اس پر جتنا غور کیا جائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی ذاتی طور پر اپنے علم کی بنا پر خلافت نہ ملنے کے خدائی فیصلہ سے مطمئن تھے مگر انہیں یہ بھی علم تھا کہ انہیں ایسے محبان ذی شان بھی ملیں ملیں گے جو انہیں خدائی فیصلہ کے خلاف عمل کرنے پر اکسائیں گے اس لیے حضورؐ سے یہ لکھوانا چاہتے تھے کہ خدائی فیصلہ یہ ہے کہ خلیفہ ابو بکر ہوں گے تاکہ محبان کو دکھا سکیں کہ دیکھو حضورؐ نے لکھ دیا ہے اس لیے میں خلافت کی آرزو کرتا ہوں۔ نہ اس کیلئے کوئی کوشش کروں گا۔

کتاب سلیم بن قیس ہلالی میں حضورؐ کی وفات کا منظر یوں بیان ہوا ہے۔

ابان عن سلیمان قال سمعت علیا یقول عهد الی رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم توفی وقد استندته الی صدری ورأسه عند اذنی۔ ص ۲۰۴	ابان روایت کرتا ہے سلیمان سے وہ کہتا ہے میں نے حضرت علی سے سنا کہ حضورؐ نے میرے ساتھ عہد کیا جس روز آپ نے وفات پائی اور حضورؐ نے میرے سینہ سے تکیہ لگا رکھا تھا اور آپکا سر میرے کانوں سے لگا ہوا تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ بقول شیعہ حضورؐ کی وفات حضرت علی کی گود میں ہوئی گو یہ بات امر واقعہ کے اعتبار سے غلط ہے مگر اس میں اس امر کا اعتراف موجود ہے کہ حضرت علی وہاں موجود تھے۔

۶۔ شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے جو کچھ لکھانا تھا لکھا لیا تھا جیسا کہ مولوی حامد حسین نے استقصاء الافہام ۱: ۵۵۳ پر کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے نقل کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح فلک النجاۃ ۱: ۳۲۲ بحوالہ کتاب سلیم بن قیس لکھا ہے اور احتجاج طبرسی ص۶۶ پر اسی کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے۔ مگر کتاب سلیم بن قیس ہلالی اس وقت میرے سامنے ہے اس میں واقعہ قرطاس تین جگہ مذکور ہوا ہے۔

(۱) ابان راوی سلیم سے بیان کرتا ہے کہ رسول خداؐ نے قلم دوات طلب کی تو اہل بیت اور صحابہ میں اختلاف ہو گیا تو آپ نے فرمایا

وقال انی لارا کم تختلفون وانا حی فکیف بعد موتی فترك الكتف۔ ص ۱۸۶	حضورؐ نے فرمایا میری زندگی میں میرے سامنے اختلاف کرتے ہو تو میرے بعد کیا ہو گا۔ پھر آپ نے لکھوانے کا خیال چھوڑ دیا۔

صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ نے اختلاف دیکھ کر لکھنے کا ارادہ ترک فرما دیا۔

(۲) قال ابان قال سلیم سمعت ابن عباس یقول سمعت من علی حدیثا لم ادری ما وجهه سمعته یقول ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اسر الی فی مرضه وعلمنی مفتاح الف باب من العلم یفتح کل باب الف باب ص ۱۸۹	سلیم نے کہا میں نے ابن عباس سے سنا وہ فرماتے تھے میں نے حضرت علی سے ایک حدیث سنی اس کی وجہ میں نہیں جانتا انہوں نے فرمایا حضورؐ نے اپنے مرض میں کچھ امور پوشیدہ طور پر مجھے بتائے مجھے ایک کنجی علم کے ہزار دروازے کھولنے کی فرمائی جس سے آگے کئی ہزار دروازے کھلتے ہیں۔
(۳) قال علی قد شهدت رسول الله صلی الله علیه وسلم حین دعا بالكتف لیکتب فیها ما لا تضل الامة ... فانکم لما خرجتم اخبرنی بالذی اراد ان یکتب فیها ویشهد علیها العامة فاخبره جبرئیل ان الله عزوجل قد علم من الامة الاختلاف والفرقة ثم دعا بصحیفة فاملی علی ما اراد یکتب فی الكتف۔	حضرت علی نے فرمایا کہ جب حضورؐ نے قلم دوات طلب کی تو میں حاضر تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس تم (اہل بیت اور صحابہ) جب وہاں سے نکل نکل گئے تو حضورؐ نے مجھے وہ چیز بتائی جس کے لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اور عوام کو گواہ بنانا چاہتے تھے پھر جبرئیل نے آپ کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ امت کے اختلاف کو جان چکا ہے پھر حضورؐ نے ایک صحیفہ منگایا اور میرے سامنے پڑھا جسے لکھانے کا ارادہ تھا۔

کتاب سلیم کی ان تین روایات میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ حضرت علی جو کچھ لکھانا چاہتے تھے لکھا لیا یا خلافت کا فرمان لے لیا۔ زیادہ سے زیادہ جو بات روایت ۳ میں ملتی ہے یہ ہے کہ حضورؐ نے ایک صحیفہ منگوایا اور اس سے پڑھ کر سنایا جو لکھانے کا ارادہ تھا۔ اتنے اشارے سے یہی تبادر ہوتا

ہونا ہے کہ کوئی ایسی پرائیویٹ بات تھی جس کا تعلق حضرت علی کی ذات سے تھا اور جسے حضرت علی نے ظاہر نہیں کیا اور خلافت کا معاملہ تو پرائیویٹ نہیں بلکہ امت کا معاملہ ہے اس لیے ضروری تھا کہ حضرت علی بیان کرتے کہ حضورؐ نے ان الفاظ میں میری خلافت کے معاملہ کا فرمان لکھوایا ہے ۔ تاکہ وہ سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ۔ جسے حضرت علی نے ظاہر نہیں کیا وہ ان کی کوئی ذاتی اور خفیہ بات ہی ہو سکتی ہے ۔ خلافت کا فرمان تو مشتہر کرنے کی چیز ہے چھپانے کی نہیں ۔

ان میں تین روایات پیش کرنے کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ صاحب فلک النجاۃ نے کتاب سلیم کے حوالہ سے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضورؐ نے ائمہ کی تصریح بھی کر دی تھی اور یہاں اس کا کوئی نشان نہیں ۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب فلک النجاۃ نے کتاب سلیم دیکھی ہی نہیں یا اپنی بات کو وزنی بنانے کے لیے کتاب کا حوالہ تقیہ کے طور پر دے دیا ۔

مذکورہ بالا روایت ۳؎ میں ایک پہلے سے لکھے ہوئے صحیفہ کا ذکر ہے غالباً یہ وہی صحیفہ ہو گا جس میں ولایت کا ذکر ہے جو اصول کافی باب الکتمان میں درج ہوئی ہے ۔

ولایۃ اللہ اسرھا الی جبرئیل واسرھا جبرئیل الی محمد واسرھا محمد الی علی واسرھا علی الی من شاء ثم انتم تذیعون ۔	ولایت ایک راز ہے جو اللہ نے جبریل کو بتایا جبرئیل نے محمد کو بتایا اور محمدؐ نے علی کو بتایا اور علی نے وہ راز جسے چاہا بتایا مگر تم لوگ اسے پھیلاتے پھرتے ہو ۔

یا وہ صحیفہ ہو جس میں بارہ اماموں کے نام لکھے ہوئے تھے ۔ بہرحال ان دونوں میں سے جو بھی ہو اس کا تعلق خلافت سے نہیں یہ کوئی ایسا راز ہے جو پوشیدہ رکھا گیا اور پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کی گئی اس لیے ان نادانوں سے گلہ ہے جنہوں نے اسے راز نہیں رہنے دیا ۔ اور وہ راز کی بات ولایت ہے خلافت نہیں ۔

نیز اس روایت میں صرف املا کا ذکر ہے لکھنے یا نہ لکھنے کا ذکر نہیں البتہ روایت ۱؎ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کچھ نہیں لکھا گیا فترک الکتف بات صاف ہو گئی کہ لکھنے لکھانے کی نوبت ہی نہیں آئی لہٰذا یہ رائے کہ حضرت علی نے جو لکھانا تھا لکھا لیا محض دعوے بے دلیل ہے ۔

کتاب سلیم بن قیس ہلالی کی تاریخی اور دینی حیثیت

شیعہ کے ہاں یہ کتاب کئی اعتبار سے نہایت اہم سمجھی جاتی ہے ۔

اوّل :۔ اس کا راوی حضرت علی کی شاگردی کا دعویٰ کرتا ہے ۔

دوم :۔ شیعہ لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے ۔

سوم :۔ تمام شیعہ محدثین اور فقہاء اصول دین میں اسی کو حجت قرار دیتے ہیں اس لیے اس کتاب کے متعلق تفصیلی واقفیت ہونا ضروری ہے ۔

تاریخی حیثیت :۔ سلیم بن قیس کے متعلق فہرست ابن الندیم میں لکھا ہے

"حجاج بن یوسف کے خوف سے بھاگ کر اس شخص نے ابان بن ابی عیاش کے ہاں پناہ لی اور عمر بھر چھپا رہا ۔ ابان کے پاس ہی اس کی وفات ہوئی مرتے وقت یہ کتاب اس نے ابان کو دی ۔ اس کتاب کا واحد راوی ابان ہے ۔ سارے دین شیعہ کا مدار ابان کی روایت پر ہے" (ص۳۲۱)

اور کتاب سلیم کے مقدمہ میں لکھا ہے ۔

من اصحاب امیر المؤمنین علی علیہ السلام سلیم بن قیس الہلالی ۔ وکان ھاربا من الحجاج لانہ طلبہ لیقتلہ فلجا الی ابان بن ابی عیاش فاواہ فلما حضرتہ الوفاۃ قال لابان ان ذلک علی حقا وحضرتنی الوفاۃ یا ابن اخی انہ کان من امر رسول اللہ کیت وکیت واعطاہ کتابا وھو کتاب سلیم بن قیس الہلالی المشہور رواہ عنہ ابان ابن عیاش لم یروہ احد عنہ غیرہ . . . . واول کتاب ظہر للشیعۃ کتاب سلیم ۔	سلیم بن قیس حضرت علی کے اصحاب میں سے تھا حجاج بن یوسف اس کے قتل کے درپے تھا اس لیے وہ بھاگ گیا اور ابان بن ابی عیاش کے ہاں پناہ لی جب اس کی موت کا وقت آیا تو ابان سے کہا میرے بھتیجے موت قریب ہے مجھ پر ایک حق ہے کہ حضورؐ کے یہ احکام ہیں ۔ پھر ابان کو ایک کتاب دی وہ کتاب سلیم بن قیس ہلالی کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کو صرف ابان نے روایت کیا ہے اس کے بغیر اس کا کوئی راوی نہیں سب سے پہلی کتاب جو شیعوں کے لیے ظاہر ہوئی وہ یہی کتاب سلیم ہے ۔

سلیم کا حضرت علی سے براہ راست فیض حاصل کرنا اس کتاب کی تاریخی حیثیت کو واضح کر دیتا ہے۔ جہاں تک اس کے دینی مقام کا تعلق ہے پہلی بات قابل توجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا راوی صرف ابان ہے جیسا کہ ابن الندیم نے وضاحت کر دی ہے۔

اسی طرح سید علی بن احمد عقیقی اور دیگر علماء شیعہ نے بھی تائید کی ہے کہ کتاب سلیم صرف ابان ہی روایت کرتا ہے۔

اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۲ پر درج ہے۔

كتاب سليم باسانيد متعددة ينتهي اكثرها الى ابان بن ابي عياش فيروز الذي ناوله سليم الكتاب واوصاه به قرب موته۔	کتاب سلیم متعدد سندوں کے ساتھ منقول ہے اکثر اسناد کی انتہا ابان پر ہے یہی وہ کتاب ہے جو سلیم نے اپنی موت کے قریب ابان کو دی تھی اور اس کی وصیت کی تھی۔

اسی مقدمہ کے صفحہ نمبر ۱۴ پر ہے۔

وكان سليم مستترا عن الحجاج ايام امارته	سلیم حجاج بن یوسف کے عہد میں چھپا رہا۔

امام بدر الدین سبکی نے اپنی کتاب محاسن الوسائل فی معرفت الاوائل میں لکھا ہے۔

ان اول كتاب صنف الشيعة هو كتاب سليم بن قيس الهلالي قال ولما همت حين مرضت ان احرقها فاثمت من ذلك وقعدت به فاني جعلت لي عهد الله وميثاقه ان لا تخبرها احد ادامت حيا ولا تحدث بشئ بعد موتي۔	شیعوں کے لیے سب سے پہلی کتاب جو تصنیف کی گئی وہ کتاب سلیم ہے سلیم کہتا ہے جب میری موت کا وقت آیا تو میں نے قصد کیا کہ کتاب کو جلا دوں مگر ایسا کرنے سے گناہ گار ہونگا اس لیے میں نے اللہ سے پختہ عہد کیا کہ جب تک میں زندہ ہوں اس کتاب کی اطلاع کسی کو نہ دوں گا اور میری موت کے بعد اس میں سے کوئی بات کوئی شخص بیان نہ کرے گا۔

اس بیان سے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) شیعہ مذہب میں سب سے پہلی تصنیف یہ کتاب ہے۔

(۲) مصنف کے بغیر کوئی شخص اس کتاب سے واقف نہیں تھا۔

(۳) مصنف نے موت کے قریب اسے جلا دینے کا ارادہ کیا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز فضول بے کار اور بے فائدہ ہو اسے آگ کے سپرد ہی کیا جاتا ہے۔

(۴) پھر اسے خیال آیا کہ ایسا کرنے سے گناہ گار ہوں گا۔ یعنی اس کتاب کی حیثیت اور افادیت کے معاملے میں وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

(۵) مصنف نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ جیتے جی اس کتاب کی اطلاع کسی کو نہیں دوں گا اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کہیں حجاج تک بات نہ پہنچ جائے اور اسے تلاش کر کے قتل نہ کر دیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب سامنے آئی تو ظاہر ہے کہ تنقید کی کسوٹی پر رکھی جائے گی اور حضرت علی سے ملنے والے لوگ زندہ تھے کہیں یہ راز نہ کھل جائے کہ بات اپنی ہے اور نام لے رہا ہے حضرت علی کا۔

(۶) نیز اللہ سے عہد کیا تھا کہ میری موت کے بعد کوئی شخص اس کتاب کی کوئی بات منظر عام پر نہیں لائے گا۔ پھر اس کتاب کو جلا دینے میں حرج کیا تھا۔ جو کتاب مصنف کی زندگی میں اور اس کی موت کے بعد کسی کے کام آنے کے قابل نہیں اور اللہ سے یہ عہد ہو چکا ہے تو اس کا باقی رہنا چہ معنی دارد یعنی مصنف کے نزدیک اس کتاب کی دینی حیثیت یہ ہے کہ منظر عام پر آنے کے لائق نہیں اور اصول کے اعتبار سے اس کا مقام یہ ہے کہ مصنف نے پوشیدہ طور پہ تیار کی مرتے وقت ابان کو دی۔ اور تاکید کی کہ اسے پوشیدہ رکھے کیونکہ اللہ سے عہد ہو چکا تھا۔ ابان نے نقض عہد کیا اور کتاب کی روایت کر دی۔ اس کتاب کا واحد راوی ابان ہے۔ گویا پورا دین شیعہ خبر واحد پر استوار ہوا۔ اس لیے ایسے عظیم راوی کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ضروری ٹھہرا جس کے منہ سے نکلی ہوئی بات پر دین کی عمارت کھڑی ہوئی اس کی بات کا نہ کوئی گواہ ہے اور نہ شہادت کی ضرورت ہے۔

میزان الاعتدال ذہبی میں ترجمہ ابان بن ابی عیاش فیروز میں لکھا ہے کہ بدترین کذاب تھا۔

اور

بقول شعبہ لان اشرب بول حمار	شعبہ کہتے ہیں کہ میں گدھے کا پیشاب پیا کروں

احب الی ان اقول حدثنا ابان ابن ابی عیاش۔

کر سکتا ہوں مگر یہ گوارا نہیں کہ میں کہوں کہ روایت کی ہم سے ابان بن ابی عیاش نے۔

یعنی محدثین کے نزدیک ابان کی سیرت کا نکھرا ہوا پہلو یہ ہے کہ بدترین کذاب ہے۔ اور اس کا قول گدھے کے پیشاب سے بھی بدتر ہے۔ اس تنقید سے فنی اعتبار سے کتاب سلیم کی حقیقت کھل کے سامنے آجاتی ہے۔

سلیم اور کتاب سلیم کا ذکر ضمناً آگیا اب ہم پلٹ کر اصل سوال کی طرف جاتے ہیں کہ حدیث قرطاس سے حضرت علی کی خلافت بلا فصل کا ثبوت کیسے ملتا ہے گذشتہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) حدیث میں لفظ ھجر بالفتح متعدی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) یہ لفظ اس گروہ کی زبان سے نکلا جو حضرت عمر کی رائے کے خلاف لکھوانے پر مصر تھا۔

(۳) اس وقت اہل بیت اور ۳۰ صحابہ موجود تھے اور حضرت علی بھی حاضر تھے

(۴) حضرت عمر نے حضورؐ کی تکلیف کے پیش نظر نہ لکھوانا بہتر سمجھا۔

(۵) حضرت علی کو حضورؐ نے قلم دوات لانے کا حکم دیا مگر انہوں نے حضورؐ کی صحبت سے چند لمحوں کے لیے بھی محروم رہنا گوارا نہ کیا اس لیے عرض کیا آپ فرمائیں میں یاد رکھوں گا۔

(۶) لکھانا کیا چاہتے تھے؟ اس کے متعلق تین رائیں ہیں

(ا) قرآن کے متعلق وصیت۔

(ب) حضرت ابوبکر کی خلافت کا فرمان۔

(ج) حضرت علی کی خلافت کا فرمان۔

پہلی رائے کے حق میں دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عمر نے حسبنا کتاب اللہ کہا تو حضورؐ کو یقین ہو گیا کہ امت کو قرآن حکیم کی اہمیت کا احساس ہے اس لیے لکھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

دوسری رائے کے متعلق دلیل یہ ہے کہ حضورؐ نے عملی طور پر حضرت ابوبکر کو اپنے سامنے نماز کی قیادت پر مامور فرما کے واضح کر دیا کہ تحریر سے زیادہ عملی ثبوت وزنی ہے اب لکھانے کی ضرورت نہیں۔

تیسری رائے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت علی کی خلافت کی تحریر لکھانا من جانب اللہ حضورؐ کے ذمہ تھا تو اس واقعہ کے دو روز بعد تک حضورؐ اس دنیا میں موجود رہے آپ نے اللہ کے حکم کی تعمیل کر کے فرمان لکھ دیا ہوتا۔ جب حضورؐ نے ایسا نہیں کیا تو یہ رائے کچھ وزن نہیں رکھتی۔

(۷) حضرت علی کی روایت کے مطابق حضورؐ نے تین باتوں کی وصیت فرما دی جو آپ لکھوانا چاہتے تھے یعنی نماز، زکوٰۃ اور غلاموں سے حسن سلوک۔

اس حدیث میں ایک اور جملہ کے مفہوم میں کچھ اشکال پیدا ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

قوموا عنی کا مفہوم:۔ اس مفہوم کے لیے مختلف روایات میں مختلف الفاظ آئے ہیں ذرونی، دعونی اور قوموا عنی موقع اور محل کے مطابق اس کے معنی ترک کرنے اور چھوڑنے کے ہیں شارحین حدیث نے قیام بمعنی ترک بتایا ہے جیسے قام عن الامر اذا ترکہ اور صاحب مجمع البحار نے بخاری کی حدیث پیش کی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اقرأ القرآن وا ستلفت علیہ قلوبکم فاذ اختلفتم فقوموا عنہ
اقرأوہ علی نشاط منکم وفوادکم مجموعۃ فاذا حصلت ملالۃ وتفرق القلوب فترکوا فانہ اعظم من ان یقرأ من غیر حضور۔

(مجمع البحار ۱: ۴۰۰)

حضورؐ نے فرمایا قرآن پڑھو جب تک تمہارے دلوں میں اس کے لیے الفت موجود ہو جب توجہ ہٹنے لگے تو پڑھنا بند کر دو۔
قرآن خوش دل سے پڑھو جب طبیعت ملول ہونے لگے اور دل حاضر نہ ہو تو پڑھنا چھوڑ دو کیونکہ حضور قلب کے بغیر قرآن پڑھنا قرآن کی توہین ہے۔

یعنی قوموا عنی کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ یہاں سے نکل جاؤ بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ لکھنے لکھانے کا خیال چھوڑ دو۔

حضورؐ کے اس ارادہ اور ترک ارادہ کے متعلق دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اوّل:۔ حضورؐ نے پہلے اپنے اجتہاد سے لکھنے میں مصلحت دیکھی پھر اپنے اجتہاد ہی سے نہ لکھنے

میں مصلحت دیکھیں۔

دوم :- پہلے بذریعہ وحی مصلحت ظاہر ہوئی پھر بذریعہ وحی عدم مصلحت ظاہر ہوئی۔

چنانچہ امام نووی نے شرح مسلم میں فرمایا۔

وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم بالکتاب حین ظہر لہ مصلحۃ او اوحی الیہ بذلک ثم ظہر ان المصلحۃ ترکہ او اوحی الیہ بذلک ونسخ ذلک الامر الاول (۲ : ۴۳)

جب حضورؐ پر مصلحت ظاہر ہوئی یا وحی کی گئی تو حضورؐ نے لکھانے کا قصد فرمایا جب ترک تحریر میں مصلحت ظاہر ہوئی یا وحی کی گئی تو آپ نے ارادہ ترک کر دیا اور اس سے امر اول منسوخ ہوگیا۔

اور عینی شرح بخاری میں ہے۔

ثم ظہر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ان المصلحۃ ترکہ او اوحی الیہ۔ (۲ : ۱۷۱)

پھر حضورؐ کو ترک میں مصلحت نظر آئی یا آپ پر وحی کی گئی۔

اور فتح الباری میں ہے

وعزمہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اما بالوحی واما بالاجتہاد وکذلک ترکہ ان کان بالوحی فبالوحی والا فبالاجتہاد (۸ : ۹۴)

حضورؐ کا ارادہ یا تو وحی سے تھا یا اجتہاد سے اسی طرح ترک کا معاملہ یا تو وحی سے یا اجتہاد سے۔

اور شیعہ عالم صاحب فلک النجاۃ لکھتے ہیں۔

واما سکوتہ علیہ السلام بعد التنازع ما کان من عندہ بل کان بالوحی کما بین فی مقامہ۔ (۱ : ۳۲۶)

جھگڑے کے بعد سکوت کر جانا حضورؐ کا اپنی طرف سے نہیں تھا بلکہ وحی سے تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

شیعہ عالم کی تحریر سے حضورؐ کے ارادہ اور ترک ارادہ کا مسئلہ صاف ہوگیا ایک اور عقدہ بھی کھل گیا کہ حضورؐ کا سکوت وحی کے مطابق تھا۔ یعنی نہ لکھوانا اللہ تعالےٰ کے حکم کے تحت تھا۔ جب یہ تسلیم ہے تو اس بات کا شکوہ کرنا کہ فلاں نے روکا یہ ظلم ہوا وغیرہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب اللہ نے منع کیا تو کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کا رسول اپنی مرضی سے یا کسی کے کہنے پر اللہ کے حکم کے خلاف کر سکتا ہے؟ کیا کوئی مومن اللہ کی وحی اور اللہ کے فیصلہ کو ظلم زیادتی یا کسی کی حق تلفی قرار دے سکتا ہے؟ اس لیے اگر تیسری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ حضور حضرت علی کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔ تو حضورؐ کا سکوت جب وحی کی ہدایت کے تحت ہوا تو ظاہر ہے کہ اللہ کو حضرت علی کی خلافت کا فرمان لکھوانا منظور نہیں تھا۔ اور اللہ کے فیصلہ کے تحت حضورؐ نے سکوت اختیار کر لیا۔

شیعہ کی طرف سے ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ جب سب لوگ چلے گئے تو حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کا فرمان لکھوا لیا تھا۔ یہ بات ذرا غور طلب ہے۔

(۱) حضورؐ خود تو نہ لکھتے تھے۔ پھر آپ نے یہ فرمان کس سے لکھوایا۔

(۲) قلم دوات کون لایا تھا؟

(۳) کیا یہ فرمان خلافت علی اور بلافصل کا فرمان تھا۔ اگر یہی بات ہے تو۔

(۴) حضورؐ کے بعد جب خلافت کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت علی نے یہ فرمان کسی کو دکھایا کہ اس کی بنا پر خلافت کا حقدار میں ہوں۔

(۵) اگر پیش نہیں کیا تو کیوں؟ کیا وہ فرمان چھپا کے رکھ دینے کے لیے لکھوایا تھا۔

(۶) اگر اس فرمان سے کام نہیں لیا تو اس کے لکھانے کیلئے اتنے جتن کرنا کس مقصد کے لیے تھا۔

اس بنا پر معلوم ہوا کہ تنہائی میں فرمان لکھوا لینے کی بات بار لوگوں کی ایجاد بندہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

حدیث قرطاس کا ہر پہلو زیر بحث آچکا اور حقیقت نکھر کر سامنے آگئی البتہ ایک امر توجہ طلب ہے۔

حضورؐ نے فرمایا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی ابدا۔ تو جو بات آپ لکھانا چاہتے تھے کیا وہ بات جزو دین تھی یا دین سے الگ کوئی زائد چیز تھی۔ اگر پہلی بات ہے تو ماننا پڑے گا کہ دین نامکمل رہ گیا حالانکہ اللہ تعالےٰ اعلان کر چکے ہیں کہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ اگر دین سے خارج کوئی چیز تھی تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لہٰذا

معلوم ہوتا ہے کہ بات تو دینی تھی اور کسی ایسے جزوی حکم کے متعلق آپ تاکید فرمانا چاہتے تھے جو پہلے کتاب و سنت میں بیان ہو چکا ہے۔ حدیث کے آخر میں تین باتوں کا ذکر ہے کہ جزیرۃ العرب سے مشرکین کو نکال دینا اور وفود کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو میں کیا کرتا تھا اور دوسری روایت جو حضرت علی سے بیان ہوئی تیسری بات غلاموں کے بارے میں تاکید ہے ان باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ جس چیز کے متعلق وصیت لکھوانا چاہتے تھے وہ ہے التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ اگر ان دو امور کو پلے باندھ لیا جائے تو گمراہی کی طرف قدم بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے توجہی، بغاوت یا استہزاء ہونے لگے اور مخلوق کی حق تلفی شروع کر دی جائے تو کوئی چیز گمراہی سے بچا نہیں سکتی۔ یہی سارے دین کا خلاصہ ہے اور قرآن و سنت میں اس کی تاکید مختلف صورتوں میں بیان ہو چکی ہے۔ اس لیے دین کی تکمیل کے اعلان کے بعد دین کی کسی اہم بات کی تاکید لکھانا مطلوب ہو تو یہ نہ حیرت کی بات ہے نہ اعتراض کی گنجائش ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حدیث قرطاس کو حضرت علی کی خلافت بلافصل کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا اور حدیث میں موہوم آراء شامل کر کے اسے سند بنانا نہ علمی اعتبار سے لائق توجہ ہے نہ حق و انصاف کی بات ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف شکوہ۔ نبی کریمؐ کی توہین۔ صحابہ کے متعلق بدگمانی نہ جانے کیا کیا قباحتیں پیدا ہوتی ہیں

اور اس کے علاوہ جو احادیث گذشتہ صفحات میں درج کی گئی ہیں اور جنہیں حضرت علی کی خلافت بلافصل کے لیے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے محدثین کے نزدیک موضوع ضعیف اور ساقط الاعتبار ہیں۔ پھر ان احادیث کے مضمون سے حضرت کے فضائل کا اظہار ہوتا ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ مسئلہ امامت تو شیعہ کے نزدیک اصول دین سے ہے جیسا کہ نبوت کا مسئلہ اصول دین میں شمار ہوتا ہے اس لیے اس مسئلہ کی بنیاد صرف دلائل قطعیہ اور نصوص بینات غیر متواترۃ واضح الدلالۃ علی المدعیٰ ہی بن سکتی ہیں جو قرآن و سنت دونوں ماخذوں میں کہیں نہیں ملتیں۔

حضرت علی اور خلفائے ثلثہ کے تعلقات

خلافت علی بلافصل کے موضوع پر علمی اور تاریخی دلائل تو ناپید ہیں۔ ایک اور پہلو سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔

انسان کی زندگی میں نظریات اور عقائد بیج کی حیثیت رکھتے ہیں اسی بیج سے اس کی عملی زندگی کا درخت پھوٹتا، پھلتا پھولتا اور برگ و بار لاتا ہے۔ اگر حضرت علی کا عقیدہ یہ ہو کہ خلافت بلافصل ان کا حق تھا اور خلفائے ثلثہ نے ان کی حق تلفی کی یا حقوق غصب کیے تو یہ اقدام جرم بھی ہے اور گناہ بھی لہٰذا حضرت علی کا برتاؤ ان حضرات کے ساتھ وہی ہونا چاہیے جو ایک ذاتی دشمن کے ساتھ یا خدا کے باغی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہم تاریخی حقائق پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت علی نے حضرت صدیق کے ہاتھ پر بیعت کی یعنی حلف وفاداری اٹھایا۔ احتجاج طبرسی میں حضرت اسامہ کا ایک مکالمہ لکھا ہے۔

فلما رأی اجتماع الخلق علی ابی بکر انطلق الی علی بن ابی طالب فقال ما ھذا قال بہ علی ھذا ما تری قال اسامہ ھل بایعتہ قال نعم۔

ص۵۱

جب راوی نے حضرت ابوبکر صدیق کے حق میں مخلوق کا ہجوم دیکھا تو کہتا ہے میں حضرت علی کے پاس گیا میں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے فرمایا وہی کچھ ہے جو تم دیکھ رہے ہو اسامہ نے کہا کیا آپ نے بیعت کر لی، حضرت علی نے کہا ہاں کر لی۔

روایت کے متن سے ظاہر ہے کہ یہ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد کی بات نہیں بلکہ عین اس وقت سے تعلق رکھتی ہے جب ابوبکر صدیق کی بیعت عام ہو رہی تھی اور اسی وقت حضرت علی نے بیعت کر لی۔ اور یہ سوال و جواب بتاتے ہیں کہ لوگ ابھی بیعت کر رہے تھے کہ حضرت علی نے بالکل ابتداء میں بیعت کی اور حضرت اسامہ کو بتایا کہ ہاں میں نے بیعت کر لی ہے۔

پھر احتجاج طبرسی ص۴۹

ثم تناول ید ابی بکر فبایعہ — پھر حضرت علی نے حضرت ابوبکر کا ہاتھ پکڑا اور ان کی بیعت کر لی۔

پہلی روایت میں حضرت علی کا قول بیان ہوا اس میں ان کا فعل بیان ہوا ہے - ان دو روایات کے علاوہ کتب شیعہ میں متعدد روایات موجود ہیں جن میں حضرت علی کے اس قول اور اس فعل کا بیان ہوا ہے -

اس باب میں جو اضافے کئے گئے ہیں ان کا بیان بھی ضروری ہے -

(۱) ما من الامۃ احد بایع مکرھا غیر علی وار بعتنا -	امت میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے جبراً بیعت کی ہو سوائے حضرت علی اور ہمارے چار اصحاب کے -
احتجاج طبرسی ص۴۹)	

اس روایت میں بیعت کا اقرار ہے جو امر واقع ہے مکرھا کا لفظ غالباً ضرورت شعری کے لیے بڑھا دیا گیا - بہرحال یہ امر واضح ہے کہ پوری امت ایک طرف ہے صرف پانچ آدمی دوسری طرف ہیں اور وہ بھی بظاہر امت کے ساتھ ہیں - آج کل کی زبان میں یوں سمجھئے کہ پوری امت نے حضرت ابوبکر کو ووٹ دئے - پانچ آدمی مخالف کیمپ میں تھے مگر انہوں نے بھی ووٹ حضرت ابوبکر رض کو دئے - دنیا میں ایسی مثال مشکل سے ہی ملے گی کہ پوری قوم ایک شخص کی قیادت پر متفق ہو نیز اس امر کا اعتراف بھی ہے کہ پانچ افراد کے بغیر پوری امت نے حضرت ابوبکر کو بخوشی ووٹ دئے -

(۲) احتجاج طبرسی میں صرف مکرھا کی آمیزش پر اکتفا کیا گیا ہے - درۃ النجفیہ میں آمیزش میں کچھ اضافہ ہوا ہے -

حملتہ جماعتھم الی ابی بکر فبایعوہ فبایع معھم علیٰ مدرھا (درۃ النجفیہ ۱: ۸۸)

(۳) روایات کے بعد شاعری کا نمبر آتا ہے اب اس منظر کی لفظی تصویر ملاحظہ ہو -

بدست عمر بود یک سر ریسمان
دوم در کف خالد پہلوان
فگندند در گردنش از عناد
ولیِ خدا نیز گردن نہاد

حملہ حیدری ۲: ۲۷۳

درۃ النجفیہ میں بتایا کہ ایک جماعت اٹھالے گئی - جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے حضرت علی

شیرِ خدا بھی مگر فرد واحد اور جماعت کا کیا مقابلہ مگر علامہ باذل نے تو معاملہ اور کمزور کر دیا کہ جماعت نہیں صرف دو آدمی تھے عمر اور خالد انہوں نے حضرت علی کے گلے میں رسی ڈالی اور گھسیٹ کر لے گئے - یعنی شیرِ خدا کو اور فاتح خیبر کو دو ایسے شخص باندھ کر لے گئے جو شیرِ خدا تو کیا شیرِ نیستاں بھی نہیں ہیں - اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شیرِ خدا، جو باطل کے سامنے دب جانا جانتا ہی نہیں اور باطل کو حق کہنے پر کوئی طاقت اسے مجبور نہیں کر سکتی وہ دو آدمیوں کے ہاتھ میں ایسا بے بس ہو جاتا ہے کہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور وہ بات کہتا ہے جسے وہ حق نہیں سمجھتا - اس تقابل سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ یا تو شیرِ خدا کہنا محض تبرک ہے یا یہ واقعہ غلط ہے - پہلی بات اس لیے نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت علی کی زندگی میں بیسیوں واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعی شیرِ خدا ہیں لہٰذا اس کے بغیر کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے - احتجاج طبرسی نے خاکہ تیار کیا درۃ النجفیہ نے کچھ رنگ بھرا اور حملہ حیدری نے تکمیل تک پہنچایا اور منظر نگاری کے فن میں اپنا کمال ظاہر کرنے کے لیے یہ افسانہ تیار کیا -

اب ایک قدم آگے بڑھئے -

احتجاج طبرسی ص۹۱	
انی کنت اقاد کما یقاد الجمل المخشوش حتی ابایع	مجھے یوں کھینچا گیا جیسے اونٹ کو نکیل ڈال کر لے جایا جاتا ہے - حتیٰ کہ میں نے بیعت کر لی -

یہ الفاظ حضرت علی زبان سے کہلوائے گئے ہیں - اس تشبیہ میں ایک خاص قسم کا تاثر ملتا ہے - جب اونٹ کو نکیل ڈال دی جائے تو ایک معمولی دھاگے سے باندھ کر ایک بچہ بھی اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے اس سے شیرِ خدا کی انتہائی بے بسی ظاہر کرنا مقصود ہے - پھر اس میں فنکاری کا پہلو یہ ہے کہ خود حضرت علی کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے کیونکہ کوئی دوسرا یہ کہے تو لازماً حضرت علی کی توہین ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ شیرِ خدا اپنی زبان سے اپنی مجبوری بے بسی - بزدلی - کمزوری اور ابن الوقتی کا اقرار خود کرے - حضرت علی کے اس اقدام سے ہر سوچنے والے آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے ایسا اقدام کیوں کیا جو آپکی مسلمہ شجاعت اور حق پرستی کے منافی تھا تو اس سوال کا جواب بھی دے دیا گیا - سید شریف مرتضیٰ

علم الهدیٰ فرماتے ہیں۔

وانما دعاه الی الصفقة واظهار التسليم التقية والخوف على النفس والاهل والاسلام

(شافی ۲: ۴ ۳۵)

حضرت علی نے صرف تقیہ کرکے اپنی جان بچانے اور اہل بیت اور اسلام کو بچانے کے لیے بیعت کی۔

دیکھئے وجہ معقول ہے آپ نے ایک طرف تو تقیہ کرنے کا ثواب حاصل کیا دوسری طرف اطاعت و وفاداری کا جھوٹا اقرار کرکے اپنی جان کو اہل بیت کو اور اسلام کو خطرے سے بچالیا۔ یعنی اپنی جان کے خوف سے وہ کام کیا جو شرعاً جائز نہیں تھا یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ حضورؐ کی مکی زندگی میں صحابہ پر کونسا ستم نہیں ڈھایا گیا مطالبہ صرف یہ تھا کہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہو۔ مگر صحابہ کرام نے مال و دولت اہل و عیال بلکہ جان تک کی پرواہ نہ کی مگر زبان سے وہ کلمہ نہ نکالا جو حق کے خلاف ہو۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی شیر خدا کہنے والا کوئی نہیں تھا تعجب کی بات ہے کہ شیر خدا محض اپنی جان کے موہومہ خوف کی وجہ سے ان صحابہ جیسی عزیمت بھی نہ دکھا سکے۔ اگر حضرت علی کو اپنی جان ایسی ہی پیاری ہوتی تو ہجرت کی رات لازماً کہیں کھسک جاتے صحابہ کی جاں نثاری کی مثال تو دنیا میں ملنا ممکن ہی نہیں اسلام کا ایک سچا فدائی ایک سچی بات کہتا ہے القرآن کتاب اللہ غیر مخلوق اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ بس غیر مخلوق نہ کہو مگر وہ اس مطالبہ کو غلط سمجھتا ہے جسے حق سمجھتا ہے اس پر جما رہتا ہے۔ اسے سزا دی جاتی ہے کتنی؟ مسلسل چار حکمران اپنے اپنے دورِ حکومت میں اپنی سمجھ کے مطابق شدید ترین سزائیں دیتے ہیں مگر وہ شخص گوشت کے اس ٹکڑے کو جسے زبان کہتے ہیں ذرا سی حرکت دے کر یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ قرآن مخلوق ہے کیونکہ وہ اسے حق نہیں سمجھتا وہ شخص نہ صحابی ہے نہ شیر خدا ہے۔ تو کیا شیر خدا ایسے گئے گزرے تھے (معاذ اللہ) کہ صرف اپنی جان بچانے کے لیے باطل کو حق کہہ دیا قبول کرلیا اور اس پر عمل کرتے رہے۔ حضرت علی پر اس سے بڑا بہتان اور کیا ہو سکتا ہے۔

نہج البلاغہ معہ شرح درۃ النجفیہ صہ ۳۶۸ پر حضرت علی کا ایک فرمان درج ہے۔

لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق کیا یہ اصول دوسروں کیلئے ہے ان کی اپنی ذات

مستثنیٰ تھی۔ نہیں بلکہ انہوں نے وہی کیا جو کہا اور وہی کہا جسے حق سمجھا۔ جیسا کہ احتجاج طبرسی کی حضرت اسامہ والی روایت سے ظاہر ہے باقی باتیں بس باتیں بنانے کے لیے کی گئی ہیں۔

خلفائے ثلثہ کے بعد حضرت علی کو مستقل طور پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے ان کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ ان کے پیشروؤں نے اگر کوئی آئین۔ دستور یا قانون اسلام کے منافی بنایا یا نافذ کیا تھا تو اس کو بدل دیتے اور خالص اسلامی قانون نافذ کرتے۔ اس اصول کی روشنی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی نے اپنے عہد میں خلفائے ثلثہ کے نظام کو علی حالہٖ قائم رکھا انکی کسی پالیسی کو نہیں بدلا حضرت علی کا یہ رویہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ اپنے پیش روتینوں خلفاء کو برسرِ حق سمجھتے تھے اور ان کے فیصلوں کو بھی مبنی علی الحق سمجھتے تھے مگر کتب شیعہ میں حضرت علی کے اس پہلو کو بھی دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔

کتاب سلیم بن قیس ہلالی طبع ایران صہ ۱۴۲ اور روضہ کافی صہ ۲۹ حضرت علی کی زبانی بیان کیا ہے۔

قد عملت الولاة قبلی اعمالا خالفوا فيها رسول الله متعمدا لخلافه ناقضين لعهده مغيرين لسنة ولو حملت الناس على تركها وحولتها الی مواضعها والی ما كانت فی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لتفرق عنی جندی۔

مجھ سے پہلے حکمرانوں نے حضورؐ کی مخالفت کے کام کئے عمداً کیے۔ حضورؐ سے بیوفائی کرتے ہوئے کیے۔ حضورؐ کی سنت کو بدلتے ہوئے کئے اگر میں اب لوگوں کو ان کاموں کے ترک کرنے کے لیے کہوں اور حضورؐ کے زمانے کے مطابق حکم دوں تو میری فوج مجھے چھوڑ کر باغی ہو جائے گی۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت علی نے اپنے پیش روؤں کے متعلق فرمایا:۔

(۱) انہوں نے اپنے اپنے دور میں ایسے کام کئے جو رسول کریمؐ کے احکام کے خلاف تھے۔

(۲) انہوں نے یہ کام حضورؐ کی مخالفت کے ارادے سے کئے۔

(۳) انہوں نے حضورؐ سے نقض عہد کیا۔

(۴) انہوں نے حضورؐ کی سنت کو تبدیل کیا۔

پھر اپنے متعلق فرمایا کہ اگر میں ان فیصلوں کو بدل دوں اور لوگوں کو اتباع سنت رسول

کا حکم دوں تو میرا لشکر میرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ

(۱) حضرت علی جانتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پہلے بھی ہوتی رہی اور اب بھی ہو رہی ہے۔

(۲) حضرت علی نے اس احساس کے باوجود اس حالت کو عمداً نہیں بدلا۔

(۳) انہی اپنی فوج کے باغی ہو جانے کا خدشہ تھا۔

(۴) انہیں اپنے اقتدار کے چھن جانے کا ڈر تھا۔

(۵) ان کی فوج ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام شعار اسلام اور سنت نبوی کے مخالف تھے۔

ہر دو بیانوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو غلط باتیں خلفائے ثلثہؓ نے عمداً جاری کیں وہ حضرت علی نے عمداً برقرار رکھیں۔ خلفائے ثلثہؓ کے متعلق یہ بھی امکان ہے کہ انہوں نے یہ کام صحیح سمجھ کے کئے ہوں کیونکہ ان کی نیت کے متعلق صراحت نہیں محض قیاس ہے مگر حضرت علی کے متعلق تو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے غلط جانتے ہوئے ان احکام کو برقرار رکھا اور یہ بھی واضح ہے کہ حضرت علی کو اقتدار عزیز تھا حضورؐ کی سنت اور اسلام سے محبت نہیں تھی (معاذ اللہ) پھر اقتدار بھی ایسا کہ جس کا نقشہ نور اللہ شوستری شہید ثالث نے اپنی کتاب احقاق الحق میں لکھا ہے۔

واما امر الخلافة ما وصل الیه الا بالاسم دون المعنی۔	حضرت کو خلافت تو بس برائے نام ملی۔

وجہ کچھ ہو۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت علی نے اپنے زمانہ خلافت میں خلفائے ثلثہ کی کسی قسم کی مخالفت نہیں کی ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر حضرت علی کو نفاق سے پاک کامل مومن اور شیر خدا تسلیم کیا جائے تو اس 'کیوں' کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے جسے حق سمجھا اسے قائم رکھا۔ اور اگر حضرت علی کو (معاذ اللہ) اقتدار کا بھوکا موقع پرست اور دنیا دار تسلیم کیا جائے تو اس 'کیوں' کا جواب یہ ہوگا کہ اسی کا نام سیاست ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صدیق اکبر کی بیعت سے لیکر اپنے عہد کے خاتمے تک حضرت علی کا رویہ وہی رہا جو ایک حق پرست کا ہونا چاہیے۔ انہوں نے صدیق اکبر کی بیعت برضاد

رغبت کی خلفاء ثلثہ کے نظام سلطنت کو انہوں معیاری اور صحیح اسلامی سمجھا اور اپنے عمل سے اسے ثابت کر دکھایا۔ اگر ان کی کوئی پالیسی یا ان کا کوئی حکم خلاف شریع ہوتا تو حضرت علی جیسا حق پرست اسے بدلے بغیر نہ چھوڑتا۔ عام حالات میں بھی خلفاء ثلثہ کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت دوستانہ رہا۔ جیسا کہ کتاب سلیم بن قیس ہلالی ص۲۲۳

وکان علی علیه السلام یصلی فی المسجد الصلوات الخمس فلما صلی قال له ابو بکر وعمر کیف بنت رسول الله۔	حضرت علی پانچوں وقت کی نماز مسجد (نبوی) میں پڑھا کرتے تھے (ایک روز) جب نماز پڑھ چکے تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ان سے حضرت فاطمہ کی بیمار پرسی کی۔

اس روایت سے چند ایک امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) حضرت علی باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد نبوی میں پڑھا کرتے تھے جہاں حضور اکرمؐ کے مقرر کردہ امام حضرت ابوبکر صدیق نماز پڑھاتے تھے۔

(۲) نماز کے بعد شیخین نے حضرت علی سے حضرت فاطمہ کی بیمار پرسی کی۔ یعنی وہ ایک دوسرے کے غمخوار تھے۔

(۳) حضرت علی پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے یہ تین وقت جو شیعوں میں مروج ہیں وہ کہیں اور سے لئے گئے ہیں۔

(۴) حضرت علی جب مقتدی تھے تو لامحالہ وہی نماز پڑھتے تھے جو ابوبکر پڑھاتے ہیں اور جو اہل السنت والجماعت پڑھا کرتے ہیں۔ شیعوں کے ہاں کی نماز بعد کی ایجاد ہے۔

اسی حقیقت کا بیان احتجاج طبرسی میں ہے۔

ثم قام وتهیأ للصلوة وحضر المسجد وصلی خلف ابی بکر ص۵۴	پھر اٹھے۔ نماز کا ارادہ کیا۔ مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور حضرت ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھی۔

اور درۃ النجفیہ میں ہے:۔

والصحیح عندی وهو الاکثر الاشهر انها لکن آخر الصلوة فی حیاته صلی الله علیه وسلم	اور میرے نزدیک صحیح اور مشہور مذہب یہ ہے کہ جس روز حضورؐ نماز کے لیے باہر تشریف

بالناس جماعة وان ابا بكر صلی بالناس بعد ذلك يومين ثم مات صلی الله عليه وسلم -
(صہ ۲۲۴)

وہ حضورؐ کی نماز باجماعت پڑھنے کا آخری دن نہیں تھا اور یہ کہ ابو بکرؓ نے اس کے بعد حضورؐ کی زندگی میں لوگوں کو دو دن نماز پڑھائی -

اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے اپنی زندگی میں صدیق اکبر کو اپنا نائب خلیفہ نامزد فرمایا تھا اور حضرت علی لازماً حضورؐ کے مقرر کردہ امام کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حضورؐ دو دن یہ منظر دیکھتے رہے اس لیے حضرت علی کو حضورؐ کے فیصلے اور انتخاب کے خلاف کوئی بات دل میں رکھنے کی ہمت کیسے ہو سکتی تھی جبکہ وہ ارشاد باری تعالےٰ سن چکے تھے کہ

وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم - ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا بعيدا -

ظاہر ہے کہ اس آیت کے منشا کے مطابق حضرت علی سے یہی توقع کی جا سکتی ہے فیصلہ نبوی سن کر اور اس پر عمل ہوتا ہؤا دیکھ کر اپنے اختیار سے دست بردار ہو جائیں اور اللہ اور رسول کی مخالفت سے بچنے کے لیے کامل اتباع نبوی کا ثبوت دیں - مگر عجیب اتفاق ہے کہ لوگوں نے حضرت علی کے اس اتباع نبوی کی توجیہ اس رنگ میں کی کہ ایک ادنیٰ درجے کے مومن سے بھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی - شریف مرتضیٰ نے شافی میں اور ابو جعفر طوسی نے تلخیص میں صہ ۳۵۴ پر فرمایا

فاما الصلوة خلفهم فقد علمنا ان الصلوة على ضربين صلوة مقتد مؤتم بامامه على الحقيقة و صلوة مظهر للاقتداء والاهتمام واذا كان لا ينويها فان ادعى على امير المؤمنين انه صلى ناويا للاقتداء فيجب ان يدلو على ذلك فانا لا نسلم ولا هو الظاهر الذى لا يمكن النزاع فيه وان ادعى صلوة مظهر الاقتداء فذالك مسلم لانه الظاهر الا انه غير نافع فيما يقصد ونه ولا يدل على خلاف ما نذهب اليه فلم يبق الا ان يقال فما العلة فى اظهار الاقتداء من لا يجوز الاقتداء به والعلة غلبة القوم على الامر -

پس جہاں تک خلفائے ثلثہ کی اقتدا میں حضرت علی کے نماز پڑھنے کا معاملہ ہے ہم جانتے ہیں کہ نماز دو قسم کی ہے ایک یہ کہ مقتدی اپنے امام کی اقتدا میں نماز پڑھے دوسری یہ کہ مقتدی صرف اپنے امام کی اقتدا کا اظہار کرے حقیقت میں اقتدا کی نیت نہ ہو - اگر کوئی دعویٰ کرے کہ حضرت علی ان کی اقتداء کی نیت کرتے تھے تو ہم نہیں مانتے اور ظاہری اقتدا میں نزاع کوئی نہیں اور یہ مدعی کیلئے مفید بھی نہیں - یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اس اقتداء کے اظہار کی وجہ کیا ہے جس کی اقتداء جائز نہ ہو - تو ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کی علت خلفائے ثلثہ کا غلبہ ہے -

نماز کی ایک قسم سننے میں آئی ہے کہ نیت درست ہو اور اس طریقے سے پڑھی جائے جو حضورؐ نے خود اختیار فرمایا اور صحابہ کو سکھایا رہی دوسری قسم کہ ظاہر تو کرے کہ نماز پڑھ رہا ہے مگر نیت نماز کی نہ کرے اور حضورؐ کے اتباع کا ارادہ بھی نہ ہو تو یہ مومن کی نماز نہیں ہو سکتی - اگر حضرت علی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ نماز باجماعت صرف دکھانے کے لیے پڑھتے تھے تو دو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں -

(۱) حضرت ابو بکر کو نبی کریمؐ نے خود امام مقرر فرمایا اور انکی اقتداء کا حکم دیا تھا - اگر حضرت علی نے ان کی اقتدا کی نیت نہیں کی تو حضورؐ کے حکم کی مخالفت کی تو ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا بعيدا کی زد سے کیونکر بچ سکتے ہیں -

(۲) کیا حضرت علی اتنے بزدل تھے کہ اپنی پسند کے مطابق نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے اور کیا ان کو اس کام سے نفرت تھی جسے حضورؐ پسند فرماتے تھے ؟

حضرت علی کے متعلق اس قسم کی ریاکارانہ نماز پڑھنے اور مسلسل پڑھتے رہنے کا تصور کرنا درحقیقت حضرت علی کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کرنے کے مترادف ہے یہ حرکت وہی کر سکتا ہے جسے حضرت علی سے دلی دشمنی ہو -

اس سلسلہ میں ایک شیعہ عالم نے ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب لفظ خلف آجائے تو مراد اقتدا کی نیت کے بغیر نماز ہوتی ہے اور اقتدا کی نیت ہو تو لفظ مع بولا جاتا ہے - یہ دلیل بڑی وزنی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ کتب شیعہ میں اس کے

خلاف ثبوت ملتا ہے مثلاً فروع کافی باب من تکرہ الصلوٰۃ خلفہ ص۲۲۵

عن زرارہ عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت الصلوٰۃ خلف العبد فقال لا بأس بہ اذا کان فقیہا قال قلت اصلی خلف الاعمٰی قال نعم قال امیر المؤمنین لا یصلین احدکم خلف المجذوم ولا خلف الابرص

سوچنا پڑتا ہے کہ کیا اس سارے باب میں وہی مسائل ہیں جو نیت کے بغیر، نماز پڑھنے کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ جہاں دیکھو لفظ خلف استعمال ہوا ہے۔ گویا نماز کی نیت کرکے نماز پڑھنا قابل ذکر بات ہی نہیں۔ نہ اس کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

سیدنا علی المرتضیٰ کا نکاح اور خلفائے ثلثہ کی خدمات

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ گھریلو معاملات میں آدمی اپنے دلی دوستوں اور قابل اعتماد ساتھیوں سے مشورہ لیا کرتا ہے اور ایسے معاملات میں لوگ اسی کو مشورہ دیتے ہیں جسے اپنا دوست سمجھتے ہیں اور دوست ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں حضرت علی کے نکاح کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) ملا باقر مجلسی اپنی کتاب جلاء العیون میں لکھتے ہیں۔

"ہم جانتے ہیں کہ خدا اور رسول خدا نے فاطمہ کو علی کیلئے رکھا ہوا ہے پس ابوبکر، عمر اور سعد بن معاذ نے کہا اٹھو علی کے پاس چلیں اور ان سے کہیں فاطمہ کی خواستگاری کرو اگر تنگدستی انہیں مانع ہے تو ہم ان کی امداد کریں گے...... جناب امیر نے ابوبکر سے یہ کلام سنا آنسو چشمہائے مبارک سے جاری ہوئے...... لیکن تنگدستی مجھے اس امر کے اظہار سے شرم دلاتی ہے ان لوگوں نے جس طرح ہوا حضرت کو راضی کیا" (ص۱۳۵)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی کو حضرت فاطمہ کی خواستگاری کا مشورہ دینے والوں میں حضرت ابوبکر کا نام سرفہرست ہے۔ اس جماعت کی طرف سے گفتگو کرنے والے ابوبکرؓ ہیں۔ انہیں حضرت علی کی ہچکچاہٹ کی وجہ معلوم تھی کہ تنگدستی ہے اس کا علاج انہوں نے پہلے تجویز کرلیا کہ مالی امداد دیں گے۔ یعنی ابوبکر و عمرؓ حضرت علی کے دلی دوست اور سچے خیرخواہ تھے اور ان کی خاطر مالی ایثار کرنے کے لیے تیار تھے۔

(۲) المناقب الخوارزمی طبع عراق نجف اشرف سال ۱۹۶۵ء (باب تزویج فاطمہ)

عن الحسن عن انس بن مالک قال کنت عند النبی فغشیہ الوحی فلما افاق قال لی یا انس اتدری ما جاءبہ جبرائیل من عند صاحب العرش قال قلت اللہ و رسولہ اعلم قال امرنی ان ازوج فاطمہ من علی فانطلق فادع ابابکر و عمر و عثمان و طلحہ و الزبیر و بعددھم من الانصار قال فانطلقت فدعوتہم لہ فلما ان اخذوا مجالسہم قال رسول اللہ الحمد للہ المحمود بنعمتہ المعبود بقدرتہ المطاع فی سلطانہ المرھوب من عذابہ المرغوب الیہ فیما عندہ النافذ امرہ فی ارضہ وسمائہ الذی خلق الخلق و بقدرتہ و میزھم باحکامہ و اعزھم بدینہ و اکرمھم بنبیہم محمد...... ثم انی اشھدکم انی زوجت فاطمہ من علی اربعمائۃ مثقال فضۃ ان رضی بذلک علی وکان غائبا بعثہ رسول اللہ فی حاجتہ ثم امر رسول اللہ بطبق فیہ بسر فوضع فیما بین ایدینا...... ثم قال یا علی ان اللہ تعالٰی امرنی ان ازوج فاطمہ فقد زوجتکہا علی اربعمائۃ مثقال فضۃ ارضیت فقال قد رضیت یا رسول اللہ...... واذن فیہ وقد زوجنی رسول اللہ

حضرت حسن نے مالک بن انس سے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ پر وحی کا نزول شروع ہوا میں پاس تھا جب وحی ختم ہوا تو فرمایا انس! کیا تم جانتے ہو کہ جبرئیل اللہ کی طرف سے کیا حکم لائے ہیں میں نے عرض کیا اللہ و رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ کا نکاح علی سے کر دوں اس لیے جا اور ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر اور اتنے آدمی انصار سے بلا لو۔ میں انہیں بلا لایا جب وہ بیٹھ گئے تو حضورؐ نے خطبہ پڑھا الحمد للہ ...... الخ

پھر فرمایا میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے فاطمہ کا نکاح علی سے چار سو مثقال چاندی کے بدلے کر دیا بشرطیکہ علی اس پر راضی ہو۔ علی اس وقت موجود نہ تھے۔ حضورؐ نے انہیں کسی کام کے لیے بھیجا تھا پھر حضورؐ نے کھجوروں کا ایک تھال منگایا اور ہمارے سامنے رکھ دیا.. پھر فرمایا اے علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے

... فاطمة وجعل صداقها درعي هذا وقد رضيت بذلك ..... واقبل على رسول الله فقال يا ابا الحسن انطلق الآن فبع درعك وائتني بثمنها حتى اهيئ لك ولابنتي فاطمة ما يصلحكما قال علي فاخذت درعي فانطلقت الى السوق فبعته باربعمائة درهم سود هجرية من عثمان بن عفان فلما اخذت الدراهم منه وقبض درعي مني قال لي يا ابا الحسن الست اولى بالدرع منك وانت اولى بالدراهم مني فقلت نعم قال فان هذا الدرع هدية مني اليك قال فاخذت الدرع ...... والدراهم بين يديه فاخبرته بما كان من امر عثمان فدعا له النبي بخير - ثم قبض رسول الله قبضة فدعا ابي بكر فدفعها اليه فقال يا ابا بكر اشتر بهذا الدراهم لابنتي ما يصلح لها في بيتها وبعث معه سلمان الفارسي وبلال بن حمامة ليعيناه على حمل ما يشتريه

کہ میں فاطمہ کا نکاح تجھ سے کر دوں۔ سو میں نے ۴۰۰ مثقال چاندی مہر پر تجھ سے نکاح کیا۔ کیا تو راضی ہے حضرت علی نے کہا یا رسول اللہ میں راضی ہوں۔ . . . اور حضرت علی نے آواز دی کہ حضورؐ نے اپنی بیٹی فاطمہ کا نکاح مجھ سے کر دیا ہے اور حق مہر یہ درع مقرر کی ہے اور میں اس پر راضی ہوں . . . . پھر حضورؐ، علی کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے ابوالحسن جاؤ اور اپنی زرہ فروخت کرو۔ قیمت میرے پاس لاؤ تاکہ اس رقم سے تیرے لیے اور اپنی بیٹی کے لیے گھر کا سامان خریدوں حضرت علی فرماتے ہیں۔ میں وہ زرہ لے کر بازار گیا اور ۴۰۰ درہم کے بدلے حضرت عثمان کے ہاتھ بیچ دی جب لین دین ہو چکا تو حضرت عثمان نے کہا اے ابوالحسن کیا میں اس زرہ کا تجھ سے زیادہ حقدار نہیں ہوں اور تم اس رقم کے مجھ سے زیادہ حقدار نہیں ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ حضرت عثمان نے کہا یہ رقم اور یہ زرہ میری طرف سے ہدیہ ہے میں نے وہ رقم اور زرہ لا کر حضورؐ کے سامنے رکھ دی اور سارا ماجرا سنایا حضورؐ نے عثمان کے حق میں دعا فرمائی اور رقم ابوبکر صدیق کے حوالے کی کہ جاؤ میری بیٹی کے لیے سامان ضرورت جو اس کے لیے مناسب ہو خرید

قال ابو بكر وكانت الدراهم التي دفعها الي ثلاثة وستين درهما قال انطلقت الى السوق فاشتريت فراشا ..... الخ

لاؤ اور ان کی مدد کے لیے سلمان فارسی اور بلال کو بھیجا کہ ابوبکر جو سامان خریدے اٹھا لائیں ابوبکر فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے جو رقم مجھے دی تھی وہ ۶۳ درہم تھے۔ چنانچہ میں بازار گیا اور ایک فراش خرید لایا . . . . الخ۔

اس طویل روایت سے کئی امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) حضورؐ کو حضرت علی کی تنگدستی کا علم تھا لیکن وحی کی ہدایت کے مطابق حضرت فاطمہ کا ان سے نکاح کر دیا۔

(۲) حضرت انس کو جن لوگوں کو بلانے بھیجا ان میں سر فہرست اصحاب ثلاثہؓ ہیں۔

(۳) حضرت علی کو زرہ بیچنے کے لیے بازار بھیجا۔

(۴) حضرت علی نے اپنی زرہ حضرت عثمان کے ہاتھ فروخت کی۔

(۵) حضرت عثمان نے زرہ اور اس کی قیمت جو وصول کی تھی حضرت علی کو ہدیتہً دے دی۔ ان کا یہ تحفہ دینا اور حضرت علی کا تحفہ قبول کرنا دونوں کی باہمی محبت کا آئینہ دار ہے۔

(۶) حضور اکرمؐ کا حضرت عثمان کے اس ایثار پر خوش ہو کر ان کے لیے دعا فرمانا حضورؐ کی قدردانی کا مظاہرہ ہے اور حضورؐ کی دعا قبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا

(۷) زوجین کے لیے ضرورت کی مناسب اشیاء خرید لانے پر حضرت ابوبکر کو مقرر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضورؐ کو جہاں ابوبکر کی ذات پر اعتماد تھا وہاں حضرت علی کے حق میں انکی خیر خواہی۔ دوستی اور محبت کا بھی یقین تھا۔

(۸) حضورؐ کو ابوبکر کے معیار انتخاب اور پسند پر کامل بھروسہ تھا یعنی حضورؐ کی پسند اور حضرت ابوبکر کی پسند کا معیار ایک تھا۔

(۹) حضرت سلمان اور بلال کو حضرت ابوبکر کے ہمراہ بھیجنا کہ خرید کردہ اشیاء اٹھا لائیں۔ اس امر کی دلیل ہے کہ حضور اکرمؐ ہر حالت میں حضرت ابوبکر کی فضیلت اور شرف کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔

گذشتہ دو روایات سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت علی اور خلفائے ثلاثہ کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اور حضورؐ کو اس کا علم تھا اس لیے حضرت علی کے خالص گھریلو معاملات میں خلفائے ثلثہ کو مشیر و معاون کی حیثیت سے بلایا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت فاطمہ کا نکاح بحکم خداوندی ہوا تھا۔

اب یہ دیکھئے کہ کتب شیعہ میں حضرت فاطمہ کا ردعمل اور حضرت علی کا سراپا کس انداز میں پیش کیا گیا ہے پہلے حضرت فاطمہ کا ردعمل ملاحظہ ہو۔

(۱) "شیخ طوسی نے بہ سند معتبر جناب صادق سے روایت کی ہے کہ جب رسول خدا نے جناب فاطمہ کو علی بن ابی طالب سے تزویج کیا۔ اور فاطمہ کے پاس تشریف لائے دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں" (جلاء العیون ص۱۴۰)

(۲) "رسول خدا نے فاطمہ سے تخلیہ میں فرمایا کہ اے فاطمہ کیا حال ہے۔ اور تیرا شوہر کیسا ہے جناب فاطمہ نے فرمایا اے پدر بزرگوار میرا شوہر نیک ہے۔ لیکن زنانِ قریش میرے پاس آئیں اور کہا حضرت رسولؐ نے تمہیں ایسے شخص کے ساتھ تزویج کیا جو پریشان حال ہے اور کچھ مال اس کے پاس نہیں ہے" (جلاء العیون ص۱۴۶)

(۳) حضرت علی کا سراپا بزبانی حضرت فاطمہ:-

"جناب فاطمہ سے حضورؐ نے پوشیدہ بیان کیا۔ جناب فاطمہ نے کہا میرا اختیار آپ کو ہے۔ لیکن زنانِ قریش کہتی ہیں کہ علی بزرگ شکم، بلند دست ہیں بند ہائے استخوان گندہ ہیں آگے سر کے بال نہیں۔ آنکھیں بڑی ہیں اور ہمیشہ خندہ دہان اور مفلس ہیں" (جلاء العیون ص۱۴۸)

اس عبارت سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حضرت فاطمہ نے حضرت علی کے اوصاف بیان کئے ہیں یا نقائص البتہ ان الفاظ سے حضرت علی کی جو شکل چشم تصور کے سامنے آتی ہے اس میں ان کی تعریف کی نسبت توہین کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

(۴) "ایک روز رسول خدا کی خدمت میں حاضر تھا کہ ناگاہ جناب فاطمہ گریاں تشریف لائیں جناب رسولؐ نے کہا اے فاطمہ سبب گریہ کیا ہے جناب فاطمہ نے کہا۔ اے پدر! زنانِ

قریش مجھے طعنہ زنی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تمہارے باپ نے تجھ کو مرد پریشان حال کے ہمراہ تزویج کیا ہے جو مالدار نہیں ہے" (جلاء العیون ص۳۶۲)

(۵) علل الشرائع میں ص۱۸۵ سے ص۱۸۹ تک حضرت فاطمہ کی حضرت علی سے ناراضگی کی تفصیل درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ وقت نکاح سے آخر دم تک حضرت علی سے راضی نہیں ہوئیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اگر حضرت علی سے حضرت فاطمہ کی عمر بھر کی ناراضگی سے حضرت علی کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا تو انکی چند روزہ ناراضگی سے (بقول بعض) حضرت ابوبکر کی شان میں کیا فرق آسکتا ہے۔

حضرت فاطمہ کے نکاح کے سلسلے میں یہ امر تو واضح ہو گیا کہ حضرت فاطمہ کو یقیناً اس حقیقت کا علم تو ہو گا کہ یہ نکاح خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اور اللہ کے حکم کی تعمیل کر کے ایک مومن کو جو مسرت حاصل ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر مومن کر سکتا ہے مگر حضرت فاطمہ نے اس حکم کی تعمیل کے ساتھ ساتھ زنان قریش کی بات کو اتنی اہمیت دی کہ رونا بند نہ ہوتا تھا۔ اس تضاد کو کون رفع کرے بہر حال اب اسی نکاح کے سلسلے میں یہ دیکھئے کہ حضور اکرم کے دل میں خلفائے ثلثہ کا مقام کیا تھا۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنی ربی ان ازوج فاطمۃ من علی فانطلق فادع لی ابا بکر و عمر و عثمان وعلیا و طلحۃ و الزبیر و بعددھم من الانصار ۔۔۔۔ انی اشھدکم انی قد زوجت فاطمۃ من علی۔ (کشف الغمہ ص۱۰۴)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے فاطمہ کو علی سے نکاح کر دوں۔ پس تو جا ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر کو جلد اتنے ہی آدمی انصار سے بلا لا ۔۔۔۔۔۔۔ فرمایا میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ فاطمہ کا نکاح علی سے کر دیا۔

(کشف الغمہ ص۱۰۴)

(۲) قال صلی اللہ علیہ وسلم نزل علی جبرائیل فقال یا محمد ان اللہ تبارک و تعالی قد زوج فاطمہ من علی من فوق

حضورؐ نے فرمایا۔ جبرائیل نازل ہوا اور کہا اے محمد اللہ تعالے نے عرش پر فاطمہ کا نکاح علی سے کر دیا۔ اور مقرب ترین فرشتوں

العرش واشهد على ذلك خيار الملائكة تزوجها منه فى الارض واشهد على ذلك خيارا منك ۔

(فصل الخطاب صـ۱۱)

کو نکاح کا گواہ بنایا آپ زمین پر یہ نکاح کر دیں اور اپنی امت کے بہترین آدمیوں کو اس پر گواہ بنائیں۔

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا :۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے حکم تعمیل کے لیے حضورؐ نے جن لوگوں کو دعوت دی انہیں اصحاب ثلثہ سرفہرست ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اس نکاح کے گواہ ان لوگوں کو بنائیں جو بہترین امت ہیں ۔

(۳) حضورؐ نے تعمیل کی للہذا اصحاب ثلثہ بہترین امت ٹھیرے ۔

(۴) جو مقام عرش پر مقرب ترین فرشتوں کا ہے وہی مقام زمین پر اصحاب ثلثہ کا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ رسولِ خدا جن لوگوں کو بہترین امت قرار دیں اور جو مقرب ترین فرشتوں سے مماثلت رکھتے ہوں ان پر اگر کوئی شخص طعن کرے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے خدا ورسول سے کوئی تعلق نہیں۔

اصحاب ثلثہ کے متعلق حضرت علی کی رائے

گذشتہ تین ابواب میں اس امر کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ :۔

(۱) قرآن حکیم سے حضرت علی کی خلافت بلا فصل کیلئے کوئی دلیل نہیں ملتی ۔

(۲) حدیث صحیح سے بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا جو احادیث کتب شیعہ میں ملتی ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا موضوع ہیں اور محدثین کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں ۔

(۳) تاریخ نے ایسے واقعات محفوظ رکھے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے اصحاب ثلثہ سے حضرت علی کے تعلقات سچی محبت اور گہری دوستی کے جذبہ پر مبنی تھے ۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک سچا مسلمان جسے دشمن سمجھتا ہو اس کے ساتھ عمر بھر ایسا برتاؤ کرتا رہے جس سے مخالفت یا دشمنی کا شائبہ تک محسوس نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عام حالات میں

ایسی دنیاداری کی وضع اختیار کر بھی لے تو اپنی نجی مجلسوں اور دوستوں کی محفلوں میں تو اپنے دل کی آگ اگل ہی دیتا ہے ۔ اسی اصول کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی ان حضرات کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے ۔

(۱) حضرت علی نے اپنے عہد خلافت میں ایک مجمع عام میں خطبہ کے دوران فرمایا

اللهم اصلحنا بما اصلحت به الخلفاء الراشدين قيل من هم ۔ قال حبيباى وعماى ابوبكر و عمر اماما الهدى ورجلا قريش والمقتدى بهما بعد رسول الله وشيخا الاسلام من اقتدى بهما عصم ومن اتبع آثارهما هدى الى صراط مستقيم ۔

شافی ۔ ۲: ۴۲۸

اے اللہ جس طرح تو نے خلفائے راشدین کی اصلاح فرمائی اسی طرح ہماری اصلاح فرما۔ پوچھا گیا وہ کون ہیں ؟ فرمایا وہ میرے دوست میرے بزرگ ابوبکر اور عمر ہیں جو ہدایت کے امام ہیں قریش کے دو عظیم فرد ہیں رسول کریمؐ کے بعد مقتدا ہیں اور شیخ الاسلام ہیں جس نے ان کی پیروی کی بچ گیا جس نے انکی اتباع کی صراط مستقیم پر چل پڑا۔

علم الہدی نے یہ روایت امام جعفر اور امام باقر سے بیان کی اور اس کی سند یہ بیان کی وروی عن جعفر بن محمد عن ابیه ان رجلا جاء الى امير المؤمنين عليه السلام فقال سمعتك تقول فى الخطبة آنفا ۔

حضرت علی کے اس خطبہ اور اس اعلان کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔

(۱) یہ خطبہ اس وقت دیا گیا جب آپ عہدہ خلافت پر عملاً متمکن تھے ۔ اقتدار حاصل تھا ۔ نہ کسی کا ڈر تھا نہ لحاظ نہ تصنع کی ضرورت تھی نہ تقیہ کی حاجت ۔ اس لیے دہی کچھ کہا جسے آپ نے حق سمجھا۔

(۲) حضرت علی نے شیخین کو خلفائے راشدین کہا اور ان دو بزرگوں کو شیخین کا لقب سب سے پہلے حضرت علی نے دیا ۔ اگر حضرت علی انہیں غاصب سمجھتے تو بر سرِ منبر ان الفاظ سے یاد نہ کرتے ۔

(۳) حضرت علی انہیں معیاری حیثیت سے اصلاح یافتہ سمجھتے تھے اس لیے اپنے لیے بھی اسی طرح کی اصلاح کی دعا کی۔

(۴) حضرت علی نے انہیں شیخ الاسلام اپنا دوست اور اپنا بزرگ فرمایا۔

(۵) حضرت علی نے انہیں ہدایت کے امام کے لقب سے یاد فرمایا۔ اس لیے جو ان کی امامت کا قائل نہ ہو وہ حضرت علی کی امامت کا قائل کیسے ہو سکتا ہے۔

(۶) حضرت علی نے انہیں معیارِ حق قرار دیا اس لیے فرمایا کہ حضورؐ کے بعد قابلِ اقتداء ہیں

(۷) حضرت علی نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اعلان فرمایا کہ جو شخص ان کی پیروی کرے گا گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ اور صراطِ مستقیم یہی ہے۔

(۸) حضرت علی نے شیخین کو مقتدیٰ فرمایا۔ اس میں خاص نکتہ یہ ہے کہ اقتدا دینی امور میں ہوتی ہے اور ہر حالت اور ہر حرکت و سکون میں ہوتی ہے جیسے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کو مقتدی کہتے ہیں اس لیے حضرت علی نے نہ صرف انہیں خلافت کے باب میں برسرِ حق قرار دیا بلکہ دینی اعتبار سے ان کی برتری اور فضیلت کا اعلان کیا۔

شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ نے ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں حضرت علی کا ایک ارشاد نقل کیا ہے۔

خیر ھذہ الامۃ بعد نبیھا ابوبکر و عمر و فی بعض الاخبار و لو شئت ان اسمی الثالث لسمیت۔ (شافی ۱:۱۷۱)	نبی کریمؐ کے بعد اس امت کے بہترین آدمی ابوبکر اور عمر ہیں اور بعض روایتوں میں ہے کہ اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں

ایک روایت میں مزید تفصیل بیان فرمائی ہے۔

روی ابو جحیفۃ و محمد بن علی و عبد خیر و سوید بن غفلۃ و ابو حکیم و غیرھم و قیل اربعۃ عشر رجلا ان علیا علیہ السلام قال فی خطبۃ خیر ھذہ الامۃ بعد نبیھا ابوبکر و عمر و فی بعض الاخبار انہ علیہ السلام خطب بذلک بعد ما انھی الیہ ان رجلا تناول ابابکر و عمر بالشتمۃ فدعا بہ و تقدم بعقوبتہ بعد ان شھد و اعلیہ بذلک (۲: ۴۲۸)	ابو جحیفہ وغیرہ چودہ آدمیوں سے روایت ہے کہ حضرت علی نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اس امت کے بہترین آدمی ابوبکر اور عمر ہیں بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے یہ خطبہ اس وقت دیا جب انہیں اطلاع ملی کہ کسی نے شیخین کے حق میں بُرا بھلا کہا چنانچہ آپ نے اسے طلب کیا اور شہادتیں لیکر اسے سزا دی۔

اس روایت کے ۱۴ راوی ہیں اس میں بتایا گیا کہ حضرت علی نے برسرِ منبر اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ اس امت کے سب سے بہتر شیخین ہیں۔ دوسری روایت سے ظاہر ہے کہ شیخین کو بُرا بھلا کہنا صرف گناہ نہیں بلکہ قابلِ تعزیر جرم ہے۔ چنانچہ آپ نے شہادتیں لیکر ایسے لوگوں کو سزا دی اب کون تسلیم کرے کہ حضرت علی ان بزرگوں کو بُرا سمجھتے تھے یا بُرا کہتے تھے۔ جب انہوں نے شیخین کی شان میں بے ادبی کے الفاظ سننا گوارا نہ کیا اور عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ زبان خاموش کر دینے کے لائق ہے جس سے ان حضرات کی شان میں گستاخی کے کلمات نکلیں۔

حضرت عثمان پر ایک الزام

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان نے مصر کے حاکم عبداللہ بن ابی سرح کو اپنے غلام کے ہاتھ ایک خط بھیجا کہ محمد بن ابی بکر جب تیرے پاس آئے تو اسے قتل کر دینا۔ خط پر حضرت عثمان کی مہر تھی اس لیے یہ خط لازماً انہوں نے لکھا اور اسی وجہ سے حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خبر میں صدق و کذب کا احتمال ہوتا ہے خبر ہو بھی سکتی ہے اور بنائی بھی جا سکتی ہے اس لیے اصل بات معلوم کرنے کے لیے تحقیق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بلا تحقیق کسی ایسی خبر کو تسلیم کر لینا جسے عقلِ سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ نیت کے کھوٹ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس خبر کی تحقیق کی جائے تو یہ تاریخی حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس واقعہ کے سلسلے میں ایک خط پر موقوف نہیں کئی خطوں کا سراغ ملتا ہے۔

(۱) معترضین کے وفود جب حضرت عثمان کے پاس شکایت لے کر آئے تو آپ نے حقائق پیش کر دئے۔ اور وہ لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے وطن کوفہ، بصرہ اور مصر کو لوٹ گئے۔ مگر ان میں سے دو آدمی۔ اشتر اور حکیم بن جبلہ مدینہ میں رہ گئے۔ انہوں نے دو آدمی کرایہ پر لیے ایک کو مصری فوج کے پیچھے بھیجا دوسرے کو کوفی اور بصری فوج کی طرف روانہ کیا۔ اور انہیں فوجی کمانڈروں کے نام خط دئے۔ ایک قاصد کے متعلق ملتا ہے کہ

وصل الی قافلۃ العراقیین فی الطریق الشرقی	ایک اور شخص مشرقی جانب سے عراقی قافلہ

رجل أخرجتمل اليهم كتابا مختوما بخاتم علی ابن ابی طالب یأمرهم فيه بالعود الی المدينة (العواصم)

کو اوران کی طرف ایک خط لے جارہا تھا جس پر حضرت علی کی مہر تھی اس میں انہیں حکم دیا گیا تھا کہ مدینہ واپس آجاو۔

جب عراقی واپس آئے تو حضرت علی سے ان کی گفتگو ہوئی۔

فقال للعراقيين وانتم ماذا رجعكم فقالوا انه كتب الينا كتابا يأمرنا بالعود. فحلف بالله انه لم يكتب لهم ولا علم له بذلك فتبين انه كان بين مكذوبين على عثمان وعلى.

(العواصم صـ ۱۲۸)

حضرت علی نے عراقیوں سے کہا تمہیں کونسی چیز واپس لائی انہوں نے کہا کیا آپ نے ہمیں واپس آنے کا حکم نہیں لکھ بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا کیا آپ نے ہمیں واپس آنے کا سلم نہیں لکھ بھیجا تھا۔ انہوں نے اللہ کی قسم کھائی کہ میں نے نہ کوئی خط لکھا ہے نہ اس کا مجھے کچھ علم ہے۔ بات واضح ہوگئی کہ عراقیوں اور مصریوں کے نام دونوں خط جھوٹ محض تھے۔ حضرت علی اور حضرت عثمان پر بہتان لگایا گیا (ایک نے فوج کو واپس بلایا یا دوسرے نے محمد بن ابی بکر کے قتل کا حکم دیا)

دوسری روایت ہے

فقالوا له لم قدمتنا الی عثمان. قال والله ما اقدمکم فقالوا فلم کتبت الینا قال والله ما کتبت الیکم فنظر بعضهم الی بعض وخرج علی

انہوں نے حضرت علی سے کہا اٹھئے اور ہمارے ساتھ عثمان کے پاس چلئے۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ وہ کہنے لگے پھر آپ نے ہمیں واپس آنے کا خط کیوں لکھا۔ فرمایا خدا کی قسم میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا اس پر وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

حضرت علی کے حلفیہ بیان سے ظاہر ہے کہ یہ خط اور مہر دونوں جعلی تھے۔ اگر حضرت عثمان سے منسوب خط کو اصلی تسلیم کیا جاتا ہے تو اسے کیوں نہ اصلی تسلیم کیا جائے۔ اگر حضرت علی کا خط انہیں کا تسلیم کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت علی ہی حضرت عثمان کے قاتل تھے۔ دوسری یہ بات ماننی پڑے گی کہ حضرت علی نے جھوٹی قسم کھائی مگر یہ دونوں باتیں حضرت علی کی شان کے خلاف ہیں۔ لہٰذا دوسری صورت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ خط جعلی تھا اور اس پر جو مہر لگائی گئی وہ بھی بناوٹی تھی۔ غرض یہ تھی کہ کسی بہانے حضرت عثمان کو قتل کیا جائے۔

بلوائی جب حضرت عثمان کے پاس وہ خط لیکر آئے تھے تو انہوں نے بھی اسی قسم کا جواب دیا تھا۔

فانطلقوا الی عثمان فقالوا له كتبت فيه كذا فقال انما هما اثنين من المسلمين او يميني انه ما كتبت ولا امرت وقد يكتب على لسان الرجل ويضرب على خطه وينقش خاتمه

وہ لوگ خط لے کر حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ نے اس میں یہ لکھا ہے۔ انہوں نے فرمایا دو مسلمان گواہ پیش کرو یا مجھ سے قسم لے لو میں نے نہ لکھا ہے نہ حکم دیا ہے ہاں کسی شخص کے نام سے خط لکھا جا سکتا ہے اور جعلی مہر بھی بنائی جا سکتی ہے۔ مگر انہوں نے کوئی بات نہ مانی۔

(۲) علامہ محب الدین خطیب نے حواشی المنتقی امام ذہبی کے صـ ۲۷۷ تا ۲۷۹ پر اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ مصر میں اصل فتنہ اٹھانے والا محمد بن ابی حذیفہ تھا یہ حضرت عثمان کا ربیب تھا۔ اس نے حضرت عائشہ اور دوسری امہات المؤمنین کے نام فرضی خطوط بنائے تھے۔ جو جامع عمر فسطاط میں لوگوں کو پڑھ کر سناتا تھا۔

حضرت عائشہ نے حضرت عثمان کی شہادت کے بعد لوگوں سے فرمایا تم لوگوں نے حضرت عثمان کی مددنہ کی کتنی بری بات ہے۔ تو جلیل القدر تابعی حضرت مسروق نے کہا۔

قال مسروق فقلت لها هذا عملك كتبت الی الناس تامرينهم بالخروج عليه فقالت عائشة

مسروق کہتے میں نے حضرت عائشہ سے کہا یہ آپ ہی کا کام ہے آپ نے مصریوں کو لکھا

والذی آمن به المؤمن وکفر به الکافر ما کتبت الیہم بسوداء فی بیاض.

(حاشیہ محب الدین خطیب صفحہ ۱۰۹، العواصم صفحہ ۱۳۶)

کہ بغاوت کریں۔ فرمایا قسم اس ذات کی جس پر مومن ایمان لایا اور کافر نے جس کا انکار کیا میں نے مصریوں کو کچھ نہیں لکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرضی خط لکھنا اور جعلی مہریں بنانا باغیوں کی تکنیک کا ایک حصہ تھا۔ لہٰذا امہات المؤمنین، حضرت علی اور حضرت عثمان سے جو خط منسوب کئے گئے وہ سب کے سب فرضی تھے۔ باغیوں کا اصل مقصد حضرت عثمان کو قتل کرنا تھا جب حقیقی وجہ کوئی موجود نہ تھی تو انہیں جھوٹ کا یہ جال بننا پڑا۔

اس مفروضہ کے خلاف ایک اور شہادت

عبداللہ بن ابی سرح کے نام اس خط کے بھیجنے کا جو وقت بتایا جاتا ہے اس وقت وہ مصر میں موجود ہی نہیں تھے۔ اس لیے ایسی حالت میں یہ خط بھیجنے میں کیا تک ہے۔

ان عبداللہ بن ابی سرح لیس فی مصر فی هذا الوقت انه استاذن الخلیفة بالمجیئ الی المدینة فکیف کتب الیه عثمان او مروان الی مصر وهما یعلمان انه لیس فی مصر۔

(حواشی محب الدین خطیب صفحہ ۳۷۹)

عبداللہ بن ابی سرح اس وقت مصر میں موجود ہی نہیں تھے انہوں نے حضرت عثمان سے مدینہ آنے کی اجازت مانگی تھی جب حضرت عثمان اور مروان کو علم تھا کہ وہ مصر میں موجود نہیں تو انہیں خط بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور ابن جریر لکھتے ہیں

وعن غیر معقول ان یکتب عثمان او مروان بذلك الکتاب الی ابن ابی سرح وهما یعلمان انه کان قد اذن بالقدوم الی المدینة۔

(طبری ۵ : ۱۲۲)

یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ حضرت عثمان یا مروان حاکم مصر کو اس وقت خط بھیجیں جب انہیں علم تھا کہ وہ مدینہ آنے کی اجازت لے چکے ہیں۔

وانه عند ظهور الکتابین مزورین کان

ان جھوٹے خطوط کے ظاہر ہونے کے وقت

فی الطریق بین فلسطین والمدینة ولعله بلغ العقبة (ایضاً)

ابن ابی سرح فلسطین اور مدینہ کے درمیان وادی عقبہ میں پہنچ چکے ہوں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خط کا واقعہ بالکل فرضی ہے۔

یہاں ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ ابن ابی سرح کو حضرت عثمان نے اس لیے بلایا تھا کہ پوشیدہ طور پر انہیں محمد ابن ابی بکر کو قتل کرنے کا حکم دینا چاہتے تھے۔

یہ اس امر کی شہادت ہے کہ ایک جھوٹ کو سچ کرنے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ مگر جھوٹ پھر بھی جھوٹ ہی رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حاکم مصر کو اس غرض سے بلا بھیجا تھا تو خط کیوں لکھا؟ اگر خط لکھا تو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ کہ "وہ چاہتے تھے" کا علم آپ کو کیسے ہوا؟ اگر یہ راز ان کے دل میں تھا تو آپ تک کیسے پہنچا اگر عمداً آپ تک پہنچا دیا تو راز کیسے رہا؟ اور اگر آپ کو ان کے دل کے ارادہ کی کسی طرح اطلاع مل گئی تو کیا ارادۂ قتل کی سزا قتل ہے؟ اگر نہیں تو حضرت عثمان کو واجب القتل کس قانون سے قرار دیا گیا؟

معاملہ بالکل برعکس ہے حضرت عثمان برسر اقتدار تھے۔ بلوائیوں کی سرکوبی کے لیے حکم دے سکتے تھے مگر مدینۃ الرسول میں یہ منظر دیکھنا گوارا نہ کیا کہ مسلمان کی تلوار مسلمان کے خلاف چلے انہوں نے بلاوجہ محمد ابن ابوبکر کے قتل کا حکم دیا عقل سلیم کیسے تسلیم کر سکتی ہے۔

وقد سعوا فی قتله ودخل علیه محمد فیمن دخل وهو لا یأمر بقتلهم وقتالهم دفعاً عن نفسه فکیف یبتدأ بقتل معصوم الدم.

بلوائیوں نے قتل عثمان کی کوشش کی۔ ان کے گھر میں داخل ہونے والوں میں محمد ابن ابوبکر بھی تھا مگر اس وقت بھی حضرت عثمان نے اپنی مدافعت کیلئے یا انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ بے قصور محمد ابن ابوبکر کے قتل کا حکم دیں۔

. . . . . .

چند مخصوص شخصیتوں کی سیرت و کردار کا جائزہ لیا جائے تو اس منصوبے کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

(۱) بصرہ میں حکیم بن جبلہ۔ العواصم صفحہ ۱۱۵ پر موجود ہے کہ اس کی پیدائش عمان میں

ہوئی۔ بصرہ میں قیام پذیر ہوا طبعاً مفسد اور ہنگامہ پسند تھا عوام نے اس کے خلاف حضرت عثمان سے شکایت کی انہوں نے عبداللہ بن عامر حاکم بصرہ کو لکھا کہ اسے پابند مسکن کر دیا جائے۔

(۲) مصر میں۔ محمد بن ابی حذیفہ :۔ حواشی المنتقی صفحہ ۳۹۷ پر لکھا ہے کہ یہ شخص حضرت عثمان کا ربیب تھا شر انگیزی اس کی فطرت تھی۔ اس نے حضرت عائشہ صدیقہ اور دیگر ازواج مطہرات کی طرف سے فرضی خطوط بنائے فسطاط کی جامع عمر میں یہ خطوط لوگوں کو سناتا تھا اور انہیں بغاوت پر آمادہ کرتا تھا۔ مصر کے باغیوں کا سردار یہی شخص تھا۔

(۳) عبداللہ بن سبا :۔ اصل میں یہودی تھا۔ منافقانہ طور پر اسلام لایا۔ بصرہ میں گیا اسے اپنے مطلب کا آدمی حکیم بن جبلہ مل گیا۔ پھر اسے مصر میں بھیج دیا گیا۔

فنزل علی حکیم بن جبلہ واجتمع الیہ نفر فنفث فیہم سمومہ فاخرج عبد اللہ بن عامر عبد اللہ بن سبا من البصرۃ الی فسطاط وبعث فیہ وجعل یکاتبہم ویکاتبونہ	ابن سبا حکیم بن جبلہ کے ہاں فروکش ہوا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اس نے ان میں خوب زہر پھونکا۔ پھر حاکم بصرہ نے ابن سبا کو فسطاط بھیج دیا۔ وہ فسطاط میں مقیم رہا اور بصرہ کے لوگوں سے اس کی خط وکتابت جاری رہی۔
(۴) کوفہ :۔ وکان الاشتر مع خوارج الکوفۃ رئیساً علی فرقۃ۔ (العواصم صفحہ ۱۱۸)	کوفہ میں اشتر، خوارج کی فوج کا سردار تھا۔
(۵) غافقی زرب عثمان بحدید لا معہ وضرب القرآن برجلہ (العواصم ۱۱۲)	

کوفہ بصرہ اور فسطاط بغاوت کے مرکز تھے اور ان پانچ مفسدوں نے وہاں قدم جما رکھے تھے ان میں ابن سبا مرکزی شخصیت تھی۔

ومن الثابت ان ابن سبا کان مع ثوار مصر عند مجیئہم من الفسطاط الی المدینۃ۔	اور یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ عبداللہ بن سبا مصری جماعت کے ساتھ تھا جب وہ مصر سے مدینہ میں آئی۔

عبداللہ بن سبا یہودی کی سازش کا نشانہ حضرت عثمان کی ذات نہیں تھی بلکہ اس طویل المدت

منصوبے کی تہ میں ایک اور جذبہ کام کر رہا تھا جس کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) غرض یہ تھی کہ اصحاب رسول کو سازشی جھوٹے اور ناقابل اعتبار ثابت کیا جائے تاکہ صحابہ کے ذریعے جو دین آئندہ نسلوں کو منتقل ہوگا اس پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ چنانچہ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابن سبا اس سازش میں کامیاب ہوگیا اور اس کی پیروی میں ایک کثیر جماعت معرض وجود میں آئی جس کے نزدیک صحابہ کرام کی پوری جماعت یا تو منافق تھی یا نقیبہ باز۔ اور ان دونوں اصطلاحوں کا ماحصل یہ ہے کہ سب جھوٹے تھے۔ اس لیے انہیں برا بھلا کہنا عبادت قرار پایا۔

ابن سبا کی اس تدبیر کا اثر ایک تو یہ ہوا قرآن حکیم جو دین اسلام کی بنیادی تعلیمات کا مجموعہ ہے اسے ناقابل اعتماد قرار دیا گیا۔ کیونکہ قرآن کے جمع کرنے والے اس کی حفاظت کرنے والے اسے آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے والے جب ناقابل اعتبار تھے تو اس کتاب کی لفظی اور معنوی حیثیت کیسے قابل اعتبار قرار دی جا سکتی۔ لہٰذا برملا یہ کہا گیا کہ یہ قرآن جعلی ہے۔ محرف ہے اس میں کمی بیشی ہوئی ہے۔ یعنی ایمان بالکتب کے عقیدے میں یوں نقب لگا دی گئی۔

دوسرا اثر یہ ہوا صحابہ کی سیرت کو داغدار کرنے کے بعد انہیں برا بھلا کہنا عبادت سمجھا گیا اور صحابہ سے دشمنی اس انتہا کو پہنچی کہ مرنے کے بعد بھی انہیں معاف نہیں کیا گیا جیسا کہ محب طبری نے ریاض النضرہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب میں اور علامہ ابراہیم عبیدی مالکی نے عمدۃ التحقیق فی بسائر آل الصدیق صفحہ ۲۲۵ پر فرمایا

ان جماعۃ من الروافض اتوا الی خادم حجرۃ رسول اللہ بمال جزیل لیوصلہ الی ناظر الحرم ویمکنہم من نقل ابی بکر وعمر فقبل الناظر ذلک سراً وبقی الخادم فی تشویش عظیم ما بقی الا ان اللیل	(حلب کے) شیعوں کی چالیس آدمیوں کی ایک جماعت مدینہ آئی مال کثیر ساتھ تھا کہ خادم روضۂ رسول کے ذریعے والی مدینہ کو پہنچائیں تاکہ وہ شیخین کی میتیں روضۂ رسول سے نکال کر لے جائیں۔ پھر خود حاکم مدینہ کے پاس گئے کہ وہ خادم کو حکم دے

يدخلوا ويأتوا بالمساحي والزنابيل ويحفرون عليها وكانوا اربعين رجلا ..... انهم لما دخلوا المسجد في الليل خسف الله بهم الارض اجمعين و طلع الجذام في الناظر حتى تقطعت اعضاءه ومات على اسوء حال۔

کہ ہم رات کس وقت مسجد میں داخل ہونا چاہیں تو وہ مانع نہ ہو حاکم نے مال لے کر اجازت دے دی کہ قبریں کھود کر نکال لے جائیں خادم بڑا فکر مند ہوا۔ رات گئے وہ گینتی بیلچے لے کر مسجد میں داخل ہوئے اور زمین ان سب کو نگل گئی اور حاکم مدینہ جذام میں مبتلا ہوا اس کے اعضا کٹ کٹ کر گرنے لگے اور نہایت ذلت کی موت مرا۔

ابن سبا نے جس ہوشمندی سے حضور اکرمؐ کے ورثہ کو مٹانے کی منصوبہ بندی کی تھی وہ اپنی معراج پہ پہنچ گئی گو خدائے غیور کو اپنے محبوب پیغمبر کے جان نثار صحابہ کا جس قدر پاس تھا اس کا منظر بھی سامنے آگیا ہے جان زمین خدائے غیور کے حکم سے دشمنان صحابہ کو جیتے جاگتے نگل گئی آج تک اس مقام پر ایک سیاہ پتھر سارے فرش سے الگ نظر آتا ہے اور دیکھنے والوں کو زبان حال سے دعوت دیتا ہے۔ ع

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اس واقعہ خسف کے ساتھ ایک ضمنی واقعہ بھی پیش آیا۔ ان چالیس "رضا کاروں" کی پشت پر ایک کثیر جماعت مسجد نبوی سے باہر موجود تھی خادم کے شور مچانے پر وہ بہت غضبناک ہوئے انہوں نے خادم سے انتقام لینے کی یہ سکیم بنائی کہ اسے دھوکہ سے ایک مکان میں لے گئے اور اس کی زبان کاٹ دی۔ عمدۃ التحقیق ص۲۲۷ پہ اس کی تفصیل یوں دی گئی ہے۔

ثم ان جماعة من الروافض الذين ارسلوا الاربعين لما سمعوا خبر الخسف وعملوا الحيلة على الخادم وادخلوه دارا لا ساكن فيها وقطعوا لسانه ومشوا به لجوار النبي صلى الله

ان چالیس آدمیوں کو اندر بھیجکر ان کے ساتھی جو باہر کھڑے تھے خادم کا شور سن کر خادم کو قابو کرنے کا حیلہ سوچنے لگے آخر اسے ایک ویران مکان میں لے گئے اس کی زبان کاٹ دی اور اس کا مثلہ کیا۔ وہ روضۂ اقدس پہ حاضر ہوا۔

عليه وسلم فسح عليه وعلى فمه فاصبح ولیس به ضرر ثم عملوا حيلة ثانيا وقطعوا لسانه وضربوه ضربا شديدا فجاء الى النبي صلى الله عليه فاصبح وما به ضرر فعملوا الحيلة ثالثا وضربوه وقطعوا لسانه فجاء الى النبي فسح فاصبح ما به ضرر

حضورؐ نے (خواب میں) اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا صبح اٹھا تو تمام اعضاء درست تھے۔ اس کے بعد انہوں نے دو دفعہ اور یہی حیلہ کیا اور حضورؐ نے اسی طرح شفقت فرمائی اور وہ صبح اٹھتا تو صحیح سلامت ہوتا۔

خدائے غیور کو اپنے حبیبؐ کے جاں نثاروں کا جو پاس تھا اس کا ثبوت واقعہ خسف سے ملتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رفقاء سے جو محبت ہے اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جو زبان صحابہ کی حفاظت کی خاطر حرکت میں آئی دشمنان صحابہ اسے کاٹتے رہے اور حضورؐ اسے خواب میں جوڑتے رہے اور وہ خواب عالم بیداری میں حقیقت نفس الامری بن کر سامنے آتی رہی۔ یعنی حضورؐ کے صحابہ کے ناموس کی خاطر جو شخص نقصان اٹھائے گا اس کی تلافی حضورؐ خود فرمائیں گے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ امام یافعی نے کفایۃ المعتقدین اور جامع کرامات اولیاء اللہ ۲ ؍ ۴۴ پر اور اسالیب بدیعہ فی فضل الصحابۃ و اقناع الشیعہ میں درج ہے ایک عارف کامل عمر بن مبارک حج کے لیے آئے روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت حضورؐ کی نعت اور مدح شیخین میں دردناک شعر پڑھے۔ ان اشعار میں شیخین کی اسلامی خدمات کا ذکر تھا۔ جب مسجد سے باہر آئے تو ایک شخص انہیں بلا کر گھر لے گیا۔ اندر گئے تو دروازہ بند کیا اور ان کی زبان کاٹ دی۔ وہ ٹکڑا ان کے ہاتھ میں دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے رات جب سو گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ مع شیخین تشریف لائے ہیں حضورؐ نے زبان کا کٹا ہوا ٹکڑا اس سے لیا اور زبان کے ساتھ لگا دیا۔ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ٹکڑا غائب ہے اور زبان بالکل درست ہے دوسرے سال پھر یہی قصہ دہرایا۔ جب قصیدہ پڑھ چکے تو ایک شخص نے انکی دعوت کی اور گھر لے گیا جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہی گذشتہ سال والا مکان ہے۔ خیر اندر گئے کھانا کھایا پھر وہ آدمی انہیں ایک اور کمرے میں لے گیا۔ دیکھا کہ ستون سے ایک بندر بندھا ہے میزبان نے کہا یہ میرا والد ہے۔ یہ شیعہ تھا۔ گذشتہ برس اس نے آپ کی زبان کاٹی تھی رات کو چنگا بھلا سویا

صبح دیکھا تو اس کی شکل بندر کی تھی میں نے یہاں باندھ دیا کہ باہر نکلا تو رسوائی ہو گی میں نے اس کی حالت دیکھ کر شیعہ مذہب سے توبہ کر لی ہے۔ اب آپ اس کے لیے دعا فرما دیں۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حفظ ناموس صحابہ کے جرم میں دشمن صحابہ نے ایک شخص کی زبان کاٹ دی۔ حضور اکرمؐ نے اس کا علاج کر دیا اور خدائے غیور نے اس دشمن کی صورت ہی مسخ کر دی۔ واقعی اللہ اور رسول کو ناموس صحابہ کا بڑا پاس ہے۔

ان دو واقعات کا ضمناً ذکر کرنے کے بعد اب ہم اصل مضمون کی طرف آتے ہیں ابن سبا کے اسی منصوبہ کے تحت حضرت علی کی طرف سے خط بنانا اور حضرت عثمان کی طرف خط لکھنا اس مقصد کے لیے تھا کہ یہ جلیل القدر صحابہ سازشی اور جھوٹے مشہور کئے جا سکیں۔

۲۔ ازواج مطہرات کی طرف سے جھوٹے خط بنانا اس غرض کیلئے تھا کہ رسولؐ کے گھرانے پر سے امت کا اعتماد اٹھ جائے۔ اور دین سیکھنے کیلئے ازواج مطہرات کی طرف رجوع کرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ چنانچہ یہ یہودی ذہنیت کام کر گئی اور ابن سبا کی فکری لائنوں پر ایک جماعت اٹھی اور اس نے ان ہستیوں کو تہمت کا نشانہ بنایا جن کو اللہ تعالےٰ نے امہات المؤمنین کا لقب دیا تھا۔

۳۔ خلافت راشدہ وہ ہیئت حاکمہ تھی جس کے ذریعے احکام اسلامی اور حدود شرعی کا اجرا ہوتا تھا ابن سبا کی سکیم یہ تھی کہ خلیفہ ثالث کی سیرت کو مجروح کر کے عوام کو ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے اور اسلام کے خلاف فکری انقلاب کے ساتھ ساتھ عملی انقلاب بھی لایا جائے اور خلافت راشدہ سے اعتماد اٹھ جائے۔ ان باغیوں نے حضرت عثمان کو نشانہ بنایا اور خوارج نے حضرت علی کو مقصد دونوں کا ایک تھا کہ خلافت راشدہ کی معیاری حیثیت مجروح ہو جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی اسلامی حکومتوں کے زوال کا سبب زیادہ تر روافض ہی بنتے رہے۔ چنانچہ علامہ انور شاہ کاشمیری لکھتے ہیں۔

ان المجاھدین لیسوا الامن اھل السنۃ ویشھد لہ التاریخ فانہ لم یوافق للجھاد احد غیر تلک الطائفۃ	"تاریخ شاہد ہے کہ مجاہدین ہمیشہ اہل السنت میں سے ہوئے ہیں ان کے بغیر جہاد کی توفیق

واکثر تخریب السلطنۃ الاسلامیۃ کان علی ایدی الروافض (فیض الباری ص۱۷۲)	کسی کو نہیں ہوئی۔ اور اکثر اسلامی سلطنتوں کی تباہی روافض کے ہاتھوں ہوئی۔

فتنہ تاتار کو طامۃ الکبریٰ کہا گیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتاب الاذاعۃ لما کان ومایکون بین یدی الساعۃ ص۸۶ اور علامہ ابن قیم نے اغاثۃ اللہفان ۲ : ۲۶۳ پر لکھا ہے کہ اس فتنے میں اکابر شیعہ میں سے نصیر الدین طوسی کا ہاتھ تھا۔ یہ ہلاکو خان کا وزیر تھا اس نے اپنی وزارت کے زور سے مساجد برباد کرائیں قرآن کی جگہ بوعلی سینا کی "اشارات" کی ترویج کی اور اس امر پر زور دیا کہ یہ قرآن عوام کے لیے تھا۔ خواص کیلئے "اشارات" ہی قرآن ہے اس کی کوشش تھی کہ اسلام مٹ جائے اور فلسفہ نجوم جادو وغیرہ کی تعلیم رواج پائے دوسری طرف عباسی خلیفہ کا وزیر ابن علقمی شیعہ تھا جس نے اپنی حکمت عملی سے ہلاکو خان کی کامیابی کی راہ ہموار کی۔ سقوط بغداد تاریخ اسلامی میں ایک عظیم المیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ اس سے ساڑھے چھ سو سال کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس "کار خیر" میں عظیم ترین حصہ لینے والے دونوں حضرات شیعہ تھے۔

مختصر یہ کہ قتل عثمان کا پس منظر ایک انسان کی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں تھی بلکہ دین اسلام کی فکری اور عملی بنیادوں کو مسمار کرنے کا طویل المدت منصوبہ تھا۔ اور چونکہ حضرت عثمان دین اسلام کی فکری اور عملی صورت کی SYMBOL بن چکے تھے اس لیے انہیں نشانہ ستم بنایا گیا۔ ہر انسان کو آخر مرنا ہے۔ لیکن اس منصوبے سے دین اسلام کی عمارت میں جو نقب لگائی گئی وہ آج تک ختم ہونے کو نہیں آئی۔

باغ فدک

یہ مسئلہ شیعہ عقائد میں داخل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضورؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو اسے محروم کر دیا گیا۔ وہ اپنے والد گرامی کی جاگیر باغ فدک کا مطالبہ لیکر خلیفۂ اوّل حضرت ابو صدیق کے پاس گئیں مگر انہوں نے مطالبہ پورا نہ کیا اس لیے وہ طعن کا نشانہ بن گئے۔

یہ بات اس لحاظ سے دین کا حصہ ہے کسی کو محروم الارث کر دینا ایک ظلم ہے اور ظلم کو عدل قرار دینا تو اس سے بڑا ظلم ہے پھر اس لحاظ سے اس کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے کہ اس فعل کی نسبت اس ہستی سے کی گئی ہے جسے حضرت فاطمہ کے والد گرامی نے اپنی زندگی میں امت کا امام مقرر کیا تھا اور ان کے شوہر حضرت علی نے اپنے عہد خلافت میں برسر منبر اعلان کیا کہ یہ شخص ساری امت سے افضل ہے۔

اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) فدک کیا ہے (۲) فدک کی حدود کیا ہیں (۳) یہ جاگیر حضورؐ کے قبضہ میں کیونکر آئی (۴) اس میں حضورؐ کا تصرف مالکانہ تھا یا متولیانہ (۵) اس کی سالانہ آمدنی کتنی تھی۔ (۶) حضورؐ کے زمانہ میں اس آمدنی کا مصرف کیا رہا (۷) حضرت فاطمہ نے میراث کا مطالبہ کیا تھا یا ہبہ کا (۸) اگر ہبہ کا مطالبہ کیا تو مضمون دعویٰ کیا تھا (۹) کیا حضور اکرمؐ نے حضرت فاطمہ کے حق میں اس کی وصیت کی تھی (۱۰) کیا انبیاء کی میراث مالی ہوتی ہے یا علمی (۱۱) صدیق اکبر نے اس مطالبہ پر جو فیصلہ کیا تھا وہ شریعت محمدی کے مطابق تھا یا اس کے خلاف۔

(۱۲) خلیفہ اوّل کے بعد باقی تین خلفاء کے عہد میں اس کا مصرف کیا رہا (۱۳) اگر انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی تو وہ اس جرم سے بری کیونکر بری قرار دئے جا سکتے ہیں۔ یہ تمام پہلو زیر بحث آئیں گے۔

۱۔ فدک کیا ہے اس کی حدود کیا ہیں:۔

مورخین کا فیصلہ:۔

وأما فدك وهي بفتح الفاء والمهملة بعدها كاف بلد بينها وبين المدينة ثلاث مراحل وكان من شأنها ما ذكر أصحاب المغازي قاطبة أن أهل فدك كانوا من يهود فلما فتحت خيبر أرسل أهل فدك يطلبون النبي صلى الله عليه وسلم الأمان على أن يتركوا البلد ويرحلون۔

فدک۔ فا کی زبر سے ہے مدینہ سے تین منزل پر واقع ہے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اہل فدک یہودی تھے جب خیبر فتح ہوا تو اہل فدک نے حضورؐ سے امان طلب کی کہ انہیں بستی چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

یعنی فدک۔ مدینہ منورہ سے تین منزل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا جس میں یہودی آباد تھے۔

لسان العرب میں لکھا ہے کہ فدک ایک گاؤں ہے جو حجاز میں واقع ہے۔ مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع میں لکھا ہے کہ فدک، حجاز میں ایک گاؤں ہے جو مدینہ طیبہ سے دو یا تین دن کی مسافت پر ہے اور اسے اللہ تعالے نے اپنے رسول کو فے کیا تھا صلحاً حاصل ہوا تھا۔ اس میں پانی کے چشمے اور کھجوریں تھیں۔

یعنی اہل لغت، اہل تاریخ اور جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں کہ فدک ایک گاؤں تھا۔ جس میں یہودی آباد تھے۔

علمائے شیعہ کے نزدیک فدک کی حقیقت:۔

(۱) شیعہ مجتہد ملا باقر مجلسی نے کتاب اختصاص سے امام جعفر سے بسند معتبر فدک کی حدود بیان کی ہیں۔

(۲) من روزے در خانۂ فاطمہ نشستہ بودم کہ جبرئیل نازل شد وگفت یا محمد برخیز کہ خدا امرا امر کردہ است کہ ملک فدک را برائے تو بکشم بہ بال خود۔ پس حضرت برخاست ورفت و بازدر اندک زمان برگشت فاطمہ گفت کجا رفتی اے پدر! فرمود کہ جبرئیل برائے من بہ بال خود مملکت فدک را خط کشید و حدودش را بمن نمود۔ و مرا امر کرد کہ تسلیم بتو نمائم

میں ایک روز فاطمہ کے گھر بیٹھا تھا کہ جبریل آئے اور کہا کہ اے محمدؐ اٹھئے مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ ملک فدک کی حدود کی نشاندہی کر دوں پس حضورؐ اٹھ کر چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹے۔ فاطمہ نے کہا ابا جان آپ کہاں گئے تھے۔ فرمایا کہ جبرئیل نے فدک کی سلطنت کی حدود بتانے کے لیے اپنے پروں سے ایک خط کھینچا اور ربّ نے حکم دیا ہے کہ یہ

پس حضرت ۔ فدک را باو تسلیم کرد۔
(حیاۃ القلوب ۲: ۵۰۳)

سلطنت تیرے حوالے کردوں ۔ چنانچہ حضورؐ نے فدک کی سلطنت ان کو دے دی ۔

یعنی فدک ایک ملک تھا ایک سلطنت تھی ۔

(۲) ابن شہر آشوب روایت کردہ است کہ حضرت رسول چوں متوجہ قلعہاے فدک شد ایشاں بہ قلعہ ہائے حصین خود متحصن شدند۔ ایشاں را آنجنابؐ طلبید وگفت کہ چہ خواہید کرد اگر شمارا دریں قلعہ بگذارم وجمیع قلاع شمارا بکشائم واموال شمارا متصرف شوم ایشاں گفتند ما دراں قلعہا محافظاں داریم وکلید ہائے آنہا نزد ماست ۔ حضرت فرمود بلکہ کلید ہائے آنہا را بمن دادہ است ودر دست من است وکلید ہائے بایشاں نمود۔
(حیاۃ القلوب ۲: ۵۰۳)

ابن شہر آشوب نے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے جب فدک کے قلعوں کا رخ کیا تو وہ لوگ اپنے مضبوط قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے حضورؐ نے انہیں طلب کیا اور فرمایا کہ اگر میں تمہیں اسی قلعہ میں بند رکھوں اور تمام قلعوں اور اموال پر قبضہ کر لوں ۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے ان قلعوں میں محافظ رکھے ہوئے ہیں اور ان کی چابیاں ہمارے پاس ہیں ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان کی چابیاں تو میرے پاس ہیں پھر حضورؐ نے وہ چابیاں انہیں دکھائیں ۔

یہ روایت پہلی روایت کی تائید کرتی ہے کہ فدک ایک سلطنت تھی جس میں عظیم الشان قلعے تھے ۔

(۳) اصول کافی میں فدک کی تفصیل یہ درج ہے :۔

لما ورد ابو الحسن موسیٰ علیہ السلام علی المهدی رآه یرد المظالم فقال یا امیر المؤمنین ما بال مظلمتنا لا ترد فقال له ما ذاك یا ابا الحسن قال ان الله تعالیٰ لما فتح علی نبیه صلی الله علیه وسلم فدك وما والاها لم یوجف بخیل ولا رکاب فانزل الله تعالیٰ علی نبیه صلی الله علیه وسلم وآت ذا القربیٰ حقه فلم یدر رسول الله من هم فراجع جبرئیل ربه فاوحی الله الیه ان ادفع الی فاطمة فدعاها رسول الله فقال لها یا فاطمة ان الله امرنی ان ادفع الیك فدك ۔ فقالت قد قبلت یا رسول الله من الله ومنك فلم یزل وکلاءها فی حیاة رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما ولی ابوبکر اخرج ابوبکر وکلاءها عنها فاتته فسالته ان یردها علیها ....
قال المهدی له یا ابا الحسن حدها لی فقال حد منها جبل احد وحد منها عریش مصر وحد منها سیف البحر وحد منها دومة الجندل فقال له کل هذا قال نعم یا امیر المؤمنین هذا کله ۔ ان هذا کله مما لم یوجف ۔
(اصول کافی ص۳۵۳)

جب ابو الحسن موسیٰ ۔ خلیفہ مہدی کے پاس یہ سنکر گئے کہ وہ مظالم لوٹا رہا ہے تو کہا امیر المؤمنین کیا وجہ ہے کہ ہمارے مظالم نہیں لوٹائے گئے ۔ پوچھا کونسے ؟ کہا کہ اللہ تعالےٰ نے جب نبی کریمؐ کے ہاتھوں فدک فتح کرایا تھا ۔ جس پر کوئی چڑھائی نہیں کی تھی تو حضورؐ پر یہ آیت وآت ذا القربیٰ الخ نازل ہوئی ۔ حضور اکرمؐ کو علم نہیں تھا کہ قرابت دار کون ہیں اس لیے جبریل سے پوچھا انہوں نے اللہ سے درخواست کی اللہ نے وحی کی کہ فدک فاطمہ کو دے دیجئے ۔ حضورؐ نے انہیں بلایا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ فدک تجھے دوں فاطمہ نے کہا یا رسول اللہ اللہ کی طرف سے اور آپ کی طرف سے میں نے قبول کیا ۔ پھر حضورؐ کی زندگی میں فاطمہ کے وکلاء اس باغ پر مقرر رہے جب ابوبکر صدیق خلیفہ ہوئے تو انہوں نے وکلاء کو نکال دیا فاطمہ ابوبکر کے پاس آئیں کہ فدک انہیں لوٹا دے ....
مہدی نے کہا ابو الحسن ! فدک کی حدود تو بیان کیجئے ۔ جواب دیا اس کا ایک سرا جبل احد ہے ۔ دوسرا عریش مصر ہے ۔ تیسری طرف سمندر کا کنارہ ہے اور چوتھی جانب دومۃ الجندل ہے ۔ مہدی نے کہا یہ سارا فدک ہے ؟ کہا ہاں یہ سارا فدک ہے جس پر حضورؐ نے گھوڑے نہیں دوڑائے

(۴) اسی مضمون کی ایک روایت ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار (۸: ۱۰۱) کتاب الفتن میں بیان کی ہے ۔ اس میں فدک کی حدود یہ بیان ہوئی ہیں :
اس کی ایک حد عدن ہے ۔ دوسری سمرقند ۔ تیسری افریقہ ۔ چوتھی سمندر کا کنارہ ہے جو آرمینیا سے ملا ہوا ہے ۔

ان روایات سے فدک کی وسعت کی تعیین ہوگئی۔ نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ حضورؐ کی زندگی میں اسس جاگیر پر حضرت فاطمہ کے وکلاء مقرر تھے۔ حضرت ابوبکر نے نکال دئے

(۵) ملا باقر مجلسی نے فدک کی تفصیل اس طرح بھی دی ہے۔

حضرت در جمیع خانہ ہائے شہر ہائے ایشاں گردید پس جبریل گفت کہ خدا ایں را مخصوص تو گردانیدہ و بتو بخشیدہ۔

(حیاۃ القلوب ۲: ۲۱۸)

حضرت اس کے تمام شہروں کے تمام مکانات میں پھرے پھر جبریل نے کہا کہ یہ خدا نے آپ کے لیے مخصوص کیا ہے۔

(۶) سید نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں۔

واما حدودھا فقال موسی بن جعفر علیہ السلام ان حدھا الاول عریش مصر والحد الثانی دومۃ الجندل والحد الثالث تیما والحد الرابع جبل من المدینہ۔

(انوار نعمانیہ ۱: ۱۶)

جہاں تک فدک کی حدود کا تعلق ہے امام موسیٰ بن امام جعفر نے فرمایا اس کی ایک حد عریش مصر ہے دوسری دومۃ الجندل ہے تیسری تیما ہے اور چوتھی احد کا پہاڑ ہے۔

ان چھ روایات اور اقتباسات کا ماحصل یہ ہے کہ :۔

(۱) فدک ایک وسیع سلطنت تھی جو آرمینیا سے لے کر مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔

(۲) رسول کریمؐ نے یہ سلطنت حضرت فاطمہ کو ہبہ کر دی۔

(۳) اس سلطنت میں کئی عظیم الشان قلعے تھے۔

(۴) اس سلطنت میں کتنے شہر تھے۔

(۵) اسس سلطنت میں رسول کریمؐ کی زندگی میں کئی وکلاء مقرر تھے جو ابوبکر صدیق نے نکال دئے

اہل لغت، مورخین اور جغرافیہ دان کہتے ہیں فدک ایک بستی تھی یہ امر واقعہ ہو یا رائے بہر حال انسان کا مشاہدہ اور خیال ہی ہو سکتا ہے مگر ان چھ روایات سے ظاہر ہے کہ امام معصوم بیان کر رہے اور جبریل امین نشاندہی کر رہے اور رسول کریمؐ ہبہ کر رہے ہیں لہٰذا اس کو رائے نہیں کہا جا سکتا بلکہ شیعہ کے نزدیک فدک ایک وسیع سلطنت تھی

۔۔۔۔۔۔ جو آرمینیا سے مصر تک اور عدن سے دومۃ الجندل تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسس حقیقت کے پیش نظر یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ نے ابوبکر صدیق سے جس فدک کا مطالبہ کیا تھا وہ اہل لغت کا خیالی نہیں بلکہ ائمہ معصومین کا بیان کردہ حقیقی فدک ہی مانگا ہوگا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی سلطنت حجاز کے ایک چھوٹے سے حصے سے آگے نہیں بڑھی تھی پھر وہ حضرت فاطمہ کا مطالبہ کیونکر پورا کر سکتے تھے۔ اور حضرت فاطمہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ جان بوجھ کر حضرت ابوبکر سے وہ چیز مانگ رہی ہیں جو ان کے قبضے میں نہیں کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ اگر آج کوئی شخص صدر پاکستان سے مطالبہ کرے کہ مجھے افغانستان اور ایران بطور جاگیر دے دیا جائے۔ صدر پاکستان بھلا اس کا مطالبہ کیونکر پورا کر سکتے ہیں اس پر اگر وہ شخص روٹھ جائے اور صدر پاکستان کو غاصب کہنے لگے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ اسس بنا پر عقل کا فیصلہ یہی ہے۔ حضرت فاطمہ کا مطالبہ محض فرضی قصہ ہے۔ جو لوگ اسس مطالبہ کو صحیح تصور کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ تاریخ سے یہ ثابت کریں کہ مطالبہ کے وقت یہ علاقے ابوبکر صدیق کے قبضہ میں تھے اور اسلامی حکومت کی حدود میں داخل تھے۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو مطالبہ کو فرضی قصہ اور جعلی داستان کہنا پڑے گا۔

(۷) صاحب درۃ النجفیہ نے فدک کی تفصیل یہ دی ہے۔

وفدک بفتحتین قریۃ من القری الیھود بینھا وبین المدینۃ النبی یومان ص ۳۲۹

فدک یہودیوں کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے جو مدینہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔

(۸) اسی درۃ النجفیہ میں ہے

وروی انہ کان فیھا احدی عشر نخلۃ غرسھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ وکانت بنو فاطمۃ یھدون ثمرھا الی الحجاج (ص ۳۳۲)

اور روایت کیا گیا ہے کہ باغ فدک میں کھجور کے گیارہ درخت تھے جو حضور اکرمؐ نے اپنے دست مبارک سے لگائے تھے ان کا پھل اولاد فاطمہ حاجیوں کو ہدیۃً دیا کرتے تھے۔

درۃ النجفیہ کی روایات کے مطابق فدک کی سلطنت سمٹ کر بستی رہ گئی پھر اور سمٹی تو کھجور کے گیارہ درخت اس کی کل کائنات ٹھیری۔ کیا انہیں گیارہ درختوں والی زمین کی نشاندہی کے لیے جبریل اپنے پروں سے کام لیتے رہے۔ درخت تو بعد میں حضور اکرمؐ

نے لگانے پہلے تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت فاطمہ نے اتنی سی زمین اور گیارہ درختوں کے لیے اتنے جتن کئے اور بقول شیعہ عمر بھر خلیفۂ رسول سے ناراض رہیں یہ رویہ تو آج کا ایک خالص دنیا دار اور مادہ پرست انسان بھی اختیار نہیں کرتا حضرت فاطمہ کو دنیا اتنی عزیز تھی۔ کہ اس کی خاطر ابوبکر صدیق سے اپنے والد کی حدیث سن لینے کے بعد بھی ناراض ہی رہیں ۔ یہ ایک عجیب معمہ ہے ۔ اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ حضرت فاطمہ کا مطالبہ اسی فدک کیلئے ہوگا جو بہ سند معتبر گذشتہ چھ روایات میں بیان ہوا ہے اور جو اس وقت صدیق اکبر کی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔

باغ فدک کی آمدنی :۔

(۱) پس اہل فدک بخدمت حضرت رسول آمدند و بایشاں مقاطعہ نمود کہ ہر سال بست و چہار ہزار دینار بدہند بحساب ایں زمانہ تقریباً سہ ہزار و شش صد تومان باشد۔
(حیاۃ القلوب ۲ : ۲۱۸)

اہل فدک حضور کے پاس آئے ان سے طے ہوا کہ ہر سال ۲۴ ہزار دینار دیں گے اس زمانہ کے حساب کے مطابق ۳۶۰۰ تومان بنتے ہیں ۔

(۲) تشئید المطاعن میں سید محمد قلی لکھتے ہیں کہ ایک لاکھ بیس ہزار دینار تھی ۔ اور اسی کتاب میں لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں فدک کی آمدنی ایک لاکھ چالیس ہزار دینار سالانہ تھی۔

درۃ النجفیہ کی روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ کل ۱۱ درخت تھے جو حضور نے لگائے تھے اس روایت کی تعبیر میں کہا جاتا ہے کہ باغ تو بڑا وسیع تھا البتہ ۱۱ درخت حضور نے لگائے تھے ۔ یہ تعبیر الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی ۔ فیہا میں ھا ضمیر کا مرجع زمین فدک ہے یعنی اس زمین میں کل ۱۱ درخت تھے ورنہ عبارت یوں ہوتی کہ وسیع باغ تھا جس میں گیارہ درخت حضور نے خود لگائے تھے اس لیے روایت کے الفاظ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ اس باغ میں کل گیارہ درخت تھے اور وہ بھی حضور نے اپنے دست مبارک سے لگائے تھے۔

اب واقعات کی روشنی میں اس آمدنی کا جائزہ لینا چاہیے ۔

(۱) ۷ھ میں فدک کی زمین اسلامی سلطنت میں شامل ہوئی ۔
(۲) ۱۱ھ میں حضور اکرم اس جہان سے رخصت فرما گئے ۔

عام تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ کھجور کا درخت چار پانچ سال سے پہلے پھل نہیں دیتا ۔ پھر حضور نے کل گیارہ درخت جو لگائے تھے اس پر "وکلاء" کتنے اور کیوں مقرر کئے تھے جو حضرت ابوبکر نے نکال دئے ۔ اور پھل آنے سے پہلے ہی ان درختوں سے اتنی آمدنی کیسے ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ روایت بنانے میں ذرا اور احتیاط کی جاتی اور موضوعی جگہ ابوبکر لکھا جاتا تو کچھ بات بن جاتی کیونکہ پیوند شدہ کھجور دوسرے تیسرے سال پھل دینے لگتی ہے ۔

پھر دیکھنا یہ ہے ۱۱ درخت ایک موسم میں کتنا پھل دے سکتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۲۰ سیر سے ایک من تک ایک درخت پھل دے سکتا ہے ۔ حساب یوں بنتا ہے کہ ۱۱ من کھجور کی قیمت ۱۲۰۰۰۰ دینار یعنی ۱۰۹۰۹ دینار فی من یعنی ۲۷۲ دینار فی سیر ۱۷ دینار فی چھٹانک اور ۸½ دینار فی تولہ اب دیکھنا یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں کہیں اتنی مہنگی کھجور بھی بکتی تھی یہ تو سونے کے نرخ معلوم ہوتے ہیں ۔ آخر مبالغہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور مبالغہ صرف شعروں میں چلتا ہے ۔ حسابی عمل میں مبالغہ کا کیا کام ۔

پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ کھجور کے درخت اس وقت تک پھل نہیں دے سکتے جب تک ان میں کوئی نہ کوئی نر درخت نہ ہو ۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک نر درخت تھا اور دس مادہ تو ۱۰ درختوں کے پھل کی قیمت ۱۲۰۰۰۰ دینار یعنی ۳۰۰ دینار فی سیر قیمت بنی ۔ خواب کی دنیا کی بات ہو تو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر جیتی جاگتی اور حقائق کی دنیا میں اس بات کو وہی تسلیم کرے گا جسے عقل سے پیدائشی بیر ہو۔

فدک کی جاگیر حضور کے قبضہ میں کیسے آئی :۔

فتح الباری ۶ : ۱۲۳ ، تفسیر کبیر اور فتوح البلدان میں مذکور ہے کہ جب خیبر فتح ہو چکا اور حضور اکرم واپس آ رہے تھے تو آپ نے حضرت محیصہ بن مسعود انصاری کو اہل فدک کی طرف بھیجا کہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دیں یہود کے رئیس یوشع بن نون نے فدک کی نصف آمدنی

پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ چونکہ جنگ کی نوبت نہ آئی اس لیے یہ آمدنی حضورؐ کیلئے مختص رہی۔

نبی کریمؐ کے قبضہ میں مال آتے تھے قرآن کریم نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

زکوٰۃ۔ غنیمت۔ اور فئے۔ زکوٰۃ پر لفظ صدقہ کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔

قسم اوّل یعنی صدقات کے اموال رسول کریمؐ اور آل رسول کے لیے حرام تھے۔

قسم دوم یعنی غنیمت کی حقیقت انفال کے نام سے اللہ تعالےٰ نے بیان فرما دی اور اس کی تقسیم کا طریقہ بھی بیان فرما دیا۔

قسم سوم یعنی فئے کے متعلق قرآن مجید نے تفصیل بیان کر دی۔

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللہ
وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین
وابن السبیل۔

فئے اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ کئے بغیر صلح سے ہاتھ آئے اور فدک اسی طریقہ سے حضورؐ کے قبضہ میں آیا تھا لہٰذا فدک کی جاگیر مال فئے سے تعلق رکھتی ہے۔

مال فئے پر حضورؐ کے قبضہ کی نوعیت:۔

آیت مندرجہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ فدک کی جاگیر پر حضورؐ کا قبضہ مالکانہ نہیں تھا بلکہ متولیانہ تھا۔ یعنی آپ فدک کی آمدنی کی تقسیم کے متولی تھے جیسے کسی حکومت میں وزیر خزانہ ہوتا ہے۔ وہ خزانہ کا مالک نہیں بلکہ متولی ہوتا ہے اسی طرح فدک کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور رسول کریمؐ کو اس مال کی تقسیم کے لیے متولیانہ تصرف اللہ تعالےٰ کی طرف سے ملا۔ اگر قبضہ مالکانہ ہوتا تو ذی القربیٰ یتامیٰ۔ مساکین اور مسافر اس میں شریک نہ کئے جاتے۔ ان چار اقسام کے لوگوں کو مال فئے میں شریک کرنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ مال حضورؐ کی ذاتی ملکیت نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کی خبرگیری کے لیے حضورؐ کو متولیانہ تصرف کرنے کا حکم دیا گیا۔ اگر رسول کریمؐ کو مالک قرار دیا جائے تو آیت کی رو سے ان چار قسم کے لوگوں کو بھی مالک قرار دیا جائے اور میراث کا سوال اٹھا تو ان سب میں میراث تقسیم ہوگی۔

اب تقسیم کے دو ہی طریقے ہیں۔

اوّل باعتبار رقبہ:۔ یہ صورت محال ہے کیونکہ مسکین کلی ہے خواہ نوع ہی ہو۔ اسی طرح یتیم بھی کلی ہے۔ مسافر بھی کلی ہے جن کے افراد لاتعداد ہیں پھر رقبہ کیسے تقسیم ہو سکے گا۔

دوم باعتبار آمدنی:۔ یہ صورت ممکن ہے افراد بدل سکتے ہیں تقسیم ہو سکے گی اس صورت میں یہ مال کسی کی مملوکہ چیز نہ ہوگی تقسیم کرنے والا متولی ہوگا۔ مالک کوئی بھی نہ ہو سکے گا۔ ہاں رقبہ کسی کے نام منتقل ہو تو اسے حقوق مالکانہ مل سکتے ہیں مگر یہ صورت یہاں ممکن نہیں اس جاگیر کے متعلق خلفائے ثلٰثہ کے بعد جو صورت اختیار کی جاتی رہی اس کی تفصیل یوں ملتی ہے۔

قال القرطبی لما ولی علیؓ لم یغیرھا الصدقۃ کما کانت فی ایام الشیخین ثم کانت بعدہ بید الحسن ثم بید الحسین ثم بید علی بن الحسین ثم بید الحسن بن الحسن ثم بید عبداللہ بن الحسین ثم ولیھا بنو العباس علی ما ذکرہ الامام البرقانی فی صحیحہ ولم یرو عن احد من ھولاء انہ تملکھا ولا ورثھا ولا ورثت عنہ (تفسیر ابدی ۴: ۲۰۰۴، عمدۃ القاری ۷: ۱۲۳
و
وکتاب الخمس ابو حفص بن شاہین)

قرطبی کہتے ہیں کہ جب علیؓ خلیفہ ہوئے تو فدک کا وہی نظام برقرار رہا جو شیخین کے زمانہ میں تھا کچھ تغیر نہ کیا پھر حضرت حسن کے پاس آیا پھر حسین کے پاس پھر زین العابدین کے پاس پھر حسن بن حسن پھر زید بن حسن پھر عبداللہ بن حسین پھر بنو عباس متولی ہوئے جیسا کہ برقانی نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے اور کسی نے ذکر نہیں کیا کہ یہ لوگ فدک کے مالک بنے ہوں یا وارث بنے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فدک کی زمین پر شیخین کے زمانہ جو قبضہ متولیانہ رکھا جاتا تھا وہی برتاؤ حضرت علیؓ کے عہد میں کیا گیا پھر اولاد فاطمہ کے تصرف میں جب یہ جاگیر آئی تو ان کا قبضہ بھی متولیانہ رہا۔ خلفائے اربعہ نے حضور اکرمؐ کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے وہی طریقہ اختیار کیا اور خلفائے اربعہ کی اتباع کرتے ہوئے اولاد فاطمہ میں سے مذکورہ بزرگوں نے اس پر قبضہ متولیانہ کی صورت برقرار رکھی۔ علامہ قرطبی نے اولاد فاطمہ کے نام ذکر کرکے آخر میں دوسری صورت کی نفی کر دی۔ کہ کسی ایک فرد سے منقول یا ثابت نہیں کہ فدک پر ان کا

قبضہ مالکانہ تھا یا اسے میراث بنایا گیا یا ان میں سے کوئی فرد اس جاگیر کا وارث ہُوا۔

اس سلسلے میں جن الفاظ سے رسول کریمؐ کی جانب اضافت کا وہم ہوتا ہے محدثین نے اس کی تردید کردی ہے۔ چنانچہ فیض الباری ج ۴ : ۴۶۲ اور وفاء الوفا سمہودی میں فان للہ خمسہ وللرسول کے تحت بیان ہُوا ہے۔

یرید به دفع الوهم الناشی من الایة انک جعلت الخمس الی رأی الامام مع ان الایة تدل علی کونه ملکا لرسول اللہؐ فازاحه بان اضافته الی رسول اللہ للقسم دون الملك۔

اس کا مقصد اس وہم کو دور کرنا ہے جو آیت قرآنی کے مفہوم سے پیدا ہوتا ہے۔ تو نے خمس کو امام کی رائے پر چھوڑ دیا مع ویت کے یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ یہ حضورؐ کی ملکیت تھا پھر اس اس بات سے رد کیا کہ یہ اضافت تقسیم کیلئے ہے ملکیت کے لیے نہیں۔

اور فیض الباری ج ۴ : ۵۹ پر مذکور ہے۔

قد خص رسوله بان کانت لرسول اللہ خالصة ای بالولایة دون الملك الی ان قال واعلم ان مخاصمة فاطمة بنت رسول اللہؐ من ابوبکر کانت فی التولیة۔

رسول کریمؐ کو فدک کے متولی ہونے میں مختص کیا مالک ہونے میں نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ بھی جان لو کہ حضرت فاطمہ کا مطالبہ حضرت ابوبکر سے ولایت فدک کے لیے تھا میراث اور ملک کیلئے نہیں تھا۔

خلاصہ یہ کہ فدک مال فے تھا اور یہ مال کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا اس لیے فدک بھی حضورؐ کی ذاتی ملکیت نہیں تھا۔

شیعہ مفسر شیخ مقداد نے اپنی تفسیر کنز العرفان میں مال غنیمت اور مال فے کے متعلق لکھا ہے۔

ان ما اخذ من الکفار ان کان من غیر قتال فھو فیئ وان کان مع القتال فھو غنیمة وھو مذھب اصحابنا۔ (ص ۸۲)

جو مال کفار سے جنگ کے بغیر حاصل ہو وہ فے ہے اور جو جنگ سے حاصل ہو وہ غنیمت ہے۔ ہمارا مذہب یہی ہے۔

پھر اسی تفسیر کنز العرفان میں فے کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔

والصحیح ما قاله الباقر انما ما اخذ من دار الحرب بغیر قتال کالذی استجلی عنها اهلها وهو المسمی فیئا ومیراث من لا وارث له وقطائع الملوك اذا لم تکن مغصوبة والآجام وبطون الاودیة والموات فانها للہ ولرسوله وبعده من قام مقامه یصرفه حیث یشاء من مصالح (ص ۸۶)

صحیح بات وہ ہے جو امام باقر سے منقول ہے کہ جو مال کفار دار الحرب سے بغیر لڑائی کے لیا جائے مثلاً اس ملک کے باشندوں کو جلاوطن کیا جائے وہ مال فے ہے اور میراث ہے اس شخص کی جس کا کوئی دوسرا وارث نہ تھا اور بادشاہوں کی جاگیریں جو غصب شدہ نہ ہوں جنگلات اور وادیاں اور غیر آباد زمین خدا کی اور اس کے رسول کی ہیں رسول کے بعد اس کے قائم مقام خلیفہ یا نائب کی ہیں وہ خلیفہ ان میں اپنی صوابدید کے مطابق مصالح عامہ کے لیے تصرف کرے گا۔

امام باقر کے قول کے مطابق مال فے کو میراث بھی کہتے ہیں اس میں رسول کے بعد نائب رسول ہی قبضہ متولیانہ کے ذریعے مصالح عامہ کیلئے تصرف کا حقدار ہے۔

سید نعمت اللہ الجزائری لکھتے ہیں۔

ان اول من رد فدکا علی ورثة فاطمة سلام اللہ علیها عمر بن عبد العزیز وکان معاویة اقطعها لمروان بن الحکم وعثمان بن عفان ویزید بن معاویة وجعلها بینهم ثلاث ثم قبضت من ورثة فاطمة فردها سفاح ثم قبضت منهم فردها علیهم المامون و قبضت فردها علیهم المستنصر ثم قبضت فردها علیهم

پہلے شخص جنہوں نے فدک حضرت فاطمہ کے ورثا کو لوٹایا وہ عمر بن عبد العزیز تھے اور امیر معاویہ حضرت عثمان اور یزید نے اس کے تین حصے کر دئے تھے اور امیر معاویہ نے مروان بن الحکم کو ایک حصہ دے دیا تھا۔ پھر ان سے لے لیا گیا اور خلیفہ سفاح نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا پھر مامون نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا پھر واثق نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا

المعتمد ثم قبضت منهم فردها عليهم المعتضد ثم قبضت فردها عليهم الراضي۔
(انوار نعمانیہ ۱ : ۱۶)

پھر مستنصر نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا پھر معتمد نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا پھر معتضد نے لوٹایا پھر چھین لیا گیا پھر راضی باللہ نے لوٹایا۔

یہ روایت اور عینی فیض الباری اور قرطبی کی روایت کا مضمون ملتا جلتا ہے شیعہ سنی دونوں طرف کی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام حکام خواہ بنو امیہ کے ہوں یا بنو عباس کے فدک کو میراث نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر جس کا قبضہ رہا متولیانہ رہا۔ مالکانہ نہیں۔ اگر یہ کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی تو خلفاء یقیناً اس کے قبضہ میں رہنے دیتے۔ اس لیے اہل بیت کے جن افراد کو یہ لوٹایا گیا ان کا قبضہ متولیانہ تھا۔

انوار نعمانیہ کی روایت میں دو باتیں ایسی ہیں جنہیں غلط بیانی کہنا چاہیے ممکن ہے تقیہ کے طور پر ایسا کیا گیا ہو۔ اوّل یہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضرت فاطمہ کے ورثاء کو فدک لوٹا دیا تھا۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے مشکوٰۃ باب الفئی میں اس کی تفصیل درج ہے بقدر الضرورت حصہ حدیث یہ ہے۔

ثم اقطعها مروان ثم صارت لعمر بن عبد العزيز فرأيت امرا منعه رسول الله فاطمه ليس لي بحق وانى اشهدكم انى رددتها على ما كانت يعني على رسول الله وابى بكر وعمر۔

پھر مروان نے باغ فدک کاٹ لیا تھا۔ پھر عمر بن عبد العزیز کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے کہا میرا خیال ہے کہ جو فدک حضورؐ نے فاطمہ کو نہیں دیا تھا وہ خاص میرا حق کیسے بن گیا۔ اس لیے میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ میں فدک کو اسی طریقہ پر لوٹاتا ہوں جس پر رسول کریمؐ کے زمانہ میں اور شیخین کے زمانہ میں تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے فدک کی آمدنی کی تقسیم کا معاملہ اس طریقہ کی طرف لوٹایا جو رسول کریمؐ اور شیخین کے زمانہ میں اختیار کیا جاتا رہا۔

فدک کے ٹکڑے کرنے کی نسبت حضرت عثمان کی طرف کرنا بھی غلط ہے اشعۃ اللمعات

میں لکھا ہے۔

وظاہر آں است کہ ایں در زمان سلطنت مروان شد

فدک کی آمدنی کی تقسیم کے لیے جو طریقہ کار رسول کریمؐ نے اختیار فرمایا تھا اسی کا اتباع شیخین بلکہ خلفاء اربعہ نے کیا۔ شیعہ کتب میں اس کی تائید ملتی ہے۔ مثلاً

وكان رسول الله ياخذ غلتها فيدفع اليهم منها ما يكفيهم ثم فعلت الخلفاء بعده كذلك الى ان ولي معاوية فاقطعها مروان ثلثها بعد الحسن ثم خصت له في خلافته وتداولها الى ان انتهت الى عمر بن عبد العزيز فردها عليهم ابو العباس سفاح ثم قبضها والداه موسى وهارون فلم تزل في ايدى بني عباس الى زمان المامون فردها اليهم وبقيت الى عهد المتوكل فاقطعها عبد الله وروى انه كان فيها احدى عشر نخلة غرسها رسول الله بيده فكانت بنو فاطمه يهدون ثمرها الى الحجاج۔ حدیدی شرح نہج البلاغہ ۲ : ۲۹۶ درۃ النجفیہ ص ۳۳۱

اور حضورؐ اس کا غلہ لے لیتے اور اہل بیت کو اس سے اتنا دے دیتے جو ان کے لیے کافی ہوتا پھر آپ کے بعد خلفاء نے بھی ایسا ہی کیا پھر امیر معاویہ کا زمانہ آیا تو مروان نے اس کا ایک تہائی کاٹ لیا پھر اپنی خلافت میں اسے اپنے لیے مختص کر لیا اور اس میں دست اندازی کرتا رہا حتیٰ کہ عمر بن عبد العزیز نے اپنے عہد میں اہل بیت کو یہ لوٹا دیا۔ پھر سفاح نے قبضہ کیا پھر موسیٰ اور ہارون نے پھر مامون کے زمانہ تک بنو عباس کے پاس رہا اس نے اہل بیت کو لوٹا دیا اور متوکل کے عہد تک اسی طرح رہا۔ پھر عبد اللہ نے قطع کر لیا۔ روایت کی گئی ہے کہ اس میں کھجور کے گیارہ درخت تھے جو نبی کریمؐ نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے اور بنو فاطمہ ان درختوں کا پھل حاجیوں کو بطور تحفہ دیا کرتے تھے

اس روایت سے ظاہر ہے کہ خلفاء نے وہی طریقہ جاری رکھا جو نبی کریمؐ نے اختیار کیا تھا اور بعد میں حکام وقت باغ فدک میں تداول کرتے اور ہاتھوں ہاتھ بدلاتے رہے۔ یہ بھی اس امر کی بین دلیل ہے کہ فدک کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھا۔ اور اولاد فاطمہ کو لوٹانا متولیانہ

ان کی متولیانہ حیثیت سے ہوتا تھا۔ اگر یہ کسی کی ملکیت ہوتی تو اس میں میراث جاری ہوتی اور جس کے قبضہ میں جاتا اس کی اولاد میں شرعی طریقہ پر تقسیم کیا جاتا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حکام وقت دوسروں کی ملکیت میں ایسا عمل کیوں نہیں کرتے تھے۔ صرف فدک کے معاملہ میں یہ رویہ اختیار کرنا عدم توریث کی بین دلیل ہے۔ پھر ابن حدیدی شرح نہج البلاغۃ ۲: ۲۹۶ پر یوں تفصیل دی گئی ہے۔

وكان ابوبكر يأخذ غلتها فيدفع اليهم منها مايكفيهم ويقسم الباقى وكان عمر كذلك ثم كان عثمان كذلك ثم كان على كذلك فلما ولى الامر معاوية بن ابى سفيان اقطعها مروان بن الحكم ثلثها واقطع عمر بن عثمان ثلثها واقطع يزيد بن معاوية ثلثها وذلك بعد موت حسن بن على فلم يزالوا يتداولونها حتى خلصت كلها لمروان بن الحكم ايام خلافته۔

اور ابوبکر صدیق کا طریقہ یہ تھا کہ فدک کی آمدنی اہل بیت رسول کی ضروریات پر خرچ کرتے تھے جو بچ رہتا وہ راہ خدا میں تقسیم کر دیتے پھر حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی کے عہد میں یہی معمول رہا۔ پھر امیر معاویہ کے عہد میں مروان نے تہائی فدک اپنے نام خاص کر لیا اور تہائی حصہ عمر بن عثمان نے اپنے لیے مخصوص کر لیا پھر تہائی یزید نے اپنے لیے خاص کر لیا یہ تمام حصے بخرے حسن بن علی کی وفات کے بعد کئے گئے۔ پھر فدک دست بدست چلتا رہا حتیٰ کہ مروان کے عہد میں سارا فدک اس کے قبضہ میں چلا گیا۔

اسی قسم کا بیان فیض الاسلام شرح نہج البلاغۃ مؤلفہ علی نقی ۵: ۹۶۰ پر ملتا ہے۔

خلاصہ:- ابوبکر غلہ و سود آن را گرفتہ بقدر کفایت باہل بیتؑ داد و خلفاء بعد ہم بر آن اسلوب رفتار نمودند تا زمان معاویہ کہ ثلث آن را بعد از امام حسن بمروان داد

ابوبکر صدیق۔ اس کا غلہ اہل بیت کو بقدر کفایت دیتے تھے ان کے بعد خلفاء نے یہی طریقہ جاری رکھا۔ امیر معاویہ کے زمانہ تک یہی طریقہ رہا۔ پھر امام حسن کے بعد مروان نے ایک تہائی خود لے لیا۔

اسی طرح کی تفصیل شرح نہج البلاغۃ میثم بحرانی صفحہ ۵۴۳ پر ملتی ہے۔

صاحب درۃ النجفیہ، ابن ابی الحدید، علی نقی اور میثم بحرانی چاروں چوٹی کے شیعہ کے علماء نے شہادت دی کہ

(۱) رسول کریمؐ فدک کی آمدنی سے اہل و عیال کی ضرورت کے مطابق مال لے لیتے تھے باقی تقسیم کر دیتے تھے۔

(۲) حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی نے بالکل وہی طریقہ جاری رکھا۔

(۳) امیر معاویہ کے زمانے میں مروان نے تہائی حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔

(۴) حضرت علی اور امام حسن فدک کے معاملہ میں نبی کریمؐ اور خلفائے ثلثہ کے ساتھ کلی طور پر متفق رہے۔

اس لیے اگر خلفائے ثلثہ کو فدک کے بارے میں مجرم قرار دیا جائے تو حضرت علی کو اس جرم سے بری قرار دینے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس سلسلے میں حضرت انور شاہ کاشمیری کا بیان خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

والحال ان عليا و عثمان ايضا يمشيا على ما فعله الشيخان وحكى ان رافضيا ذهب عند السفاح الخليفة العباسى فقال انى مظلوم فاجرنى قال الخليفة من ظلمك قال ابوبكر وعمر فى تركة النبى، فسئال الخليفة عند من الفدك بعدهما قال عند عثمان قال ثم عند من قال عند على وهكذا قال الخليفة فاى خصوصية ابى بكر وعمر فسكت الرافضى الملعون فامر

حال یہ ہے کہ حضرت علی اور عثمان بھی شیخین کے طریقہ پر چلے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ ایک شیعہ عباسی خلیفہ سفاح کے سامنے پیش ہوا اور فریاد کی کہ میں مظلوم ہوں میری دادرسی کیجئے۔ خلیفہ نے پوچھا تجھ پر کس نے ظلم کیا ہے کہنے لگا ابوبکر اور عمر نے میراث نبوی کے معاملے میں مجھ پر ظلم کیا ہے خلیفہ نے پوچھا ابوبکر اور عمر کے بعد فدک کس کے پاس گیا کہنے لگا عثمان کے پاس پوچھا پھر؟ کہا علی کے پاس اسی طرح پے درپے جن جن کے پاس پہنچا۔ خلیفہ نے کہا پھر اس ظلم میں ابوبکر و عمر کی خصوصیت کونسی ہے شیعہ سائل لاجواب ہوگیا خلیفہ نے اس کا

الخليفة بقطع سره فقطع ـ وقد تكلم شراح البخاري في حديث الباب وقال السيد السمهودي ان نزاع فاطمة لم يكن في تحصيل التركة و تكلمها بل تولى الوقف (عرف شذی ص۲۴۰)

سر قلم کرنے کا حکم دیا چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ فدک کی حدیث میں بخاری کے شارحین نے کلام کیا ہے۔ اور سید سمہودی نے کہا کہ حضرت فاطمہ کا مطالبہ ترکہ کے حصول اور ملکیت کے بارے میں نہیں تھا بلکہ وقف کی تولیت کے بارے میں تھا۔

خلیفہ سفاح نے مظلوم کی داد رسی جس شکل میں کی اس کے متعلق تعجب تو ہوتا ہے مگر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ

(۱) اس نے شیخین پر بہتان لگایا۔ اور انکی سیرت کو مجروح کیا۔

(۲) اس کے اپنے بیان کے مطابق حضرت علی بھی مجرم ٹھہرتے ہیں۔

اور یہ حرکت قتل سے کم نہیں اس لیے اس کا قصاص لیا گیا۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فدک کے بارے میں شیخین پر بہتان لگانا حضرت علی کو بھی اسی جرم کا مرتکب قرار دینا ہے۔ خواہ ان کا نام نہ لیا جائے۔ کیونکہ چاروں خلفاء کا رویہ اس سلسلے میں وہی رہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث

نبوت کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام دو حیثیتیں رکھتے ہیں اول ظاہری جو قالب ہے دوم باطنی جو قلب ہے۔ باطنی پہلو سے ملائکہ اور وحی کے ذریعے احکام خداوندی حاصل کرتے ہیں اور ظاہری حیثیت سے وہ احکام مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ ظاہر کے اعتبار سے وہ فرشی ہوتے ہیں اور باطن کے اعتبار سے عرشی ہوتے ہیں۔ فرشی کی حیثیت سے وہ انسانوں سے مشابہ ہوتے ہیں کھانا پینا، بیماری صحت اہل وعیال وغیرہ انسانی اوصاف ہیں اور عرشی ہونے کی حیثیت سے ملائکہ سے مشابہت رکھتے ہیں کہ ان کے قلوب پر نہ غفلت طاری ہوتی ہے نہ نیند۔ ان کے قلوب کا تعلق رب العالمین سے ہر وقت وابستہ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے انہیں لامتناہی علوم نبوت کا خزانہ ملتا ہے۔ جب دنیا اور دولت دنیا کی غلاظت سے ان کے قلوب

ملوث نہیں ہوتے۔ ملائکہ سے مشابہت کی وجہ سے ان کے قلوب غفلت معصیت اور مال و دولت کی محبت سے پاک ہوتے ہیں ایک دل میں دو متضاد محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ انبیاء کا خزانہ اور ان کی دولت علوم نبوت ہیں دنیوی مال و دولت سے ان کا تعلق عارضی اور وقتی ہوتا ہے جو محض حفاظت بدن اور اہل وعیال کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں نقل کیا گیا ہے۔

عن جبير بن نفير مرسلا قال قال رسول الله ما اوحى الي ان اجمع المال واكون من التاجرين ولكن اوحى الي ان سبح بحمد ربك وكن من الساجدين واعبد ربك حتى يأتيك اليقين (ص۴۴۴)

حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ مال جمع کروں اور تاجروں میں شمار ہو جاؤں بلکہ مجھ پر یہ وحی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد بیان کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کر۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سابقہ امتوں کی ہلاکت کا سبب دولت کی فراوانی تھی۔ دولت کے نشہ نے انہیں خدا سے دور کیا اور خدا نے انہیں عذاب میں مبتلا کیا۔ تو جو چیز اللہ سے دور کرنے والی ہو وہ انبیاء کی میراث کیونکر بن سکتی ہے۔

مال کی ایک صورت ازواج مطہرات کے سکونتی مکان تھے۔ یہ امہات المؤمنین کی ذاتی ملکیت تھے۔ ان کی ملک میں ہبہ مع قبضہ دے گئے تھے جس کا قرآن مجید شاہد ہے۔

وقرن في بيوتكن　　اور اپنے گھروں میں جمی رہو

بیوت کی نسبت حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ ازواج مطہرات کی طرف کی گئی ہے۔ قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت سے مسلمان بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ باجماع سنی وشیعہ ثابت ہے کہ قرب وفات کے وقت امام حسن نے حضرت عائشہؓ سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ روضۂ رسولؐ میں دفن کئے جائیں۔ یہ مطالبہ اسی وجہ سے تھا کہ وہ مکان حضرت عائشہؓ کی ذاتی ملکیت تھا۔

حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے معاملے میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کفار بھی اس حقیقت سے واقف تھے کہ انبیاء علیہم السلام مال جمع نہیں کیا کرتے چنانچہ ملکہ نے حضرت سلیمان کی خدمت میں امتحاناً مال کثیر بھیجا تھا۔ اني مرسلة اليهم بهدية فناظرة بم يرجع المرسلون۔

اور اس کے جواب میں حضرت سلیمان نے یہ فرمایا

اتمدونن بمال فما اتنی اللہ خیر مما اتا کم۔

لفظ میراث کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں مثلاً

۱ - لفظ میراث مشترک ہے مال، علم اور منصب میں -

۲ - میراث حقیقت لغوی ہے مال میں اور مجاز ہے علم میں۔

شیعہ حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ وارثت مال میں حقیقت ہے اور علم میں مجاز ہے اور حقیقت کو ترک کر کے مجاز کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔

اہل السنت کہتے ہیں کہ یہ لفظ مشترک ہے مال، علم اور منصب میں علامہ آلوسی کہتے ہیں

لا نسلم کون المیراث حقیقۃ لغویۃ فی المال بل ھی حقیقۃ فیما یعم وراثۃ العلم و المنصب (نبوت) والمال وانما صارت لغلبۃ الاستعمال فی عرف الفقہاء مختصۃ بالمال کالمنقولات العرضیۃ ولو سلمنا ان المیراث مجاز فی العلم فھو مجاز متعارف مشہور خصوصا فی استعمال القرآن المجید بحیث یساوی الحقیقۃ۔	وراثت کا حقیقت لغوی ہو ہم تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہ حقیقت عام ہے جو علم، منصب اور مال کو بھی شامل ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ غلبۂ استعمال کی وجہ سے عرف فقہاء میں مال سے مختص ہوگئی ہے جیسے دوسری منقولات عرضیہ کا معاملہ ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میراث مال میں حقیقت ہے اور علم میں مجاز ہے تو پھر بھی وہ مجاز متعارف و مشہور ہے بالخصوص استعمال قرآنی میں تو حقیقت کے مساوی ہے۔

(روح المعانی ۱۶ : ۶۷)

حقیقت یہ ہے کہ میراث کو مال سے مختص کرنا قرآن کے خلاف ہے مثلاً ارشاد ربانی ہے۔

۱:- ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔

۲:- فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب

۳:- ان الذین اورثوا الکتاب من بعدھم

ان آیات میں یہ لفظ علمی میراث کیلئے بولا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قبضہ ملکی پر بھی قرآن حکیم میں میراث کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے

۱:- ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ

۲:- للہ میراث السموٰت والارض

شیعہ کا استدلال یہ ہے کہ میراث کا لفظ مال مکتسب کیلئے بولا جاتا ہے جو وارث کو بلا کسب ملتا ہے اور علم کسبی چیز ہے مذکورہ بالا دو آیتیں اس استدلال کو رد کرتی ہیں۔ آیت اول کسب کے قصے کی تردید کرتی ہے لفظ میراث موجود ہے مگر کسب موجود نہیں دوسری آیت پر شیعہ کے استدلال کی روشنی میں غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ زمین و آسمان کسی اور ہستی کے مال مکتسب تھے۔ جس کے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو بلا کسب وراثت میں ملے۔ کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ سوچ سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وراثت کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو بلا قیمت اور بغیر احسان کے حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔

واستعمل لفظ الوراثۃ لکون ذلک بغیر ثمن ومنۃ

(مفردات صفحہ ۵۲۰)

شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ نے شافی میں یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ لفظ میراث جب مطلق بولا جائے تو مراد مالی میراث ہوتی ہے اس اصول کو صاحب اصول کافی نے رد کیا ہے چنانچہ اصول کافی صفحہ ۱۵۳ پر لکھا ہے۔

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام ان سلیمان ورث داؤد وان محمد اورث سلیمان۔	امام جعفر نے فرمایا حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث ہوئے اور حضرت محمد حضرت سلیمان کے وارث ہوئے۔

یہاں لفظ ورث مطلق استعمال ہوا ہے اگر شریف مرتضیٰ کا استدلال درست ہے تو یہ بتایا جائے کہ حضرت سلیمانؑ سے صدیوں بعد حضور اکرمؐ کو ان کا کونسا مال ورثے میں ملا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد علوم نبوت اور منصب نبوت ہے حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام

کی علمی میراث پر متقدمین سنی اور شیعہ متفق ہیں بعد کے شیعہ نے انبیاء کی مالی میراث کا عقیدہ ایجاد کیا ہے۔ چنانچہ اصول کافی ص۳۵ باب العالم والمتعلم میں صاف لکھا ہے۔

۱۔ عن ابی عبد اللہ قال قال رسول اللہ ان العلماء ورثۃ الانبیاء ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن اورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر۔	امام جعفر نے فرمایا نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ علماء، انبیاء کے وارث ہوتے ہیں انبیاء درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے لیکن علم کا وارث بناتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے بہت بڑا حصہ حاصل کیا۔

۲۔ اصول کافی ص۱۷ باب صفت العلم:-

عن ابی عبد اللہ قال ان العلماء ورثۃ الانبیاء وذلک ان الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینارا وانما اورثوا احادیث من احادیثھم فمن اخذ بشئ منہ فقد اخذ حظا وافرا۔	امام جعفر فرماتے ہیں کہ علماء وارث ہیں انبیاء کے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انبیاء کرام درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے۔ سوائے اس کے نہیں کہ وہ اپنی احادیث کا وارث بناتے ہیں پس جس نے حدیث سے کچھ لے لیا اس نے بڑا حصہ پا لیا۔

۳۔ من لا یحضرہ الفقیہ ۲ : ۳۴۶ حضرت علی نے اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

تفقہ فی الدین۔ فان الفقھاء ورثۃ الانبیاء۔ ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکنھم ورثوا العلم فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر۔	بیٹا! دین کا فہم حاصل کر حقیقت یہ ہے کہ فقہاء ہی انبیاء کے وارث ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے لیکن علم کا وارث بناتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے بہت بڑا حصہ حاصل کیا۔

ان احادیث میں دو لفظ خاص طور پر قابل غور ہیں اول انما، جو کلمہ حصر ہے دوم ولکن، جو دفعہ وہم کے لیے ہے کیونکہ ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما سے یہ وہم پیدا

ہو سکتا تھا کہ انبیاء کی کوئی میراث سرے سے ہوتی ہی نہیں اس لیے "لکن" سے اس وہم کو دور کیا گیا کہ میراث تو ہوتی ہے مگر مالی نہیں بلکہ علوم نبوت اور ان کی احادیث یہاں ایک اور وہم پیدا کیا جاتا ہے کہ ہاں یہ درست ہے کہ نفی درہم و دینار کی ہے۔ زمین مکان اور جائداد کی نفی نہیں مگر "لکن" کے لفظ سے ہر قسم کے وہم کو دور کر دیا گیا اگر زمین مکان وغیرہ انبیاء کی میراث ہوتی تو کلام یوں ہونا چاہیے تھا ولکن اورثوا العلم والدار والارض والبساتین مگر حدیث میں ولکن اورثوا العلم کہہ کر بات صاف کر دی کہ علم کے بغیر کوئی اور میراث ہوتی ہی نہیں۔

پھر عربی زبان میں لفظ "انما" حصر کے لیے بولا جاتا ہے یعنی اپنے متصل یا بعد کو اس کے مابعد پر بند کر دیا ہے۔ اس لیے انما اورثوا احادیث من احادیثھم میں میراث نبوت کو احادیث میں بند کر دیا یعنی میراث انبیاء ان کی احادیث کے علاوہ کوئی دوسری چیز سرے سے ہے ہی نہیں۔ ورنہ انما کا حصر باطل ہو گیا اور اس کا کوئی مطلب ہی نہ رہا۔

اس علمی جواب سے ہٹ کر اگر محض عقلی طور پر سوچا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ سونے چاندی کی نفی سے مراد دنیا کی ہر قسم کی دولت کی نفی ہے۔ یہی دو چیزیں دولت دنیا کی اصل ہیں۔ انہیں سے جائداد خریدی جاتی ہے۔ اور جائداد بیچ کر سونا چاندی حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے سونا چاندی کی نفی سے دنیوی دولت کی نفی ہو گئی۔ خواہ وہ جائداد غیر منقولہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیا سونا چاندی ہی دولت دنیوی ہیں اور مکان زمین جاگیر دولت اخروی ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو زمین اور جائداد کو دنیوی دولت سے مستثنیٰ کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟

ایک اور سوال اٹھایا جاتا ہے کہ علماء تو انبیاء کے علم کے وارث ہوتے ہیں مگر مال کے وارث ان کے قرابتدار ہوتے ہیں پہلی بات یہ ہے کہ انبیاء جب مالی میراث چھوڑتے ہی نہیں تو قرابتداروں کو مالی میراث ملے گی کیا؟ دوسری بات جو ذرا نازک ہی ہے کہ علوم نبوی جو جبریل کے ذریعے اللہ تعالٰے سے ملتے ہیں وہ تو لے جائیں اغیار اور قرابتداروں کے حصہ میں وہ چیز آئے جو گھٹیا۔ چند روزہ۔ خدا سے دور کرنے والی اور تباہی کی طرف لے جانے والی ہے۔ یہ تقسیم کا اصول خاندان نبوت کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔

اصول کافی کی احادیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ متقدمین شیعہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ انبیاء کی مالی میراث کوئی نہیں ہوتی۔ بعد والوں نے ہنگامہ آرائی کیلئے اس میں ایک نئی راہ نکال لی چنانچہ شیعہ محدث سید نعمت اللہ جزائری نے انوار نعمانیہ ۱ : ۲۴ پر لکھا ہے۔

ان الانبیاء من حیث النبوۃ لم یورثوا الا العلم واما من حیث الانسانیه والبشریة فیجوزان یخلفوا شیئا من الاموال ۔	یقیناً انبیاء باعتبار نبوت کے علم کے بغیر کسی چیز کا وارث نہیں بناتے مگر باعتبار بشریت کے مالی ورثہ چھوڑ جاتے ہیں ۔

محدث صاحب کی نکتہ آفرینی قابل داد ہے مگر اس کے کئی پہلو قابل غور ہیں ۔

(۱) محدث صاحب کا قول اصول کافی میں بیان کردہ احادیث کے مخالف ہے ۔ اور اصول کافی امام غائب کی مصدقہ کتاب ہے ۔

(۲) یہ نکتہ محدث صاحب کی ذاتی رائے ہے اور اصول کافی کی ایک روایت رسول خداؐ کی حدیث ہے جس کے راوی امام جعفر ہیں۔ دوسری روایت امام جعفر کا قول ہے۔ اور تیسری حضرت علی کا قول ہے ۔اس لیے اگر محدث صاحب کا مقام رسول خداؐ اور ائمہ معصومین سے بلند تر ہے تو اسے مان لو ورنہ اسے ٹھکرانا ہی پڑے گا ۔

(۳) نبوت اور بشریت پر غور کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بشریت پہلے تھی نبوت بعد میں ملی ۔ اور بشریت پر نبوت کا غلبہ ہوگیا اور ایسا ہونا چاہیے تھا ۔ اگر بشری اوصاف جو تابع نفس بشری ہیں بعد نبوت بھی باقی رہیں تو تو نبی سے نفسانی خواہشات کے تحت گناہ کا صدور مثلاً زنا۔ چوری۔ قتل۔ جھوٹ۔ حرام کھانا ۔ دھوکہ دینا۔ عبادت میں کوتاہی کرنا وغیرہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے تو مال جمع کرنا جو تابع نفس بشری ہے اسے کیوں تسلیم کیا جائے۔ اگر اول الذکر اوصاف نفسانی بدل گئے تو مال جمع کرنے کا نفسانی وصف کیوں نہ بدل گیا۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ اوصاف بشری بدل گئے اوصاف ملکی پیدا ہوگئے۔ مگر اوصاف کے بدلنے سے ذات اور ماہیت نہیں بدلی ۔ نبی بشر ہوتا ہے اور بشر ہی رہتا ہے مگر

اس کے اوصاف بشری جو تابع نفس ہوتے ہیں بدل جاتے ہیں اس لیے جہاں دوسرے اوصاف بدلے وہاں مال جمع کرنے کا تابع نفس وصف بھی بدل گیا جب مال جمع کرنے کا وصف باقی نہ رہا تو مال پیچھے چھوڑ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

متأخرین شیعہ نے اصول کافی کی روایات کا توڑ ایک اور نکال لیا کہ حدیث کے رواۃ میں ایک راوی ابوالبختری ہے اور وہ اکذب الناس ہے۔ اس لیے اس کی روایت کردہ حدیث بھی جھوٹی اور موضوع ہے قابل تمسک نہیں ۔صاحب فلک النجاۃ نے یہی بیان کیا ہے۔

یہ اصول تو درست ہے کہ راوی اکذب الناس ہو تو حدیث قابل تمسک نہیں ہوتی۔ مگر اس اصول کا اطلاق یہاں نہیں ہو سکتا ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث اصول کافی میں پائی جاتی ہے اور اصول کافی کا مقام شیعہ دینیات میں یہ ہے :-

(۱) یہ کتاب غیبت صغریٰ کے زمانے میں سفیروں کے ذریعے امام مہدی کے سامنے پیش کی گئی تھی اور امام نے اس کتاب کی تصدیق ان الفاظ میں کی کہ ھذا کاف لشیعتنا اس لیے خواہ راوی جھوٹا ہو اس کتاب میں درج شدہ روایت کی تصدیق جب امام نے کر دی تو اس کی تکذیب دراصل امام مہدی کی تکذیب ہے ۔اس لیے لوگ جو اصول کافی کی حدیث کی تکذیب کرتے ہیں وہ حقیقت میں امام مہدی کی تکذیب کرتے ہیں ۔خدا جانے شیعہ امام معصوم کے انکار اور اس کی تکذیب کی جرأت کیسے کرتے ہیں ۔

(۲) علامہ قزوینی نے اصول کافی کی حیثیت یوں بیان کی ہے ۔

الحق کتاب کافی عمدہ کتب احادیث اہل بیت علیہم السلام است ومصنف آں ابوجعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق رازی کلینی کہ مخالفاں نیز اعتراف بکمال فضیلت اونمودہ اند از روئے احتیاط تمام آنرا در بست سال تصنیف کردہ در زمان غیبت صغری حضرت صاحب الزمان علیہ وعلی آلہ صلوات الرحمٰن کہ شصت ونہ سال	حقیقت یہ ہے کہ ”کافی“ اہل بیت کی کتب احادیث میں سے عمدہ کتاب ہے اس کا مصنف ابوجعفر محمد بن یعقوب رازی کلینی ہے جس کے کمال کا اعتراف اس کے مخالف بھی کرتے ہیں نہایت احتیاط سے ۲۰ سال میں یہ کتاب مکمل کی غیبت صغریٰ کے زمانے میں جو ۶۹ برس تھا چار سفیروں کے ذریعے امام غائب سے لوگ بات چیت

بودہ ودراں زماں مومناں عرض مطلب می کردند بتوسط سفراء یعنی خبر آورندگان از آنحضرت وایشاں چہار کس بودہ اند در غیبت ایشاں وکلائے بسیار بودہ اند کہ اموال از شیعہ امامیہ گرفتند ومی رسانیدند ومحمد بن یعقوب در بغداد نزدیک بودہ در سال فوت آخر سفرا ابوالحسن علی بن محمد السمری کہ سال سہ صد وبست ونو ہجری باشد فوت شدہ بایک سال قبل ازاں پس می تواند بود کہ ایں کتاب مبارک بنظر اصلاح آں حجت خدا تعالیٰ رسیدہ باشد۔

(صافی شرح اصول کافی ۱ : ۴)

کرتے تھے۔ محمد بن یعقوب بغداد میں سفراء کے پاس رہتا تھا آخری سفیر ابوالحسن علی بن محمد السمری کا سال وفات ۳۲۹ھ ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب امام غائب کے پاس بتوسط سفرا بھیجی گئی انھوں نے اس کی اصلاح کی اس طرح یہ کتاب درحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے دین میں سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲) مزلا محمد خلیل قزوینی کی فارسی شرح کے مقدمہ میں فائدہ ۱۱ کے تحت اصول کافی کے متعلق لکھا ہے۔

دہم ہمیں احادیث مرسلہ محمد بن یعقوب کلینی ومحمد بن بابویہ قمی بلکہ جمیع احادیث ایشاں کہ در کافی ومن لا یحضرہ الفقیہ ہمہ را صحیح می تواند خواند زیرا کہ شہادت ایں دو شیخ بزرگوار کمتر از شہادت اصحاب رجال نیست یقیناً بلکہ بہتر است۔

اسی طرح محمد بن یعقوب کلینی اور محمد بن بابویہ قمی کی تمام احادیث جو کافی اور من لا یحضرہ الفقیہ میں ہیں سب کو صحیح کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان دو مشائخ کی شہادت اصحاب رجال کی شہادت سے کم نہیں بلکہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہے۔

اصول کافی کے متعلق ان دو عظیم گواہوں کی شہادت کافی ہے کہ اس کی کوئی حدیث غلط نہیں علامہ خلیل قزوینی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ محمد بن یعقوب کلینی خود امام غائب کو ملا ہے ان سے احکام سنتے ہیں معلوم ہوتا ہے خود یہ کتاب امام کے پیش کی تصدیق کرائی۔

کتاب الفصل جزو اوّل ص ۲۱۷

وشاید ایں سہ قول را مصنف رحمہ اللہ خود از صاحب زماں شنیدہ باشد وایں قصہ را معلوم کردہ شد وظاہر سیاق کلام مصنف در کتاب الی آخر ایں است کہ مصنف بخدمت او علیہ السلام رسیدہ باشد

شاید مصنف نے یہ تین قول امام غائب سے سنے ہوں گے اور یہ قصہ معلوم کر لیا ہو گا سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف خود امام غائب کی خدمت میں پہنچا ہے۔

مصنف اصول کافی کا یہ مقام کہ سفراء کے واسطہ کے بغیر خود امام غائب سے ملاقات کی اور کتاب اصول کافی کا یہ مقام کہ امام صاحب الزمان نے اس کی تصدیق کی مہر ثبت کر دی پھر اس کتاب کی کسی حدیث کی تکذیب کرنا درحقیقت امام مہدی کی تکذیب کرنا ہے۔

شیعہ محدثین اور متکلمین نے رواۃ حدیث کے مقام اور مرتبہ کے تعین کے سلسلے میں ایک اصول مقرر کیا ہے۔ اس اصول کے تحت ابوالبختری کی روایت تو صحیح چھوڑ رائح ثابت ہوتی ہے اس اصول کا ذکر انوار نعمانیہ ۲ : ۲۸۴ میں ان الفاظ میں ہوا ہے۔

کما اتفق ذلک فی کثیر من خواص الائمۃ محمد بن سنان وجابر جعفی ممن اتھمھم اھل الرجال بالغلو وارتفاع القول وذلک لان الائمۃ علیھم السلام القوا الیھم من اسرار علومھم مالم یحدثوا غیرھم من الشیعۃ فاستغرب الشیعۃ تلک الاخبار لعدم موافقۃ غیرھم لھم علی روایتھم فطعنوا علیھم بھذا السبب وھذا السبب ھو سبب رفعتھم وعلو درجاتھم عند موالیھم فما فیہ الجرح فھو الذی

جیسا کہ یہ چیز ائمہ کے بہت سے خواص میں واقع ہوئی ہے جیسے محمد بن سنان جابر جعفی جن کو علمائے رجال نے غلو اور ارتفاع قول کے ساتھ متہم کیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ائمہ نے ان راویوں کو اپنے علوم کے ایسے اسرار بتائے تھے۔ جو ان کے بغیر کسی شیعہ کو نہیں بتائے تھے۔ شیعہ نے ان باتوں کو عجیب سمجھا کیونکہ وہ دوسروں کے اقوال کے مطابق نہیں تھیں اس وجہ سے ان پر طعن کیا۔ مگر یہی طعن ائمہ کے دوستوں کے نزدیک ان کی رفعت اور بلندی درجات کا سبب ہے۔ پس جس حدیث میں ان کی

فيه المدح وقد حققنا هذا المقام في شرح على الاستبصار۔

جرح یا قدح یا ذم بیان ہوا در حقیقت وہی ان کی مدح ہے جیسا کہ ہم نے شرح استبصار میں اس کی تحقیق کی ہے۔

رجال کشی میں یہ اصول ذرا وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

عن عبدالله بن زرارة قال قال لي ابو عبدالله اقرأ مني على والدك السلام وقل له اني انما اعيبك دفاعا مني عنك فان الناس والعدو يسارعون الى كل من قربناه وحمدنا مكانه لادخال الاذى في من نحبه ونقربه ويرمونه بمحبتنا له وقربه ودنوه منا ويرمون ادخال الاذى عليه وقتله ويحمدون كل من عيبناه نحن فانما اعيبك لانك رجل اشتهرت بنا وبميلك الينا وانت في ذلك مذموم عند الناس غير محمود الاثر بمودتك لنا وميلك الينا فاحببت ان اعيبك ليحمدوك وامرك في الدين وبعيبك ونقصك ويكون بذالك منا دافع شرهم عنك يقول الله تعالى اما السفينة فكانت لمساكين يعملون في البحر فاردت ان اعيبها الى ان قال فهو المثل يرحمك الله فانك احب الناس الي واحب اصحاب ابي حيا وميتا فانك افضل السفن ذلك البحر القمقام الزاخر وان من ورائك ملكا ظلوما غصوبا يرقب عبور كل سفينة صالحة ترد من بحر الهدى لياخذها غصبا[۹۲]

ابن زرارہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق نے مجھے فرمایا کہ اپنے والد کو میرا سلام کہنا اور اسے کہنا کہ میں تیری مدافعت کے لیے تجھ پر عیب لگاتا ہوں کیونکہ عام لوگ اور دشمن اس شخص پر پھبتے ہیں جو ہمارے قریب ہو یا ہم اس کی تعریف کریں۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں یہ لوگ اسے ایذا دینے اور قتل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور ہم جس کے عیب بیان کرتے ہیں اسے یہ لوگ اچھا سمجھتے ہیں۔ میں صرف اسی وجہ سے تیرے عیب بیان کرتا ہوں کہ تو ہماری محبت اور ہماری طرف قلبی میلان کے سلسلے میں مشہور ہو چکا ہے اس لیے لوگ تجھے برا سمجھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تیرے عیب بیان کروں تاکہ لوگ تیری تعریف کریں اور تجھے دینی اعتبار سے اچھا سمجھیں یہ چیز تمہیں ان کے شر سے بچانے کا کام دے گی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ کشتی مسکینوں کی تھی جو سمندر میں مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا اسے عیب دار بنا دوں الخ اللہ تجھ پر رحم کرے خوب سمجھ لے کہ تو بھی اسی کی مانند ہے تو میرا اور میرے اصحاب کا محبوب ہے۔ زندگی میں بھی اور بعد موت بھی۔ تو اس بحر مواج میں بہترین کشتی ہے اور تیری پیچھے ایک ظالم بادشاہ لگا ہوا ہے جو ہر ایسی کشتی کی تاک میں بیٹھا ہے جو ہدایت کے سمندر میں وارد ہوتی ہے تاکہ اس پر غاصبانہ قبضہ کر لے۔

زرارہ کے بیٹے کے ہاتھ امام نے جو پیغام زرارہ کے نام بھیجا ہے۔ اس میں ابہام ہے دوسری روایت میں لفظ اعیبک کی تفصیل بیان ہوئی ہے مثلاً رجال کشی ص ۹۸-۹۹ امام جعفر فرماتے ہیں۔

كذب علي والله كذب علي لعن الله زرارة لعن الله زرارة لعن الله زرارة۔

مجھ پر جھوٹ باندھا ہے خدا کی قسم مجھ پر جھوٹ باندھا ہے اللہ زرارہ پر لعنت کرے لعنت کرے لعنت کرے۔

پھر اسی کے ص ۱۰۷ پر لکھا ہے۔

عن ابي عبدالله عليه السلام قال (الراوي) دخلت عليه فقال متى عهدك بزرارة قال قلت ما رأيته منذ ايام قال لا تبال وان مرض فلا تعده وان مات فلا تشهد جنازته قال قلت متعجبا زرارة قال نعم زرارة شر من اليهود والنصارى ومن قال ان مع الله ثالث ثلاثة۔

راوی کہتا ہے میں امام جعفر کے پاس گیا پوچھا زرارہ سے کب ملاقات ہوئی میں نے کہا کئی روز سے اسے نہیں دیکھا فرمایا کچھ پروا نہیں۔ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت نہ کرنا۔ اگر وہ مر جائے تو اس کے جنازہ میں شریک نہ ہونا۔ میں نے تعجب سے پوچھا کس کی بات کر رہے ہیں فرمایا ہاں زرارہ کی بات ہے وہ یہود و نصاریٰ سے برا ہے اور تین خدا ماننے والوں سے بھی برا ہے۔

پھر اسی رجال کشی کے صفحہ ۱۰۶ پر

قال (زرارہ) قلت التحیات والصلوۃ قال التحیات والصلوۃ فلما خرجت ضرطت فی لحیتہ وقلت لا یفلح ابدا۔

زرارہ کہتا ہے میں نے امام سے کہا التحیاۃ والصلوۃ۔ فرمایا التحیاۃ الخ جب میں باہر نکلا تو میں نے امام کی داڑھی میں پاد مارا اور کہا خدا تجھے کبھی فلاح نہ دے۔

پھر اسی کے صفحہ ۱۰۷ پر ہے۔

فان زرارہ ... قال لیس من دینی ولا من دین آبائی۔

امام نے فرمایا زرارہ نہ میرے دین پر ہے نہ میرے آباء کے دین پر ہے۔

اور حق الیقین صفحہ ۴۲۲ پر ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے کہ زرارہ اور ابو بصیر دونوں شیعہ کے نزدیک اجماعی کافر ہیں۔ اور امام جعفر نے بروایت رجال کشی زرارہ کو ملعون اور دین ائمہ سے خارج قرار دیا۔ یہ اعیبلث کی تفصیل ہے تو اس کا ملعون ہونا، کافر ہونا، یہود و نصاریٰ سے بدتر ہونا دراصل اس کے فضائل ہیں جو عیب کے پردے میں بیان ہوتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے دین شیعہ کا قریباً ۹/۱۰ حصہ اسی زرارہ اور ابو بصیر کی روایات پر مبنی ہے۔ جب ان اجماعی کافروں کی روایات قابل قبول ہی نہیں بلکہ سر آنکھوں پر تو ابو البختری کے ایک وصف اکذب البریہ کی وجہ سے اس کی روایت کو رد کیوں کیا جائے۔ کیا اس وجہ سے کہ اسے کافر اور ملعون نہیں کہا گیا اس لیے وہ زیادہ ثقہ نہیں؟ مگر اکذب البریہ کے وصف کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہاں ایک بات ذرا عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جب زرارہ کو علم تھا کہ عیب کے پردے میں اس کی تعریف ہو رہی ہے تو امام کی داڑھی میں پاد کیوں مارا۔ ممکن ہے یہ ظاہر کرنا ہو کہ اسے امام سے محبت ہے۔ اور یہ حرکت گویا عطر چھڑکنے کے مترادف ہو۔ اور لا یفلح ابدا سے علو شان کا اظہار ہو۔

اس اصول کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے سامنے تو ان محبوب ہستیوں کے عیب بیان کرنا ان کے بچاؤ کی خاطر ہو سکتا ہے لیکن اپنوں کے سامنے ایسا

بیان آخر کیا معنی رکھتا ہے۔

حاصل یہ کہ اصول کافی کی احادیث واضح کرتی ہیں کہ انبیاء کی مالی میراث نہیں ہوتی اور اصول کافی کی کسی حدیث کا انکار ائمہ کا انکار ہے۔ ایک ابو البختری کا معمولی سا عیب کہ اکذب البریہ ہے کی حیثیت کو کم نہیں کر سکتا۔

قرآن حکیم اور وراثت انبیاء

شیعہ حضرات ذیل کی آیات قرآنی انبیاء کی مالی میراث کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) یوصیکم اللہ فی اولادکم۔

(۲) ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون۔

(۳) وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔

(۴) وورث سلیمان داؤد

(۵) رب هب لی من لدنك ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب۔

اصولاً ان آیات سے انبیاء کی مالی میراث ثابت نہیں ہوتی کیونکہ

(۱) جس بات پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے اس کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے جس دلیل میں کئی احتمال ہوں وہ دلیل نہیں بن سکتی۔

(۲) دعویٰ خاص ہے۔ کہ انبیاء کی مالی میراث نہیں ہوتی۔ اور ان آیات میں دلیل عام ہے دلیل عام مستلزم دعویٰ خاص کو نہیں ہے۔ دعویٰ خاص کے لیے دلیل خاص لازمی ہے۔

(۳) پہلی تین آیات میں انبیاء کا ذکر نہیں مال کا ذکر ہے باقی میں انبیاء کا ذکر ہے مال کا ذکر نہیں۔ اس لیے یہ آیتیں دعویٰ خاص کی دلیل نہیں بن سکتیں۔

(۴) یوصیکم اللہ میں خطاب امت کو ہے رسول خدا کو نہیں اس لیے اصول کافی وغیرہ میں عدم میراث انبیاء کی حدیث از قبیل تعیین خطاب ہے مخصص خطاب نہیں۔ اور اگر مخصص مان لیں تو بھی ایک پہلو سے درست ہے۔ کیونکہ آیت عام مخصوص البعض ہے۔ مثلاً اولاد کافر کو میراث نہیں ملے گی۔ قاتل وارث نہ ہوگا۔ مرتد وارث نہ ہوگا۔

ان تمام صورتوں میں آیت تخصیص پا چکی ہے۔ تو انبیاء کی میراث میں تخصیص مان لینے میں کیا مانع ہے۔

(۵) آخری دو آیتوں میں مطلق میراث کا ذکر ہے مالی میراث کا ذکر نہیں اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں ورث یرث کے الفاظ سے مالی میراث ثابت ہوتی ہے کیونکہ وراثت مال میں حقیقت ہے اور علم میں مجاز ہے تو اس کی تحقیق گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ پھر ورث سلیمان میں حضرت سلیمان کے وارث ہونے کی خبر ہے جو ان کی تعریف اور مدح کی آئینہ دار ہے۔ اگر وراثت مالی لیں تو اس میں مدح کا کوئی پہلو نہیں۔ کیوں کہ تمام انسان اس میں شریک ہیں اس لیے مال کا وارث ہونا نہ کوئی کمال ہے نہ تعریف کا مقام اس بنا پر یہ تعریف لغو ہوگی اور کلام الٰہی لغو سے پاک ہے۔

پھر یہ کہ حضرت داؤد کے ۱۹ بیٹے تھے ناسخ التواریخ ۱ : ۲۷۰ پر ان سب کے نام درج ہیں مالی میراث میں سب بیٹے شریک ہوئے تھے پھر حضرت سلیمانؑ کا خصوصیت سے ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آیت کا باقی حصہ مالی میراث کی تردید کرتا ہے کہ وقال یا ایھا الناس علمنا منطق الطیر اور صاف ظاہر ہے کہ یہ میراث علم اور منصب کی تھی۔

اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد کی زندگی میں ہی علم مل گیا تھا پھر ان کے بعد علم کے وارث کیونکر بنے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم تو بیشک مل گیا تھا مگر نبوت اور منصب والد کے بعد ملے۔

اگر اس صراحت کے باوجود اسے مالی میراث ہی قرار دیں تو حضرت داؤد کی دولت کا جائزہ لینا پڑے گا دیکھنا یہ ہے کہ جو شخص زرہیں بنا کر اپنا گذر اوقات کرے وہ کتنا ترکہ چھوڑ سکتا ہے جس کے لیے قرآن حکیم میں خاص اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ جب وہ مال آیا تو انہوں نے اسے کہاں کھپایا۔ کیونکہ وہ ٹوپیاں بنا کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مفسرین لکھتے ہیں کہ میراث میں گھوڑے ملے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ گھوڑے حکومت کے تھے جن پر حضرت سلیمانؑ کا تصرف

مالکانہ نہیں بلکہ متولیانہ تھا۔

حضرت سلیمانؑ کی معاش کے متعلق ایک شیعہ مترجم قرآن علامہ حسین نے و ورث سلیمان داؤد کی تفسیر میں لکھا ہے :۔

باوجود آں ملک و سلطنت زنبیل بافتے بجہت او معاش خود دبہ حصیر خواب کردے ولحظہ از یاد خدا غافل نہ بودے

اس وسیع حکومت کے باوجود اپنی معاش کے لیے زنبیل بنتے اور چٹائی پر سوتے تھے اور ایک لحظ میں یاد خدا سے غافل نہ ہوتے تھے۔

اگر بقول شیعہ قرآن نے مالی میراث کا ذکر کیا ہے۔ تو وہ کتنی تھی اور کہاں گئی جسے میراث ملی اس کا حال یہ ہے کہ ٹوکریاں بنا کر پیٹ پالتا ہے اور رات چٹائی پر بسر کرتا ہے۔ آیت کی تفسیر صافی ۲ : ۴۳، پر یوں کی گئی ہے۔

و ورث سلیمان داؤد الملک والنبوۃ حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد سے ملک اور نبوت ورثہ میں ملے۔

شیعہ شارحین حدیث نے اس آیت کے متعلق لکھا ہے۔

عن ابی عبد اللہ قال ان سلیمان ورث داؤد وان محمد ورث سلیمان وانا ورثنا محمد اوان عندنا علم التوراۃ والانجیل والزبور

(صافی شرح اصول کافی ۱ : ۱۴۹)

امام جعفر سے روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو حضرت داؤد کی وراثت ملی اور حضرت محمدؐ کو حضرت سلیمانؑ کی روایت ملی اور ہم حضرت محمدؐ کے وارث ہوئے ہمارے پاس توراۃ، انجیل زبور کا علم ہے۔

اور شرح صافی :۔

گفت امام جعفر صادق بدرستیکہ سلیمان بمیراث گرفت علم را از داؤد چنانچہ اللہ تعالیٰ گفتہ در سورۃ نمل و ورث سلیمان داؤد بدرستیکہ محمدؐ بمیراث برد علم را از سلیمان و بدرستیکہ ما اہل بیت محمدؐ بمیراث برد علم را از محمدؐ

اور صافی شرح اصول کافی ۱: ۱۱ پر ہے۔

قال ابوجعفر انا خزان الله فی سمائه وارضه لاعلی ذهب ولا فضة الاعلی علمه

امام فرماتے ہیں، ہم زمین وآسمان میں اللہ کے خزانے ہیں سونے چاندی کے نہیں علم کے خزانے۔

شرح صافی :-

ماہر آئینہ خازنان اللہ تعالیٰ در آسمان و زمین او نہ بر طلا و نہ نقرہ بلکہ بر علم او کہ نزد حاملان وحی از ملائکہ است و نزد انبیاء علیہم السلام و رسل است

شیعہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں حکومت اور نبوت کا ذکر کیا ہے اور شیعہ محدثین نے امام جعفر کا قول نقل کیا ہے کہ یہ وراثت علوم نبوت کی تھی اس بیان امام کے مقابلے میں کوئی محقق یا مجتہد خواہ وہ کس پایہ کا ہو کیا حقیقت رکھتا ہے۔

آیت نمبر ۵ ایک دعا ہے اور مالی وراثت تو دعا کے بغیر ہی بیٹے کو ملتی ہے۔ لہٰذا حضرت یعقوبؑ کی دعا کے الفاظ یرثنی سے مراد علم و نبوت کیلئے وارث کی درخواست ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ دعا تو قبول ہو گئی مگر حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت زکریاؑ کے درمیان کوئی دو ہزار سال کا فاصلہ ہے یہ بُعد زمانی بھی مالی میراث کی تردید اور علمی میراث کی تائید کرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر کتب شیعہ میں یوں ملتی ہے۔

(۱) درۃ النجفیہ شرح نہج البلاغہ ۱: ۶۴ :-

وقیل اراد منصب الخلافة ویصدق علیه لفظ الارث کما صدق فی قوله تعالیٰ حکایة عن زکریا علیه السلام یرثنی ویرث من آل یعقوب فانه اراد یرث علمی ومنصبی فی النبوة فکانه اسم المیراث صادقا علی ذلك۔

کہا گیا ہے کہ مراد منصب خلافت ہے اور خلافت پر میراث کا لفظ صادق آتا ہے جیسا کہ قرآن میں حضرت زکریاؑ کے متعلق بیان ہے یرثنی الخ۔ مراد میراث علمی اور منصب نبوت ہے گویا میراث کا لفظ اس پر صادق آتا ہے۔

(۲) الصافی شرح اصول کافی ۱: ۲۹ جز وسوم حصہ دوم۔

ثم مات زکریا علیه السلام فورثه ابنه یحیی الکتاب والحکمة وهو صبی صغیر اما تسمع لقوله تعالیٰ عزوجل یا یحیی خذ الکتاب بقوة وآتیناه الحکم صبیا۔

پھر زکریاؑ فوت ہو گئے اور ان کے بیٹے یحییٰؑ کتاب و حکمت کے وارث ہوئے جبکہ وہ کم سن بچے تھے۔ کیا تو نے اللہ کا فرمان نہیں سنا کہ اے یحییٰ کتاب کو مضبوط پکڑ اور ہم نے اسے بچپن میں حکمت دی تھی۔

شرح صافی :-

بعد ازاں مرد زکریاؑ۔ پس میراث برد ورا یحییٰ پسرش کہ آخر اوصیائے موسیٰؑ بودہ علم کتاب تورات۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ آج کے شیعہ جن آیات قرآنی سے انبیاء کی مالی میراث ثابت کرتے ہیں، متقدمین شیعہ اور ائمہ نے یہی آیات انبیاء کی علمی میراث اور منصب نبوت کے لیے پیش کی ہیں۔ یعنی متأخرین شیعہ نے ائمہ کی مخالفت کرتے ہوئے قرآن مجید سے معنوی تحریف کر کے اپنے ایجاد کردہ عقیدہ کو مستند قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے ائمہ کے عقیدہ پر رہتے تو فدک کا مصنوعی قضیہ کھڑا کرنے اور اس کے لیے بناوٹی دلائل تیار کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاطمہؓ کا مکالمہ

حدیث فدک بخاری میں چار مقامات پر بیان ہوئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے جب صدیق اکبرؓ کے سامنے فدک کی بات چھیڑی تو خلیفہ رسول نے انہیں حضورؐ کی ایک حدیث سنائی اور اس حدیث پر عمل کرنے کے سلسلے میں اپنی طرف سے یہ کہا

لا ادع امرا رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یصنعه فیه الا صنعته۔

میں نے حضور اکرمؐ کو جس طریقے سے کوئی کام کرتے دیکھا اس طریقہ کو میں نہیں چھوڑوں گا۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

لست تارکا شیئا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ

میں وہ کام نہیں چھوڑوں گا جو رسول کریمؐ کرتے تھے۔ میں صرف اسی پر عمل کروں گا۔ اگر میں حضورؐ کے کسی حکم کو چھوڑوں تو مجھے ڈر ہے کہ گمراہ ہو جاؤں گا۔

صدیق اکبرؓ کے جواب سے ظاہر ہے کہ آپ نے وہی کچھ کیا جو ایک سچا مومن قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں کر سکتا ہے اور کرنا چاہیے۔ مثلاً

۱۔ ماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم۔

۲۔ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

۳۔ فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم

یعنی حضورؐ کے فیصلے کو تہِ دل سے تسلیم کرنا اور اس کی مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق تو ایک سچے مومن کا رویہ ریکارڈ پر آ گیا۔ مگر دوسری طرف حضرت فاطمہؓ کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے اور پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے قرآن حکیم کی یہ آیات یا اسی مضمون کی دوسری آیات پڑھی ہوں گی یا نہیں؟ پڑھی ہوں گی تو ان کا مفہوم بھی سمجھا ہو گا یا نہیں؟ اگر سمجھا ہو گا تو اس حکم کی تعمیل کی ہو گی یا نہیں۔ اگر کہیں کہ تعمیل نہیں کی تو یہ حضرت فاطمہؓ کے مقام سے ناواقفیت بلکہ ان کی توہین ہے۔ اگر کہیں کہ تعمیل کی تو اس کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ آدمی جتنا غور کرے اس کے بغیر کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ جب ان کے مطالبہ کے جواب میں ابوبکر صدیقؓ نے اپنا کوئی فیصلہ نہیں سنایا بلکہ نبی کریمؐ کی حدیث سنا دی۔ اپنی طرف سے صرف اتنا کہا کہ مجھے اس حدیث پر عمل کرنا ہے۔ اور فاطمہ اس جواب سے ایسی مطمئن ہو گئیں کہ عمر بھر اس مسئلہ کا ذکر تک نہیں کیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے لا ادع امرا کہہ کے جس رویہ کی طرف اشارہ کیا

ہے وہ کیا تھا شرح نہج البلاغہ اور علامہ میثم بحرانی صفحہ ۵۴۳ پر اس کی تفصیل دی گئی ہے۔

کان رسول اللہ یاخذ من فدک قوتکم ویقسم الباقی ویحمل منہ فی سبیل اللہ ولک علی اللہ ان اصنع بھا کما یصنع فرضیت بذلک واخذت العھد علیہ بہ وکان یاخذ غلتھا فیدفع الیھم منھا ما یکفیھم ثم فعلت الخلفاء بعدہ کذلک الی ان ولی معاویۃ۔

(صدیق اکبرؓ نے فرمایا) کہ رسول کریمؐ فدک کی آمدنی سے آپ اہل بیت کا خرچ الگ کر لیتے تھے جو آپ کے لیے کافی ہوتا تھا۔ باقی مساکین پر یا جہاد کی تیاری پر صرف کرتے تھے اور اللہ کی رضا کیلئے آپ کا مجھ پر حق ہے کہ میں فدک میں وہی طریقہ اختیار کروں جو حضورؐ کرتے تھے یہ سن کر حضرت فاطمہ راضی ہو گئیں اور صدیق اکبرؓ سے ایسا کرنے کا عہد لیا پھر آپ نے اپنے عہد میں اہل بیت کو اسی طرح سال کا خرچ دیتے رہے ان کے بعد خلفاء نے بھی وہی طریقہ جاری رکھا حتیٰ کہ امیر معاویہ کا زمانہ آ گیا۔

علامہ میثم شارح نہج البلاغہ نے وضاحت کر دی کہ:۔

(۱) فدک کی آمدنی کی تقسیم جس طرح حضور اکرمؐ کرتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے وہی طریقہ جاری رکھنا چاہا۔

(۲) حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ آپ مجھے حضورؐ کا طریقہ جاری رکھنے دیں۔

(۳) حضرت فاطمہؓ اس پر راضی ہو گئیں اور حضرت ابوبکرؓ سے اس پر قائم رہنے کا عہد لیا۔

(۴) حضرت ابوبکرؓ اس عہد پر قائم رہے اور ان کے بعد تمام خلفائے راشدین اسی عہد پر قائم رہے اور فدک کی آمدنی بالکل اسی طرح تقسیم کرتے رہے جیسے حضورؐ کرتے تھے۔

نہج البلاغہ کی ایک اور شرح درۃ النجفیہ میں صفحہ ۳۳۱ پر بعینہ یہی عبارت ہے اور سید علی نقی نے شرح نہج البلاغہ ۵: ۹۶۰ پر اسی طرح حضرت فاطمہ کی رضامندی کا ذکر کیا ہے۔

اور حق الیقین صفحہ ۲۲۲ پر ملا باقر مجلسی نے ایک اور بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ:۔

جب حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے بیعت کی اور یہ فتنہ فرو ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ۔

آپؓ اور عمرؓ کی سفارش کی پس فاطمہؓ اس پر راضی ہوگئیں"

اب شیعہ کتب کے علاوہ دوسری کتب سے چند اقتباسات دئے جاتے ہیں۔

(۱) تفسیر کبیر للرازی ۳ : ۵۷

والجواب ان فاطمه علیها السلام رضیت بقول ابی بکر بعد هذه المناظرة وانعقد الاجماع علی صحة ما ذهب الیه ابوبکر فسقط هذا السؤال

اور جواب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ اس مکالمہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے راضی ہوگئیں اور ابوبکرؓ کے قول پر اجماع ہوگیا اور شیعوں کا یہ سوال ساقط ہوگیا۔

(۲) ریاض النضرۃ مصری ۱ : ۱۵۶ :-

عن عامر قال جاء ابوبکر الی فاطمه وقد اشتد مرضها فاستأذن علیها فقال لها علی هذا ابوبکر علی الباب یستأذن فان شئت ان تأذنی له قالت وذاك احب الیك قال نعم فدخل فاعتذر الیها وكلمها فرضیت عنه۔

(۳) ریاض النضرۃ ۱ : ۱۵۷ :-

وعن الاوزاعی قال بلغنی ان فاطمة بنت رسول الله غضبت علی ابی بکر فخرج ابوبکر حتی قام علی بابها فی یوم حار ثم قال لا ابرح مکانی حتی ترضی عنی بنت رسول الله فدخل علیها علی فاقسم علیها لترضی فرضیت اخرجه ابن السمان فی الموافقة

امام اوزاعی فرماتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت فاطمہؓ جب ابوبکرؓ سے رنجیدہ ہوئیں ابوبکرؓ گھر سے نکلے ان کے دروازے پر جا پہنچے سخت گرمی کا دن تھا۔ فرمایا میں یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک فاطمہؓ راضی نہیں ہوتیں حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو قسم دی کہ راضی ہوجائیں چنانچہ وہ راضی ہوگئیں۔

(۴) فیض الباری :-

روی البیهقی عن الشعبی قال لما مرضت فاطمة اتاها ابوبکر فاستأذن علیها قال علی یا فاطمة هذا ابوبکر یستأذن علیك فدخل علیها ثم ترضاها حتی رضیت ان الشعبی سمعه من علی رضی الله عنه

۵ ۔ کتاب المحن ابی حفص بن شاہین بیان کرتا ہے۔

دخل ابوبکر علی فاطمة بنت رسول الله فما قام ابوبکر حتی رضیت۔

ان روایات سے حضرت فاطمہؓ کے راضی ہونے کے علاوہ ان کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) یعنی حضرت فاطمہؓ کا بیمار ہونا اور حضرت ابوبکرؓ کا عیادت کیلئے آنا۔ باہمی خلوص اور عقیدت کا اظہار ہے۔

(۲) حضرت فاطمہؓ کا انہیں اندر آنے کی اجازت دینا ان کے دل کی صفائی اور خلیفہ رسول کی قدر و منزلت کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ کے اس فعل کو پسند کرنا ظاہر کرتا ہے کہ حضرت علیؓ کے دل میں حضرت ابوبکرؓ کی قدر و منزلت تھی۔

ایسے تعلقات تو صرف اپنوں کے درمیان ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان جو ایک دوسرے سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ دشمن تو ایسے موقع پر نہ عیادت کیلئے آتے ہیں نہ ایک دوسرے کو ملنا چاہتے ہیں۔

ان روایات کی حیثیت اہل فن کے نزدیک یہ ہے

البدایہ والنہایہ ابن کثیر ۵ : ۲۸۹ میں رضامندی فاطمہ کی روایت کو قوی اور سند جید سے بیان کیا ہے۔ اور طبقات ابن سعد ۸ : ۲۷ میں مدارج النبوۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۲ : ۵۴۴ تا ۵۴۶ سیرۃ حلبیہ کی روایت جو امام اوزاعی سے آئی اس کی تصدیق فرمائی ہے۔ فیض الباری میں امام شعبی کا خود حضرت علیؓ سے رضامندی حضرت فاطمہؓ کو بیان کرنا

لکھا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے امام شعبی کی روایت کو صحیح فرمایا ہے۔

صاحب درۃ النجفیہ، علامہ میثم بحرانی، سید علی نقی وغیرہ متقدمین شیعہ علماء نے صاف ذکر کیا ہے کہ فرضیت فاطمہؓ۔ مگر زمانہ حال کے شیعہ علماء نے اہل حدیث پر دو اعتراض کیے مولوی محمد اسماعیل نے اخبار صداقت میں اور مولوی محمد منظور نے توثیق منظوری میں لکھا ہے کہ:

۱۔ بائے موحدہ جب رضا کا صلہ ہو تو رضا بمعنی قناعت ہوتی ہے یہاں فرضیت بذالک ہے اور رضا اور قناعت مختلف چیزیں ہیں۔

یہ بات بظاہر وزنی معلوم ہوتی ہے مگر اہل لغت اس کی تائید نہیں کرتے مثلاً

لسان العرب ۸ : ۲۹۷

قنع بنفسہ قنعاو قناعۃ

القاموس ۳ : ۲۱

القناعۃ الرضا بالقسم — قناعت تقسیم سے راضی ہونے کا نام ہے۔

منتھی الارب ۳ : ۵۵۶

قناعت کسمایت۔ خورسندی۔

اہل لغت کے علاوہ قرآن مجید اس اعتراض کی تائید نہیں کرتا۔

لایرجون لقاءنا ورضوا بالحیاۃ الدنیا واطمانوا بہا — یہاں رضا کا صلہ 'با' ہے مگر مطلب رضا اور اطمینان ہے وہ قناعت نہیں جس میں مجبوری شامل ہو۔

پھر شیعہ لٹریچر میں اس کی تردید میں مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً ناسخ التواریخ جلد سوم از کتاب دوم صفحہ ۲۰ پر حضرت علیؓ کے خطبہ میں یہ مصرعہ موجود ہے۔

وانا راضی بحجۃ اللہ علیھم وعلمہ فیھم — ومن بحجت خدا و امر او در حق ایشان خوشنودم

آگے اسی کتاب کے صفحہ ۳۱ پر ہے

ومساقھم الشیطان لطلب ما لایرضی اللہ بہ — شیطان انہیں اس چیز کی طلب میں لیے پھا جس سے اللہ تعالےٰ راضی نہیں ہے۔

دونوں مقامات پر رضا کا صلہ 'با' ہے مگر معنی رضا ہی کے ہیں قناعت کے نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بحرانی کی روایت بصیغۂ مجہول رُوِیَ سے بیان ہوئی ہے اور یہ دلیل ضعف کی ہے۔

یہ محض دعویٰ ہے جو اصول حدیث کے خلاف ہے۔ شیعہ مذہب میں بصیغۂ مجہول روایت و حدیث کے غیر مشہور ہونے کی دلیل ہے ضعف کی دلیل نہیں۔ اس پر سب شیعہ متفق ہیں کہ جو حکم یا حدیث مشہور ہے ظاہر ہے وہ غلط ہے اور جو غیر مشہور ہے تادیہ تقیہ اور کتمان میں ہے وہ حق ہے۔ دیکھو اصول کافی باب التقیہ والکتمان۔

اس لیے شیعہ اصول کے مطابق اس روایت کو ضعیف نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام نے تقیہ کر کے یا کتمان حق کر کے یا راوی نے ایسا کر کے بصیغۂ مجہول بیان کی ہے اس اصول کی شہادتیں واقعات سے ملتی ہیں۔

(۱) حضرت علیؓ نے خلفائے ثلثہ کی بیعت تقیہ کر کے کی تھی اس لیے ظاہر تو باطل تھا مگر اندر عقیدہ حق تھا۔

(۲) حضرت علیؓ نے خلفائے کی اقتدا میں نماز پڑھی اس لیے ظاہر نماز باطل دل کے اندر جو کچھ تھا وہ حق تھا۔ آگے یہ سلسلہ حضرت امام حسن اور امام حسین کا امیر معاویہ کے عہد تک جاری رہا۔ کہ ان حضرات کے ظاہری حالات باطل تھے اور باطن حق تھا۔ اسی طرح یہ روایت تقیہ کر کے بیان ہوئی ہے شیعہ کے خوف کی وجہ سے واضح کر کے بیان نہیں کی۔

اس روایت پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علامہ میثم بحرانی نے یہ روایت ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ سے نقل کی ہے اور اس نے ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری مصری کی کتاب سقیفہ و فدک سے نقل کی ہے اور یہ دونوں شیعہ نہیں ہیں۔

اس اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ بات تو شیعہ عالم نے کی ہے مگر اس کا ماخذ غیر شیعہ عالم ہے اس لیے غیر معتبر ہے یہ محض بہانہ ہے اور حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ وہ یوں کہ ابن ابی الحدید کے اعتزال سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور حدیدی میں جو عقائد

اس نے بیان کئے ہیں وہ اس کے شیعہ ہونے پر شاہد ہیں پھر اس کے قصیدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف شیعہ نہیں غالی شیعہ ہے پھر یہ کہ علمائے ایران، عراق اسے شیعہ لکھتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ اس نے متکلمین شیعہ کی چند ایک روایات پر کلام کی ہے مگر اس کے ساتھ ہی متکلمین شیعہ کے بہت سے عقائد کی تائید بھی ہے۔

اعتراض کا دوسرا حصہ کہ علامہ بحرانی نے یہ روایت ابن ابی الحدید سے نقل کی ہے۔ غلط ہے کیونکہ بحرانی کی روایت اور ابن ابی الحدید کی روایت کے الفاظ میں اتنا تفاوت ہے کہ اس کو نقل کرنا نہیں کہہ سکتے۔

تیسرا حصہ کہ کتاب سقیفہ و فدک سے نقل کی ہے یہ بھی محض دعویٰ ہے کیونکہ

(۱) اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نام کی کسی کتاب کا وجود پایا گیا ہے۔

(۲) اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نام کی کوئی تصنیف ابوبکر احمد بن عبدالعزیز نے کی۔

(۳) ابوبکر احمد بن عبدالعزیز نام کا اگر کوئی آدمی ہے تو وہ غیر معروف ہے کسی سُنّی عالم نے اس سے کچھ اخذ نہیں کیا نہ کسی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اسمائے رجال کی کسی کتاب میں اس کا مستقل ترجمہ نہیں ملتا۔ ہاں شیعہ علماء نے اس کا ذکر کیا ہے خصوصاً ابوالفرج اصفہانی شیعہ نے اس سے روایتیں لی ہیں جس سے اس شخص کا شیعہ ہونا صاف ظاہر ہے۔

(۴) شیخ طوسی نے امامیہ رجال کی فہرست میں ابوبکر احمد بن عبدالعزیز کا ذکر کیا ہے اور شیعہ عالم محمد بن علی اردبیلی نے اپنی کتاب جامع الرواۃ ۱: ۵۲ پر اس کا ترجمہ مستقل عنوان سے لکھا ہے اور اس کا کوفی ہونا بیان کیا ہے کہ احمد بن عبد العزیز الجوهری له كتاب السقيفه الكوفی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ روایت ہر دور میں شیعہ علماء سے ہی نقل ہو کر آئی ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ احمد بن عبدالعزیز بھی شیعہ تھا۔ ابن ابی الحدید اور میثم بحرانی بھی شیعہ تھے۔ مذکورہ بالا روایات اور تاریخی حقائق نے ثابت کر دیا کہ حضرت فاطمہؓ مطمئن ہو گئیں اور حضرت ابوبکرؓ سے راضی ہو گئیں۔ اگر خالص عقلی پیمانے سے ناپا جائے تب بھی

حضرت فاطمہؓ کا راضی نہ ہونا محال نظر آتا ہے۔

(۱) ناسخ التواریخ ۴: ۲۳۹ از کتاب دوم۔ دنیا کی حقیقت یہ بیان ہوئی ہے۔

قال رسول الله جعلت فداها ابوها ثلاث مرات ليست الدنيا من محمد ولا من آل محمد ولو كانت الدنيا تعدل عند الله من الخير جناح بعوضة ما اسقى فيها كافر شربة ماء

اگر آل محمدؐ میں دنیا کی محبت اس درجے کی ہو کہ حضورؐ کی حدیث سننے کے باوجود چند کھجوروں کی خاطر جانشین رسولؐ سے ناراض ہو جائیں اور پھر عمر بھر راضی ہونے کو نہ آئیں تو مندرجہ بالا حدیث رسولؐ بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ کیا آل محمدؐ میں سے صرف حضرت فاطمہؓ ہی کو آپ اتنا بڑا دنیا دار ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یہ آل محمدؐ کی عزت نہیں بلکہ توہین ہے۔

شیعہ کتب میں سے سب سے پہلی کتاب سلیم بن قیس ہلالی کی ہے۔ اس کے صفحہ ۲۲۴۔۲۲۵ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔ آخر میں ہے۔

فدخلا وسلما قالا ارضى عنا رضى الله عنك۔

یعنی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ کا بیمار پرسی کیلئے جانا اور ان کو راضی کرنے کے لیے یہ الفاظ کہنا پھر بھی حضرت فاطمہؓ کا راضی نہ ہونا حب دنیا اور فنا فی الدنیا کی دلیل بنتی ہے۔ پھر ناسخ التواریخ کی بیان کردہ حدیث کا کیا مطلب ہوا

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا وصف بیان کیا ہے۔

والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس۔

اور واذا ما غضبوا هم يغفرون۔

اور فمن عفا واصلح فاجره على الله۔

اور ولمن صبر وغفر فان ذلك من عزم الامور۔

جب غصہ پی جانا۔ معاف کر دینا عام مسلمانوں میں سے اللہ کے خاص بندوں کا وصف ہے تو کیا آل محمدؐ میں سے حضرت فاطمہؓ کی ذات ہی ایسی ہے جو اس وصف سے

خالی ہے۔ ایسا تصور کرنا یا عقیدہ رکھنا حضرت فاطمہؓ کی توہین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

فتح الباری ۶ : ۱۲۲ اس کی توجیہ بیان کی گئی ہے۔

واما سبب غضبها مع احتجاج ابی بکر بالحدیث المذکور فلاعتقادها تاویل الحدیث علی خلاف ما تمسک به ابوبکر و کانها لا نورث و رأت ان منافع اعتقدت تخصیص العموم فی قوله علیه السلام عن ارض و عقار لا یمتنع ان یورث عنه و تمسک ابوبکر بالعموم واختلفا فی امر محتمل للتاویل فلما صمم علی ذلک انقطعت عن الاجتماع به لذلک

حدیث سے اتفاق کرنے کے باوجود حضرت فاطمہؓ کے غصے کی وجہ تاویل حدیث میں اختلاف تھا۔ حضرت فاطمہؓ عموم سے تخصیص کا عقیدہ رکھتی تھیں لانورث سے حضرت فاطمہؓ یہ سمجھی تھیں کہ زمین کی آمدنی اور مکان کے منافع میں میراث جاری ہونے سے حدیث مانع نہیں ہے اور حضرت ابوبکر کا تمسک عموم الفاظ حدیث سے تھا۔ دونوں کا اختلاف ایک امر احتمالی میں ہوا جب حضرت ابوبکرؓ نے حدیث کے عمومی استدلال پر زور دیا تو حضرت فاطمہؓ نے بحث ترک کر دی۔

حضرت فاطمہؓ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں مجتہد تھے اس لیے حدیث کے تمسک میں اختلاف ہوا اس استدلال میں جب حضرت فاطمہؓ نے استدلال کا پہلو ترک کر دیا تو راوی کو ظن ہوا کہ انہوں نے کلام کرنا ہی چھوڑ دیا۔

حضرت فاطمہؓ نے حدیث سے یہ سمجھا کہ اس میں درہم و دینار کی نفی ہے زمین کی نفی نہیں گویا انہوں نے تخصیص سمجھی اور حضرت صدیق اکبرؓ نے عموم میراث کی نفی سمجھی اور یہی بات صحیح تھی اور اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔

حدیث کے تمام طرق پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غضبت فاطمة فهجرته ولم تكلم سب ظن راوی ہے۔

صحاح میں چودہ مقامات پر حدیث فدک مذکور ہے صرف حضرت عائشہؓ، ابوہریرہؓ اور ابوالطفیل سے ناراضگی کا قول مذکور ہے اور یہ الفاظ حضرت عائشہؓ کے نہیں بلکہ راوی کے

ہیں پوری روایت یوں ہے۔

عن عائشة ان فاطمة والعباس علیهم السلام اتیا ابابکر یلتمسان میراثهما من رسول الله صلی الله علیه وسلم ۔ ۔ ۔ ۔ قال فقال لهما ابوبکر سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لا نورث ما ترکناه صدقة انما یاکل آل محمد من هذا المال قال ابوبکر والله لا ادع امرا رأیت رسول الله یصنعه فیه الا صنعته قال فهجرته فاطمة فلم تکلمه حتی ماتت ۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ دونوں حضرت ابوبکر کے پاس حضورؐ کی میراث کا مطالبہ لے کر آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں نے حضورؐ سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ نبیؐ میراث نہیں چھوڑتے جو رہ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آل محمدؐ اس مال سے کھائے گی" ابوبکرؓ نے فرمایا بخدا میں اس کام کو نہیں چھوڑوں گا جو حضورؐ کیا کرتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ چلی گئیں اور مرتے دم تک ان سے بات نہ کی۔

حدیث کے آخر میں لفظ قال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول حضرت عائشہؓ کا نہیں ورنہ قالت ہوتا پھر اسی قال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلام تو الا صنعته پر ختم ہو گیا آگے قال سے مراد قال الراوی ہے یعنی قال کے بعد کا حصہ راوی کا اپنا خیال یا رائے ہے اس میں بھی فلم تکلمه کی بھی تصریح نہیں۔ اس کی تصریح فیض الباری کے علاوہ تاریخ ابن جریر طبری ۲ : ۴۴۸ پر کی گئی ہے۔

واما عدم کلام فاطمة ایاه حتی ماتت والمراد منه کلامها فی امر فدک

عدم کلام سے مراد فدک کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

شارحین بخاری نے تصریح فرما دی ہے کہ فلم تکلمه سے مراد مطلق کلام نہیں بلکہ فلم تکلمه فی ذلک المال ہے نفی صرف خاص اور مقید کی ہے اور نفی خاص مقید کی نفی عام مطلق کو مستلزم نہیں یہ ساری بحث راوی کے مقولے پر ہے جو حدیث کا حصہ نہیں مزید چھان بین کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ الفاظ کسی شیعہ راوی کے ہیں جو بھیس بدل کر واقعہ کی صورت بگاڑ گیا ہے چنانچہ اللآلی المصنوعة فی احادیث الموضوعة ۲ : ۳۷۴ ملاحظہ ہو۔

عن ابی العینا قال انا والجاحظ وضعنا حدیثا وادجلناه علی المشائخ او علی الشیوخ ببغداد فقبلوه الا ابن ابی شیبه العلوی فانه قال لا یشبه اخرهذا الحدیث اوله وابی یقبله وکان ابوالعینا یحدث بهذا بعد ماتاب۔

ابوالعیناء کہتا ہے میں نے اور جاحظ نے ایک حدیث وضع کی اور مشائخ بغداد کے پیش کی تمام نے قبول کر لی صرف ابن ابی شیبہ علوی نے اسے قبول نہ کیا اور کہا اس حدیث کی ابتداء اس کے آخری حصہ سے نہیں ملتی۔ ابوالعیناء نے اس حرکت سے تائب ہونے کے بعد یہ واقعہ بیان کیا۔

اور علامہ ابن اثیر جزری نے صدر کتاب جامع الاصول فرع ثالث طبقات المجروحین میں بعینہ ان الفاظ میں یہ بات بیان کی ہے صرف یہ الفاظ زائد ہیں وضعت انا والجاحظ حدیث فدک۔

حضرات شیعہ نے بھی دبی زبان سے اس حصۂ حدیث کو وضعی تسلیم کیا ہے۔
شافی از شریف مرتضی علم الہدی ص۲۱۳ طبع ایران۔

اخبرنا جماعة عن ابی عبد اللہ بن احمد بن ابی طاہر عن ابیه قال ذکرت لابی الحسین زید بن علی بن الحسین بن علی ابن ابی طالب کلام فاطمة علیها السلام عند ابی بکر اباها فدك وقلت ان هؤلاء یزعمون موضوع لانه من کلام ابی العینا لان الکلام منسوق البلاغة

ایک جماعت نے ابی عبد اللہ بن احمد بن ابی طاہر سے خبر دی وہ اپنے باپ سے بیان کرتا ہے کہ میں نے ابی الحسین زید بن علی سے حضرت فاطمہؓ کی بات کا ذکر کیا جب حضرت ابوبکرؓ نے انہیں فدک نہیں دیا تھا میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات بناوٹی ہے۔ کیونکہ یہ حدیث فدک ابوالعیناء کی کلام ہے یہ کلام بلیغ ہے اور ابوالعیناء خود بڑا بلیغ تھا۔

علم الہدی کی اس روایت اور صراحت سے معلوم ہوگیا کہ یہ کلام ابوالعیناء کی ہے۔
گویا حضرت فاطمہؓ کے ناراض ہونے اور ترک کلام کا سارا قصہ ہی وضعی اور من گھڑت ہے۔

غضبت فاطمہؓ کے وضعی اور من گھڑت قصہ میں مزید رنگ بھرنے کیلئے ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ من اغضبها فقد اغضبنی

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ورود حدیث حضرت علیؓ کے حق میں ہے دوسری بات یہ ہے کہ یہ دنیوی امور میں ہے اللہ کی بات یا اللہ کے رسول کی بات سننے سے کوئی ناراض ہوتا ہے تو وہ اس ضمن میں آ سکتا ہی نہیں کیونکہ ایسے موقع پر ناراض ہونا بات سنانے والے پر ناراض ہونا نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول سے ناراض ہونا ہے بھلا کوئی مسلمان یہ جرأت کر سکتا ہے اور کسی مسلمان کے متعلق کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ اس کے رسول سے ناراض ہے۔ چنانچہ فتح الباری میں وضاحت کی گئی ہے۔

من اغضبها بطمع نفسه ای من جهة هوی النفس لا من جهة الشرع و اسمعها ابوبکر حدیث الرسول لا من جهة نفسه۔

حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ جس نے اپنی ہوائے نفس کے تحت فاطمہؓ کو ناراض کیا نہ بوجہ شریعت کے۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے تو حدیث رسولؐ ہی سنائی تھی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا تھا۔

واقعات شاہد ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو کوئی ذاتی رنجش نہیں تھا انہوں نے معاملے کی شرعی حیثیت بتائی وہ بھی اپنی طرف سے نہیں بلکہ حدیث رسول سنا کر البتہ یہ ضرور کہا کہ میں رسول کریمؐ کی مخالفت کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا اس کے باوجود اگر حضرت فاطمہؓ کا ناراض ہونا تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاذ اللہ رسول کریمؐ سے ناراض ہوئیں کہ انہوں نے ایسا کیوں فرمایا یا ابوبکرؓ سے اس لیے ناراض ہوئیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول کی مخالفت کرنے کا ارادہ کیوں نہ کیا۔ اور یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی ذات سے ان کا منسوب کرنا ان کی توہین اور اپنے ایمان سے دست برداری کا اعلان ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کو متہم کرتے وقت یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ حضرت علیؓ نے اپنے دور اقتدار میں کیا فرمایا اور کیا رویہ اختیار کیا۔
شافی شریف مرتضی ص۲۴۱

فلما وصل الامر الی علی بن ابی طالب

جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو فدک ...

كلموفى امر فدك فقال انى لاستحيى من الله ان ارد شيئا منع عنه ابوبكر وامضاه عمر۔

بارے میں بات کی گئی فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ میں اس حکم کو رد کروں جس کا فیصلہ ابوبکرؓ نے کیا اور عمرؓ نے برقرار رکھا۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ اور حضرت عمرؓ کے اس پر قائم رہنے کو اللہ اور رسول کے حکم کے عین مطابق سمجھا ورنہ خدا سے حیا محسوس کرنے کا کیا مطلب اور حضرت علیؓ کے متعلق وضاحت ہو چکی ہے کہ آپ نے فدک کے بارے میں اپنے دور اقتدار میں وہی طریقہ اختیار کیا جسے وہ حکم خدا کے مطابق سمجھتے تھے جو طریقہ حضرت ابوبکرؓ نے اتباع نبوی کے تحت اختیار کیا تھا۔ اگر یہ جرم ہے تو کہنا پڑے گا ؎

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

مطالبہ میراث کے سلسلے میں حضرت علیؓ کا کردار

اس واقعہ کا خلاصہ ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار ص۱۰۱ کتاب الفتن میں الاختصاص سے نقل کیا ہے۔

عن عبد الله بن سنان عن ابى عبد الله عليه السلام لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم وجلس ابوبكر مجلسه بعث الى وكيل فاطمه فاخرجه من فدك فاتته فاطمه ..... الى ان قال ابوبكر ان النبى لا يورث فرجعت الى علىّ فاخبرته فقال ارجعى اليه وقولى زعمت ان النبى لا يورث وورث سليمان داود وورث يحيى زكريا وكيف لا ارث انا ابى فقال عمر

عبد اللہ بن سنان امام جعفر صادق سے بیان کرتا ہے کہ جب رسول کریمؐ دنیا سے رخصت ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ ان کے جانشین ہوئے تو انھوں نے حضرت فاطمہؓ کے وکیل کو فدک سے نکال دیا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس فدک کے مطالبہ کیلئے آئیں ..... حضرت ابوبکرؓ نے خلافت رسول سنائی۔ کہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے۔ وہ حضرت علیؓ کے پاس لوٹ گئیں انھیں بتایا۔ کہا پھر جاؤ اور کہو کہ آپ کا خیال ہے نبی میراث

ثم قال انت معلمة قالت وان كنت معلمة فعلمنى ابن عمى علىّ الى ان قالت ان فدك انما هى صدق بها علىّ رسول الله ولى بذلك بنية تجارت ام ايمن وعلىّ ثم خرجت وحملها على اتان عليه كساء فدار بها اربعين صباحا فى بيوت المهاجرين والانصار والحسن والحسين معها فانتهت الى معاذ بن جبل فقالت يا معاذ انى قد جئتك مستنصرة قال وما يبلغ نصرتى وانا وحدى الى ان قال فانصرفت فقال علىّ لها ائتى ابا بكر وحده فانه ارق من الاخر وكلمته وقال صدقت قال فدعا بكتب فكتبه لها برد فدك فاطمه فخرجت والكتاب معها فلقيها عمر فقال يا بنت محمد صلى الله عليه وسلم ما هذا الكتاب الذى معك فقالت كتاب كتب ابوبكر

نہیں چھوڑتے۔ حضرت سلیمانؑ اپنے والد داؤد کے وارث ہوئے حضرت یحییٰ اپنے والد حضرت زکریاؑ کے وارث ہوئے۔ میں اپنے باپ کی وارث کیونکر نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمرؓ نے کہا تمہیں پڑھایا گیا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا اگر ایسی بات ہے تو مجھے میرے ابن عم علیؓ نے پڑھایا ہے ..... فدک تو رسول کریمؐ نے مجھے دے دیا تھا میرے پاس اس کا ثبوت ہے پھر ام ایمن اور علیؓ آئے۔ پھر آپ چلی گئیں۔ پھر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو گدھے پر سوار کیا جس پر ذرا سا کپڑا تھا اور چالیس روز تک مہاجرین و انصار کے دروازوں پر پھرایا حسنین ساتھ تھے۔ آپ معاذ بن جبل کے ہاں پہنچیں امداد طلب کی کہا میں اکیلا مدد نہیں کر سکتا ..... آپ لوٹیں تو حضرت علیؓ نے کہا ابوبکرؓ کے پاس تنہائی میں جاؤ وہ دوسرے (عمرؓ) کی نسبت زیادہ رفیق القلب ہے۔ وہ گئیں بات کی ابوبکرؓ نے ان کے حق میں لکھ دیا۔ تحریر لے کر واپس آئیں تو راستے میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی انھوں نے پوچھا اے دختر رسولؐ! آپ کے پاس یہ تحریر کیا ہے۔

يرد فدك فقال هلميه الى
فابت ان تدفعه اليه فضربها
برجله وكانت حامله بابن اسمه
المحسن فاسقطت المحسن من
بطنها ثم لطمها فكانى انظر الى
قرط كان فى اذنها حين نقفتها ثم
اخذ الكتاب فخرقه فمضت ومكثت خمسة وسبعين
يوما مريضة مما ضربها عمر ثم قبضت انا لله و
انا اليه راجعون۔

کہا ابوبکرؓ نے مجھے فدک کی جاگیر لوٹا دی ہے کہا ادھر لاؤ مجھے دو حضرت فاطمہؓ نے دینے سے انکار کر دیا۔ عمر نے انہیں ٹھوکر ماری۔ وہ حاملہ تھیں۔ اسقاط حمل ہو گیا۔ پھر انہیں تھپڑ مارے۔
پھر وہ وثیقہ لے لیا پھاڑ ڈالا اور چل دئے اس واقعہ کے بعد ۷۵ روز تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں۔ اسی مرض میں وفات پا گئیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقعہ کی اس تفصیل سے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے:۔

(۱) جب حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا کہ ان کے وکیل کو فدک سے نکال دیا گیا ہے تو وہ مطالبہ لے کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس اکیلی گئیں۔

(۲) جب ناکام واپس آئیں تو حضرت علیؓ ان کو دلائل بتا کر دوبارہ اکیلے بھیجا خود ساتھ نہیں گئے۔

(۳) پھر حضرت علی گواہ کی حیثیت سے گئے مگر یہ ظاہر نہیں کہ انہوں نے شہادت کیا دی۔

(۴) حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ کو گدھے پر سوار کر کے نہایت ذلت آمیز صورت میں ۴۰ دن تک مہاجرین اور انصار کے دروازوں پر پھرایا حسنین بھی ساتھ تھے۔

(۵) اس ذلت اور رسوائی سے پھرانے کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ مہاجرین و انصار کے سامنے اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے ان سے امداد طلب کی جائے۔

(۶) اس دوران انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے امداد طلب کی کہ فدک دلا دیں۔

(۷) واپسی پر پھر حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ صرف ابوبکرؓ کے پاس جاؤ۔ خود ساتھ نہیں گئے۔

(۸) حضرت فاطمہؓ اس مرتبہ گئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے وثیقہ لکھ دیا۔

(۹) حضرت عمر سے سر راہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے وثیقہ چھین کر پھاڑ دیا۔

(۱۰) اسی پر بس نہیں کی بلکہ حضرت فاطمہؓ کا گریبان پکڑ کر کھینچا تھپڑ مارا پھر لات ماری جس سے اسقاط حمل ہو گیا۔

(۱۱) واپسی پر حضرت علی کو سب ماجرا سنایا مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ان امور سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں

(۱) حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کی عزت کا ذرا بھر خیال نہیں تھا۔

(۲) ان کی ذلت سے حضرت علیؓ کا دل پسیجنے کا کوئی نشان نہیں ملتا جس سے ظاہر ہے کہ وہ خوش ہوتے تھے۔

(۳) حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کا اتنا خیال بھی نہیں تھا جتنا ایک عام شوہر کو ہوتا ہے اس لیے بار بار انہیں اکیلے ہی بھیجا خود ساتھ نہ گئے۔

(۴) چونکہ انہیں ماکان وما یکون کا علم تھا اس لیے وہ جانتے تھے کہ اب کی بار حضرت عمر کے ہاتھوں انہیں یہ ذلت اٹھانا پڑے گی پھر بھی انہیں خود اکیلے بھیجا صاف ظاہر ہے کہ انہیں اپنی بیوی کی ذلت اور رسوائی سے خوشی ہوتی تھی۔ اگر ایسا نہیں تو ماکان وما یکون والی بات بناوٹی ہے۔ ان میں سے ایک صورت لازماً تسلیم کرنا پڑے گی۔

(۵) مہاجرین و انصار کی امداد کی کیفیت تو ایک دو دن میں بھی معلوم ہو سکتی تھی اس لیے یہ چلہ پورا کرنے میں انہیں ذلیل و رسوا کرنے کے علاوہ کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔

(۶) شیر خدا ہونے کے باوجود اپنی بیوی سے ایک غیر آدمی کا یہ سلوک دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہونا عجیب سی بات ہے کہ ایک عام آدمی کی بیوی سے بھی اگر یہ سلوک کیا جائے تو اس کی غیرت اور حمیت جوش میں آ جاتی ہے کیا شیر خدا میں اتنی غیرت اور حمیت بھی نہ تھی۔

(۷) حضرت علیؓ کی حضرت فاطمہؓ سے اتنی بیزاری ایسی بے رخی اور اس قدر بے گانگی

ان کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور حضرت علی کی شجاعت، مردانگی اور غیرت و حمیت کا بھی ایک بھیانک نقشہ سامنے آتا ہے۔ محبت کا دم بھرنے والوں نے اہل بیت پر کیا ستم ڈھایا ہے۔

حضرت علی کے اس کردار کے علاوہ یہاں ایک ضمنی بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تکرار کے بعد سہی۔ لیکن فدک دے تو دیا پھر شیعہ حضرات انہیں اب تک معاف کیوں نہیں کرتے۔ ان کے پے درپے حملے حضرت ابوبکرؓ پر کیوں ہوتے ہیں۔

اس روایت سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے قلبی تعلق اور دلی محبت کا نقشہ تو سامنے آگیا مگر اس خاکے میں جو مزید رنگ بھرا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

حضرت فاطمہؓ نے جب حضرت عمر کے ہاتھوں اتنی ذلت اٹھائی (بقول شیعہ) تو گھر آکر اپنے محبوب شوہر، شیر خدا اور امام برحق مفترض الطاعت سے خطاب فرمایا

یا ابن ابی طالب اشتملت شملة الجنین وقعدت حجرة الظنین۔	ای پسر طالب خویشتن را شملہ در پیچیدی مانند جنین در رحم و روی از خلق نہفتی چوں مردم متہم:

(احتجاج طبرسی اور ناسخ التواریخ ج ۴: ۱۳۱، ۱۳۲ از کتاب دوم اور حق الیقین)

حق الیقین کی عبارت یہ ہے:-

مانند جنین در رحم پردہ نشین شدۂ و مثل خائباں با خائناں در خانہ گریختہ

خیال رہے کہ یہ خطاب ایک گنوار یا دین سے ناآشنا بیوی کا اپنے شوہر سے نہیں بلکہ خاتون جنت نے شیر خدا اور امام مفترض الطاعۃ سے خطاب کیا ہے ان الفاظ میں تلاش کیجئے کہ حضرت فاطمہؓ کے دل میں حضرت علیؓ کی شجاعت اور تہور کا نقشہ کیا تھا۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا تصور کیا تھا اور اپنے خاوند سے محبت کتنی تھی۔

جانبین کی سیرت و کردار اور ان کے باہمی تعلقات کا جو نقشہ شیعہ روایات میں کھینچا گیا ہے اس کے متعلق انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ایک طرف یہ عقیدہ کہ شیر خدا سات زمینوں کو اٹھانے والا۔ قلعہ خیبر فتح کرنے والا۔ باب قلعہ کو اکھاڑ پھینکنے والا حتیٰ کہ لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔

دوسری طرف یہ نقشہ کہ بیوی جو خاتم الانبیاء کی لخت جگر ہے کی توہین و تذلیل ہوتی ہے بلکہ خود کی جاتی ہے اسے مارا پیٹا جاتا ہے حتیٰ کہ اسقاط حمل ہو جاتا ہے مگر نہ خون حیدری جوش میں آتا ہے نہ ذوالفقار حیدری نیام سے باہر آتی ہے غیرت و حمیت کی ایسی مثال دنیا میں شاید ہی کہیں ملے۔

پھر خاتون جنت سے وہ الفاظ منسوب کئے جاتے ہیں کہ اپنے خاوند کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا ایک جاہل گنوار اور پھوہڑ بیوی کے متعلق بھی تصور میں نہیں آسکتے۔

ان قابل احترام ہستیوں کی سیرت و کردار کا وہ بیان جو حقائق پر مبنی ہے اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روایات میں بیان کردہ تصویر کے دونوں رخ یار لوگوں نے محض زیب داستان کیلئے وضع کئے ہیں۔ محبت اہل بیت کے دعویٰ کے ساتھ اہل بیت سے دشمنی کا حق ادا کر دیا ہے۔

یہاں ایک اور عقدہ بھی کھل رہا ہے۔ شیعہ حضرات نے یہ اتہام باندھا ہے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہو گئیں اور راوی کے اس قول کو کہ غضبت فاطمۃ اس اتہام کی بنیاد بنایا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت ہے حضرت فاطمہؓ کا اپنا قول کہ میں ابوبکرؓ سے ناراض ہوں آج تک کوئی شیعہ پیش نہیں کر سکا۔ صرف ایک راوی کے اپنے قول اور اپنی رائے پر یار لوگوں نے یہ طوفان اٹھایا ہے۔ اب ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے جو حضرت فاطمہؓ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائے۔ ان الفاظ سے پیار جھلک رہا ہے یا غصہ اور ناراضگی۔

پھر یہ الفاظ کسی راوی کے نہیں حضرت فاطمہ کے اپنے الفاظ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ تو حضرت فاطمہؓ کی فرضی ناراضگی کی وجہ سے متہم ٹھیرے حضرت فاطمہؓ کی حقیقی ناراضگی کے اظہار سے حضرت علیؓ کی سیرت کو کیسے بچاؤ گے۔

اس انداز گفتگو کو حضرت فاطمہؓ کی طرف منسوب کرنا ان کی سیرت پر بہت بڑا حملہ ہے اس لیے اس داغ کو دھونے کی خاطر ایک تاویل کی گئی ہے۔

بحار الانوار ص ۱۲۴ کتاب الفتن اور حق الیقین۔

فاقول یمکن ان یجاب عنہ بان ھذہ	میں کہتا ہوں ممکن ہے ان کی طرف سے یہ جواب

الکلمات صدرت منها لبعض المصالح ولو تکن واقعا منکرة لما فعله بل کانت راضیة وانما کان غرضها ان یتبین للناس قبح اعمالهم وشناعة افعالهم وان سکوته لیس لرضاه بما اتوابه۔

دیا جائے کہ یہ کلمات کسی مصلحت کے تحت ان کی زبان سے نکلے حقیقت میں حضرت فاطمہؓ کو حضرت علی کا رویہ ناپسند نہیں تھا بلکہ خوش تھیں ان کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے ابوبکرؓ عمرؓ کے افعال قبیحہ کا اظہار کریں۔ اور حضرت علی کا خاموش رہنا درحقیقت حضرت فاطمہؓ کے رویہ پر رضامندی کے طور پر تھا۔

حق الیقین کی عبارت یہ ہے

مؤلف گوید کہ دریں مقام تحقیق بعض از امور ضرور است ما در جواب گوئیم کہ ایں معارضہ محمول بر مصلحت است از برائے آنکہ مردم بدانند کہ حضرت امیر ترک خلافت برضائے خود نکردہ و بغصب فدک راضی نبودہ۔

اس سے اونچی بات صاحب ناسخ التواریخ نے بتا دی کہ

مکشوف باد کہ اسرار اہل بیت مستور است از مدرکات امثال ما مردم۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اہل بیت کے اسرار ہم جیسے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

پہلی تاویل ایک ایسا معمہ ہے کہ اسے کھولنے بیٹھو تو اور پیچ پڑتے چلے جائیں گے مثلاً

۱۔ حضرت علی عالم ما کان وما یکون تھے دوسری مرتبہ حضرت فاطمہ کو بھیجتے ہوئے علم تھا کہ ان کی توہین وتذلیل ہوگی لہٰذا مصلحت یہی ہے کہ خود نہ جاؤ اپنی عزت بچاؤ دختر رسولؐ کی بے عزتی ہوتی ہے تو ہونے دو۔

۲۔ اسی طرح ان کو علم تھا کہ مہاجرین وانصار کوئی مدد نہیں کریں گے پھر بیوی کو مسلسل ۴۰ روز تک دربدر پھراتے رہنے میں کیا مصلحت تھی؟

۳۔ مہاجرین وانصار کے اعمال قبیحہ کا اظہار مقصود تھا تو گھر کی چار دیواری میں یہ الفاظ کہنے سے اظہار کیسے ہوا کس کے سامنے ہوا۔ اگر صرف حضرت علی کے سامنے اظہار مقصود تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی خود حسن وقبح میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے یہ کمی پوری کی۔ اور اگر اظہار ہی مقصود تھا تو وہ غرض بھی پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ بات تو گھر میں کی گئی تھی حضرت فاطمہؓ نے سر بازار تھوڑا ہی یہ کہا تھا۔

۴۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہؓ اس معاملے میں حضرت علی کے رویہ سے راضی تھیں؟ کس کو بتایا؟ کب بتایا؟ یہ راز کی بات اگر کسی کو بتائی نہیں تو صاحب ناسخ التواریخ نے یہ اجتہاد کس بنا پر کر لیا کہ دراصل وہ راضی تھیں یہ طعنے اور گالیاں محض بناوٹ تھی۔ بہرحال بڑی تلاش کے باوجود حضرت فاطمہ کے اس انداز گفتگو میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ البتہ ایک پہلو قابل غور ہے۔ اگر اس انداز گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت علی سے ناراض تھیں بلکہ یہ تاویل کی جائے کہ یہ محض دکھاوا تھا اصل میں دل سے راضی تھیں تو "غضبت فاطمہ" کی یہ تاویل کیوں نہیں کی گئی کہ حضرت فاطمہ کا حضرت ابوبکر سے یہ رویہ محض ظاہری بات تھی اصل میں وہ دل سے راضی تھیں پھر ان دونوں حالتوں میں بہت بڑا فرق ہے "غضبت فاطمہ" راوی کا قیاس ہے اور حضرت علی کے حق میں ناموزوں الفاظ اور ناراضگی کا اظہار خود حضرت فاطمہ کی زبانی ہو رہا ہے۔ راوی نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو آپ نے فوراً مان لیا اور حضرت فاطمہ خود اپنی زبان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں تو آپ مانتے نہیں یہ رویہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔

میراث کے معاملہ کو طویل اور پہلو دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس میں ایک عجیب الجھن نظر آتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں ایک اصول بیان ہوا ہے جس سے کسی کے کامل الایمان یا ناقص الایمان ہونے کی شناخت ہو سکتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ علامت مومن اور فاسق میں مابہ الامتیاز ہے۔ فروع کافی ۲: ۲۲۵ احتجاج طبرسی ص۱۸۶ اور انوار نعمانیہ ۱: ۲۷۰ بیان ہوا ہے

عن عمر بن حنظلہ قال سالت ابا عبداللہ علیہ السلام عن رجلین من اصحابنا بینھما منازعة فی دین او میراث فتحاکما الی السلطان اوالی القضاة ایحل

عمر بن حنظلہ کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق سے پوچھا کہ دو شیعہ مردوں میں قرض یا میراث کے معاملہ میں جھگڑا ہو جائے وہ اپنا دعویٰ بادشاہ یا قاضی کے پاس لے جائیں

لك قال من تحاكم اليهم في حق او باطل فانما تحاكم الى الجبت والطاغوت المنهي عنه وما حكم له به فانما يأخذ سحتا وان كان حقا ثابتا له لانه اخذه بحكم الطاغوت ومن امر الله ان يكفر به قال تعالى يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا به۔

کیا یہ جائز ہے۔ امام نے کہا جو شخص حاکم یا قاضی (غیر شیعہ) کے پاس فیصلہ کی غرض سے جائے خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ اس کا جانا ایسا ہے جیسے بت یا شیطان کے پاس جانا اس کی ممانعت ہے۔ اور اگر اس کے فیصلہ کے مطابق وہ شیعہ کوئی چیز لے گا تو وہ حرام لے گا خواہ وہ اس کا حق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس نے شیطان کے حکم سے لیا۔ اور خدا کا حکم ہے کہ ان کی نافرمانی کرو۔

یعنی قانون یہ ہے کہ غیر شیعہ حاکم کے پاس اپنا مقدمہ لے جانا ایسا ہے جیسا شیطان کے پاس لے جانا۔ ایسا حاکم اگر اس کے حق میں فیصلہ کر دے تو اس مال سے نفع اٹھانا حرام ہے اور ظاہر ہے یہ جب ایسے حاکم کے پاس مقدمہ لے جانا حرام ہے تو ایسے مال سے نفع اٹھانا تو از خود حرام ہوا۔ اور حرام کا مرتکب فاسق ہے۔

اس اصول کے ماتحت دیکھنا یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ حاکم برحق نہیں (بقول شیعہ) حضرت فاطمہ کا ان کے سامنے اپنا مقدمہ لیجانا اور حضرت علی کے مشورہ سے لے جانا ان دونوں کو کس مقام پر لاکھڑا کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت ایک نے فعل حرام کا ارتکاب لیا ایک نے ایسا کرنے کا مشورہ دیا۔ اور فعل حرام کا مرتکب فاسق ہوتا ہے۔ اب شیعہ اصول کے تحت ان دونوں حضرات کی حیثیت متعین کیجئے۔

اس الجھن سے نکلنے کی دو صورتیں ہیں۔ اگر حضرت ابوبکر کو خلیفہ برحق تسلیم کرو تو حضرت فاطمہ اور حضرت علی کامل الایمان قرار پاتے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر کو خلیفہ برحق تسلیم نہیں کرتے تو ان دونوں حضرات کو فسق کا نشانہ بننے سے بچا نہیں سکتے کیونکہ اصول خود تم ہی نے مقرر کیا ہے۔ عجیب معاملہ ہے کہ ائمہ کی عصمت کے دعویٰ سے سفر کا آغاز کیا اور چند قدم ہی چلے تھے کہ ائمہ کو فسق و فجور کا مرتکب قرار دے دیا اللہ تعالیٰ کج بینی اور کج رائی سے محفوظ رکھے۔

دعویٰ ہبہ فدک

شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فدک کی زمین حضرت فاطمہ کو ہبہ کر دی تھی۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں سید محمد قلی نے پچیس کتابوں کا نام لکھا ہے کہ ان میں دعویٰ ہبہ کا ثبوت موجود ہے۔ کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

روضۃ الصفات، حبیب السیر، معارج النبوۃ، مقصد اقصیٰ، براہین قاطعہ، صواعق محرقہ، صلاح الدین رومی بر حاشیہ شرح عقائد نسفی، جواہر العقدین، وفاء الوفا، خلاصۃ الوفا، شرح مواقف، فصل الخطاب، کتاب الاکتفاء، ریاض النظرۃ، تفسیر کبیر، نہایۃ العقول، محلی ابن حزم، معجم البلدان، کتاب المواقف، الملل والنحل شہرستانی، مغنی عبدالجبار معتزلی، ابوبکر جوہری کوفی محبہ مؤرخ عمر بن شیبہ۔ اتنی کتابوں کے نام گنوا دئے اور تشئید المطاعن میں تحفہ کے جواب میں لکھی گئی ہے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ کسی معتبر کتاب میں صحیح مرفوع الاسناد حدیث میں دعویٰ ہبہ ثابت نہیں۔

اور علامہ فضل نے ابطال الباطل میں لکھا ہے۔

واما دعوى فاطمة فلم يصح في الصحاح ويذكرونها نقله الاخبار من ارباب التواريخ ومجرد نقلهم لا يصير سببا للقدح في الخلفاء۔

اور جہاں تک ہبہ فدک کا تعلق ہے صحیح سند کے ساتھ صحاح ستہ میں موجود نہیں ہاں مؤرخین اپنے طور پر نقل کرتے ہیں صرف ان لوگوں کا نقل کر دینا خلفاء کی قدح کا سبب نہیں بن سکتا۔

سید محمد قلی نے جن کتابوں کی فہرست دی ہے ان میں سے کسی ایک کتاب کے مصنف نے بھی کسی صحیح حدیث سے یہ بات پیش نہیں کی۔ جب حدیث میں اس بات کا سراغ نہیں ملتا تو ظاہر ہے کہ وہ اقوال علماء سے ہے اور اقوال علماء کو روایت نہیں کہا جاتا بہرحال یہ بزعم خویش پیش کردہ روایات دو قسم کی ہیں۔ اول وہ جن میں راویوں کے نام تفصیل سے مذکور نہیں۔ دوسری وہ جن میں بعض راویوں کے نام متروک

ہیں۔ بعض جگہ صرف کتابوں کا نام ہے اب ہم دونوں قسم کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

قسم اول میں شیعہ علماء نے چار حدیثیں پیش کی ہیں۔

(۱) ابن مردویہ نے بیان کی ہے جس کا پہلا راوی ابوالفتح عبدوس بن عبداللہ ہمدانی ہے۔ آٹھواں راوی عطیہ کوفی اور نواں راوی ابوسعید

(۲) پہلا راوی سید ابو حمید مہدی بارھواں راوی فضیل بن مرزوق تیرھواں راوی عطیہ کوفی آخری راوی ابوسعید۔

(۳) پہلا راوی محمد بن سلیمان اعبدی۔ نواں فضیل بن مرزوق دسواں عطیہ کوفی گیارہواں ابوسعید۔

(۴) پہلا راوی محمد بن عباس پانچواں فضیل بن مرزوق چھٹا عطیہ کوفی۔ ساتواں ابوسعید۔

ان چاروں روایتوں میں ابوسعید پر آخر بات ختم ہوتی ہے۔ چاروں میں عطیہ کوفی موجود ہے تین میں فضیل بن مرزوق کا نام ہے۔ اس لیے ان تینوں کا تعارف کرا دینا ضروری ہے۔

ابوسعید۔ اس کا نام محمد بن صائب کلبی ہے۔ دوسرا نام حماد بن سائب کلبی ہے۔ اسکی کنیتیں مختلف ہیں۔ پہلی کنیت ابوسعید ہے اس کنیت سے عطیہ عوفی کوفی شیعہ اس سے روایت کرتا ہے۔

دوسری کنیت ابوالنضر ہے اس کنیت سے ابن اسحاق اس سے بیان کرتا ہے۔

تیسری کنیت ابوالہشام ہے اس کنیت سے قاسم بن ولید اس سے بیان کرتا ہے۔

اس کی پہلی کنیت ابوسعید کے ساتھ "خدری" کا لفظ بڑھا کر اپنوں اور بیگانوں سب کو دھوکا دیا جاتا ہے سنیوں کی کتابوں میں اسی ابوسعید کے ساتھ لفظ خدری بڑھا کر بڑے فریب سے روایات داخل کر دی گئی ہیں۔ یہ تینوں حضرات خالص شیعہ اور تقیہ باز ہیں۔

علامہ سخاوی نے شرح رسالہ منظومہ جزری میں ابوسعید کا حال بیان کیا ہے۔

من اسماء مختلفة ونعوت متعددة محمد بن سائب كلبى المفسر هو ابو النضر الذى روى عنه ابن اسحاق - وهو حماد بن سائب روى عنه ابو اسامه وهو ابو سعيد الذى روى عنه عطية الكوفى وهما انه الخدرى. وهشام روى عنه القاسم بن وليد مات سنة مأته وست اربعين -

ہبہ فدک کے متعلق دوسری قسم میں پانچ روایات بیان ہوئی ہیں۔

(۱) یہ روایت کنز العمال اور تاریخ حاکم سے لی ہے اس کا سلسلہ روایت ابوسعید پر ختم ہوتا ہے۔

(۲) درمنثور سے بلا سند نقل کی گئی ہے بعض شیعہ علماء نے اس روایت کے ساتھ یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ اخرجه البزار وابو يعلى فى مسنده وابن ابى حاتم وابن مردويه اس کا سلسلہ بھی ابوسعید پر ختم ہوتا ہے۔

(۳) کتاب کا نام نہیں لیا صرف دو راوی فضیل بن مرزوق اور عطیہ کوفی بیان ہوئے ہیں یہ روایت بحار الانوار کی کتاب الفتن میں ہے۔

(۴) سنی کتاب کا نام نہیں مگر عطیہ کوفی، بشر بن ولید، واقدی اور بشر بن غیاث راویوں کے نام مذکور ہیں یہ سب غالی رافضی ہیں۔

(۵) معارج النبوۃ اور مقصد اقصیٰ سے لی ہے۔ سند محذوف ہے۔

معارج النبوۃ ایک مولودی رسالہ ہے ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ تحقیق کے میدان میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے۔ صاحب معارج النبوۃ نے خود اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے

ان دونوں قسم کی روایات کی اسناد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ ایک دو کے بغیر سب کا سلسلہ اسی ابوسعید پر ختم ہوتا ہے جو محمد بن سائب کلبی ہے جو مانا ہوا کذاب اور رافضی ہے۔ باقی روایات میں عطیہ کوفی اور فضیل بن مرزوق موجود ہیں جو اسی کلبی کے ہم مشرب ہیں۔

۲۔ ہبہ فدک کے ثبوت میں کوئی ایک بھی ایسی حدیث نہیں پیش کی گئی جو صحیح اور مرفوع السند ہو اور نہ کوئی ایسی حدیث مل سکتی ہے۔

ہبۂ فدک کی تفصیل اور اس کی تاریخ

شیعہ کا کہنا ہے کہ آیت وآت ذاالقربےٰ حقہ نازل ہوئی تو حضور اکرمؐ نے فدک فدک کی زمین حضرت فاطمہ کو ہبہ کردی۔

تاریخ کے اوراق سے اس دعویٰ کی حقیقت کا سراغ لگانا چاہیے۔

(۱) اصول کافی صفہ ۱۶۰ اور صافی ۱ : ۳۵۹ جزء سوم حصہ دوم میں اس آیت کے نزول کے سلسلے میں امام باقرؒ کی روایت موجود ہے کہ

> ان اللہ عزوجل انزل علیہ فی سورۃ بنی اسرائیل بمکۃ وقضی ربک ان لا تعبدوا الخ۔

> وچوں آیت وآت ذاالقربیٰ حقہ در مکہ نازل شدہ چنانچہ می آید در حدیث اول . . . .

صاف ظاہر ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مکہ سے ہجرت کر جانے کے سات سال بعد ۷ھ میں فدک کی زمین حضورؐ کے قبضہ میں آئی۔

اب اس دعویٰ کے دونوں حصوں پر غور کیجئے۔

(۱) جب آیت وآت ذاالقربیٰ نازل ہوئی (۱۱) تو حضورؐ نے فدک کی زمین حضرت فاطمہ کو ہبہ کردی۔ دعویٰ میں "جب" کے بعد "تو" آتا ہے اور تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس گتھی کو سلجھانا مشکل نظر آتا ہے کہ جو زمین ابھی قبضہ میں آئی نہیں وہ برسوں پہلے ہبہ کردی گئی۔

(۲) حیاۃ القلوب ۲ : ۵۰۳ پر آیت کے متعلق ایک اور بیان ملتا ہے۔

> حضرت پرسید از جبریل کہ ذاالقربیٰ کیست وحق او چیست گفت ایں را بفاطمہ بدہ کہ میراث اوست از مادرش خدیجہ وخواہرش ہندہ دختر ابی ہالہ۔

حضورؐ نے جبریلؑ سے پوچھا۔ ذاالقربیٰ کون ہیں اور ان کا حق کیا ہے۔ کہا کہ یہ فاطمہ کو دے دیجئے کہ اس کا ورثہ ہے اس کی والدہ خدیجہ اور انکی بہن ہندہ کے مال سے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ

(۱) فدک کی جاگیر حضورؐ کی ملکیت نہیں تھی بلکہ حضرت خدیجہ اور ہندہ کی ملکیت تھی کیونکہ جبریل نے ان کی میراث فاطمہ کو دینے کا حکم پہنچایا۔

(۲) اس سے ہبہ کے دعویٰ کی نفی ہوگئی کیونکہ جس چیز کے حضورؐ مالک نہیں تھے اسے ہبہ کرنے کا مطلب کیا ہوا۔

(۳) فدک کا یہود کی بستی ہونا بھی غلط ٹھہرا۔ جب حضرت خدیجہ اور ہندہ اس زمین کی مالک تھیں تو کیا یہود اس جاگیر میں بطور مزارع کام کرتے تھے۔

(۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ کو جبریل سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ذاالقربیٰ کون ہیں ان کا حق کیا ہے۔ اس سے پہلے آپ یہ دونوں باتیں نہیں جانتے تھے (معاذاللہ)

(۵) تقسیم میراث کا معاملہ اتنے طویل عرصہ تک تاخیر کی نذر کیوں ہوگیا حضرت خدیجہ تو مکے میں انتقال فرماگئیں اور حضورؐ مکہ سے ہجرت بھی کر گئے سات برس گزر گئے تو اتنی دیر سے میراث کی تقسیم کا حکم ملا۔ حضرت فاطمہ کو تو ماں کے انتقال کے فوراً بعد جائداد ملنی چاہیے تھی۔

۳۔ لیجئے اب واقعات نیا رخ اختیار کرتے ہیں۔

حیاۃ القلوب ۲ : ۲۱۸ حضورؐ فرماتے ہیں۔

> ومادر تو خدیجہ مہرے بر من داشت ومن فدک را بالعوض آں بتو بخشیدم کہ از تو باشد وبعد از تو بفرزنداں تو باشد

تیری والدہ خدیجہ کا مہر میرے ذمہ تھا اس کے عوض میں نے فدک تجھے دے دیا۔ اب یہ تیرا مال ہے اور تیرے بعد تیرے بیٹوں کا مال ہے

اس روایت سے معلوم ہوا کہ :۔

(۱) حضورؐ نے حضرت خدیجہ کے انتقال تک مہر ادا نہ کیا۔

(۲) فدک کی زمین حضورؐ کی ملکیت تھی۔ مال فے نہیں تھا۔

یہ حقیقت نہیں کھلی کہ اگر یہ مال فے نہیں تھا تو حضورؐ کے ہاتھ کیسے آیا۔

مگر اسی حیاۃ القلوب میں ۲ : ۹۲ پہ مہر کی بروقت ادائیگی کا ذکر موجود ہے۔

تزویج کردم بتوای محمدؐ نفس خود را
مہر من در مال من است۔

یعنی مہر تو حضرت خدیجہ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کی ادائیگی حضورؐ کے ذمہ نہ رہی۔ پھر مہر کی مقدار کے متعلق دو مختلف روایتیں ملتی ہیں۔

(ا) حیاۃ القلوب ۲ : ۹۱

بعد از وی (ای ہند) رسول خداؐ او را
بحبالۂ خود آورد و دوازدہ اوقیہ طلا مہر
گردانید۔

(اا) حیاۃ القلوب ۲ : ۹۲ پر ہے۔

پس گواہ باشید اے گروہ قریش کہ من
تزویج کردم خدیجہ دختر را بمحمد بن عبد اللہ
بچہار صد اشرفی مہر۔

ان تمام روایات اور اس تاریخی تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ

(۱) آیت وآت ذا القربی حقہ کے نزول کے وقت حضورؐ نے فدک کی زمین حضرت فاطمہ کو ہبہ کر دی (جو آیت کے نزول کے کم از کم سات برس بعد حضورؐ کے قبضہ میں آئی)

(۲) اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعے حکم بھیجا کہ فدک کی زمین خدیجہ اور ہندہ کی ہے اس کی وارث فاطمہ ہے لہٰذا انہیں یہ میراث دے دی جائے۔

(۳) حضورؐ نے حضرت خدیجہ کے مہر کے بدلے فدک کی زمین حضرت فاطمہ کو دی۔

(۴) حضرت خدیجہ نے اپنا مہر خود اپنے ذمے لیا جس کا اعلان نکاح کے وقت کیا۔

(۵) مہر کی مقدار ۱۲۔ اوقیہ سونا مقرر ہوئی۔

(۶) مہر ۴۰۰ اشرفی مقرر ہوا۔

گویا ضرورت ہے ایک امیر خسرو کی جو یہ ان مل اور بے جوڑ باتیں اور متضاد بیانات

ایک ایسے مربوط شعر میں بیان کرے کہ تضاد رفع ہو جائے۔

اعطائے فدک کی روایت شیعہ حضرات سنی مفسرین کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً روح المعانی ۱۵ : ۶۲

اخرج البزار و ابو یعلی و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ عن ابی سعید خدری

اور ابن کثیر ۳ : ۳۶

قال الحافظ ابو بکر البزار حدثنا عباد بن یعقوب حدثنا یحیی التیمی حدثنا فضیل بن مرزوق عن عطیۃ عن ابی سعید قال لما نزلت وآت ذا القربی الخ دعا رسول اللہ فاطمۃ فاعطاها فدك لو صح اسناده لان الآیۃ مکیۃ وفدك انہ فتحت مع خیبر سنۃ سبع من الهجرۃ فکیف یلتئم هذا مع هذا فهو اذا حدیث منکر ولا شبهۃ انہ من وضع الروافضۃ۔

اور تفسیر مظہری ۵ : ۴۳۳

اخرج ابن حاتم عن السدی واخرجہ الطبرانی وغیرہ عن ابی سعید الخدری قال لما نزلت وآت ذا القربی الخ دعا رسول اللہ فاطمۃ واعطاها فدك وروی ابن مردویہ عن ابن عباس مثلہ ای عن فضیل بن مرزوق عن عطیہ عن ابی سعید الخدری۔

ان تینوں روایتوں میں بات ابوسعید پہ ختم ہوتی ہے۔ روح المعانی اور مظہری میں ابوسعید کے ساتھ خدری بھی ہے۔ ابن کثیر میں خدری نہیں ہے۔ یہ ابوسعید وہی محمد بن سائب کلبی ہے لیکن فن کاروں نے کنیت کے ساتھ خدری لگا کر اصل آدمی کو چھپا دیا ہے۔ مگر فضیل بن مرزوق اور عطیہ تو موجود ہیں یہ دونوں اسی ابوسعید سے روایت کرتے ہیں جو محمد بن سائب کلبی ہے۔ ابوسعید خدری سے روایت نہیں کیا کرتے۔ ابن کثیر نے اس کی سند سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کے تاریخی تضاد کی وجہ سے اسے موضوع اور روافض کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

شیعہ علماء اس سلسلے میں جو روایتیں پیش کرتے ہیں ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ اب ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) پہلی روایت جو شیعہ علماء اور مناظر پیش کرتے ہیں اس کے راوی بشر بن غیاث،

بشر بن ولید اور واقدی ہیں۔

(۲) ابن مردویہ سے لی ہے جس میں فضیل بن مرزوق، عطیہ اور ابو سعید خدری ہیں۔

(۳) تفسیر مجمع البیان سے ہے۔ اس میں فضیل بن مرزوق عطیہ اور ابو سعید ہیں۔

(۴) طبرسی نے تفسیر میں لی ہے اس میں فضیل بن مرزوق، عطیہ اور ابو سعید ہیں۔

(۵) ملا باقر مجلسی اپنی کتابوں میں بیان کرتے ہیں اس میں بھی تینوں راوی ہیں۔

(۶) شیعہ عالم سید ابن طاؤس نے لی ہے اس میں بھی تینوں راوی ہیں۔

(۷) شوستری نے احقاق الحق میں ابن مردویہ سے لی ہے اس میں بھی تینوں راوی ہیں۔

(۸) درمنثور سے لی گئی ہے۔ اسناد حذف کر دیا ہے۔

(۹) کنز العمال سے لی ہے۔ اس میں سند کا سلسلہ ابو سعید پر ختم ہوتا ہے۔

(۱۰) روی السیوطی فی تفسیر الدر المنثور فی ذیل تفسیر آیت وآت ذا القربیٰ الخ واخرج البزار وابو یعلی وابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابی سعید الخدری۔

(۱۱) شعلبی سے نقل کی واقعہ علی بن الحسین کا ہے کہ اس نے ذا القربیٰ سے قرابت رسول مراد لی ہے مگر اس میں فدک کا ذکر موجود نہیں۔

ان روایات میں جن راویوں پر سند کا مدار ہے ان کے اوصاف یہ ہیں۔
واقدی۔ کذاب رافضی، بشر بن غیاث، زندیق کافر یہودی کا بیٹا تھا۔
ابو سعید جو اصل ماخذ اور منبع ہے اس کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔
عطیہ کوفی شیعہ، عباد بن یعقوب: من غلاۃ الشیعۃ ورؤس البدع (میزان الاعتدال)

ان عباد بن یعقوب کان یشتم السلف وقال صالح جزرہ کان عباد بن یعقوب یشتم عثمان وکان داعیا الی الرفض ومع ذلک یروی المناکیر من المشاہیر فاستحق الترک

فضیل بن مرزوق: قال النسائی ضعیف وکذا ضعفہ سعید قالت وکان معروفا بالتشیع وقال ابن الحبان منکر الحدیث جدا ویروی عن عطیہ الموضوعات قلت عطیہ اضعف منہ (میزان الاعتدال)

اس تفصیل سے ان روایات کے راویوں کا کردار سامنے آگیا۔ اصول یہ ہے کہ سند حدیث میں اگر ایک راوی غیر معتبر ہو تو پوری حدیث غیر معتبر قرار دی جاتی ہے۔ ان روایات

میں تو سارے کے سارے راوی کذاب اور شیعہ ہیں جن کے نزدیک جھوٹ بولنا عبادت ہے بلکہ بڑا حصہ دین تو اسی تقیہ میں پنہاں ہے پھر ان روایات پر اعتبار وہی کر سکتا ہے جو جھوٹ کو سچ سمجھتا ہو۔ سوال یہ نہیں کہ فلاں فلاں کتابوں میں ہبہ فدک کا ذکر ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ دعویٰ ہبہ فدک کسی صحیح الاسناد مرفوع حدیث سے ثابت ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔

رہا علمائے متکلمین کا معاملہ تو اس کے متعلق شرح عقائد صفحہ ۴۹ پر وضاحت موجود ہے۔

اما ادلۃ الشیعۃ فاما موضوعات اوغیر واضحۃ الدلالۃ فلا تعارض وینکشف ہذا بالنظر فی کتب الحدیث لکن علماء الکلام بمراحل من علم الحدیث۔

شیعوں کے دلائل من گھڑت ہوتے ہیں یا غیر واضح الدلالت علی المطلوب ہوتے ہیں لہٰذا کوئی تعارض نہ رہا۔ کتب حدیث پر نظر ہو تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے لیکن متکلمین حضرات تو علم حدیث سے کوسوں دور ہیں۔

یعنی متکلمین کا کسی حدیث کے متعلق کچھ کہہ دینا حجت نہیں ہوتا۔ یہ فن محدثین سے تعلق رکھتا ہے پھر یہ کہ متکلمین میں سے بھی جو سنی مشہور ہیں حقیقت میں شیعہ ہوتے ہیں مثلاً شہرستانی جس کے متعلق امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں لکھا ہے۔

بل یمیل الشہرستانی کثیرا الی اشیاء من امورہم بل یذکر احیانا اشیاء من کلام الاسماعیلیہ ولہذا اتہمہ بعض الناس بانہ من الاسماعیلیۃ وقد یقال ہو مع الشیعۃ وبالجملۃ فالشہرستانی یظہر المیل الی الشیعۃ ولا یحتج بہ الا من جاہل وان ہذا الرجل یعنی الشہرستانی کان لہ

علامہ شہرستانی بہت سے امور میں شیعوں کی طرف میلان رکھتا ہے بلکہ احیاناً شیعوں کے فرقہ اسماعیلیہ کے عقائد بیان کرتا ہے اسی لیے اسے اسماعیلیہ ہونے سے متہم کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے وہ شیعہ تھا مختصر یہ کہ شہرستانی کا رجحان شیعہ کی طرف ہے۔ دلیل کے طور پر شہرستانی کا حوالہ صرف جاہل آدمی ہی دے سکتا ہے۔ شہرستانی

بالشیعة الامامیة واتصال وانه دخل فی اھوائھم بما ذکرہ فی ھذا الکتاب یعنی الملل والنحل۔

کو شیعہ سے خاص تعلق تھا۔ الملل والنحل میں جو کچھ اس نے لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ شیعہ بدعات میں شامل تھا۔

شہرستانی متکلم کی حقیقت تو سامنے آگئی اس کے علاوہ جن متکلمین کا شیعہ علماء نے ذکر کیا ہے انہوں نے حدیث ہبہ فدک کی صحت اور عدم صحت کی طرف توجہ ہی نہیں کی اگر وہ لوگ اصول حدیث کے مطابق اس حدیث پر بحث کرتے پھر ہبہ کا ذکر کرتے تو کوئی بات بھی تھی محض ان لوگوں کا ہبہ کی حدیث کا ذکر کر دینا کوئی حجت نہیں۔

صواعق محرقہ کا حوالہ پیش کرنا بھی کوئی مفید مطلب بات نہیں اس کتاب میں اور دوسری ایسی کتابوں میں یہ کہا گیا ہے کہ "اگر دعویٰ ہبہ فدک صحیح ہے تو جواب یہ ہے۔۔۔۔۔۔" لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر دعویٰ ہبہ فدک صحیح تسلیم کر لیا جائے تو جواب بنانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

اعمالِ صالحہ

زندگی کے دو پہلو ہیں اوّل نظریہ یا عقیدہ جس کی حیثیت وہی ہے جو ایک درخت کیلئے بیج کی ہوتی ہے یہی حصہ انسان کی عملی سرگرمیوں کا اصل محرک ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ عمل ہے عمل کے حسن و قبح کا دار و مدار نظریہ اور عقیدہ پر ہوتا ہے جیسے نظریات ہوں گے اسی قسم کے اعمال بھی انسان سے سرزد ہوں گے۔ اس لیے اسلام نے فلاح اور کامیابی کا انحصار ایمان اور عمل صالح پر رکھا۔ قرآن حکیم میں امنوا وعملوا الصالحات کا تکرار اس کثرت سے ہوا ہے کہ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ ایمان صحیح کے مطابق عملی زندگی کا نقشہ بنے تو ایسے اعمال کو اصطلاح شرع میں عمل صالح کہتے ہیں۔

گذشتہ اوراق میں شیعہ حضرات کے عقائد کی وضاحت ان کی اپنی معتبر کتب حدیث و فقہ سے کی جا چکی ہے اب ان کے اعمال صالحہ کا مجمل سا بیان کر دینا مناسب ہے تاکہ زندگی کے دونوں پہلو سامنے آ جائیں۔ اعمال صالحہ میں سرفہرست نماز کا نام آتا ہے۔ اس سے پہلے ہم اذان کا بیان کرتے ہیں۔

اذان :-

اسلام میں اذان کی حیثیت علامت یا شعار کی بھی ہے اور عبادت کی بھی۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تاریخ شاہد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ معمول تھا کہ جب کسی بستی پر پچھلی رات حملہ کرنے کا ارادہ ہوتا تو صبح کی اذان کا انتظار کرتے تھے۔ اگر اس بستی سے اذان کی آواز آتی تو معلوم ہو جاتا کہ یہ مسلمانوں کی بستی ہے چنانچہ حملہ موقوف کر دیا جاتا گویا اجتماعی زندگی میں اذان کفر و

اسلام کے درمیان امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

جہاں تک اس کے عبادت ہونے کا تعلق ہے سو ظاہر ہے کہ پانچ وقت روزانہ توحید و رسالت کا اعلان، پھر ستون اسلام ـــ نماز کے لیے اللہ کے گھر آنے کی دعوت پھر اخروی فلاح کی خوشخبری دینا بڑھ کر عبادت ہے۔ اور یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ عبادات میں توقف ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی عبادت کے لیے جو الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں حضورؐ کے براہ راست شاگرد اس پر عمل کرتے رہے انہیں الفاظ سے وہ عبادت ادا کرنا اصل عبادت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے الفاظ میں کمی بیشی کرنا اس فعل کو عبادت سے خارج کر دیتا ہے۔

اس اصول کے تحت تمام عالم اسلام میں ہمیشہ وہی اذان کہی جاتی رہی جو حضورؐ کے سامنے حضورؐ کے مقرر کردہ مؤذن حضرت بلالؓ کہا کرتے تھے۔ مگر شیعہ حضرات نے اسے اپنے حال پر قائم نہیں رہنے دیا۔ اور نبوت کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اذان میں تبدیلی شروع ہوئی تو ہوتی ہی چلی گئی۔ اذان کی تاریخ شیعہ کتب سے پیش کی جاتی ہے۔

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ۔ ۱۸۸:۱ از شیخ صدوق۔

وروى ابو بكر الحضرمي وكليب الاسدي عن ابي عبد الله عليه السلام انه حكى لهما الاذان فقال الله اكبر الله اكبر الله اكبر الله اكبر اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمدا رسول الله اشهد ان محمدا رسول الله حي على الصلوة حي على الصلوة حي على الفلاح حي على الفلاح حي على خير العمل حي على خير العمل الله اكبر الله اكبر لا اله الا الله لا اله الا الله۔ والاقامة كذلك ولا بأس ان يقال في صلوة الغداة على اثر حي على خير العمل الصلوة خير من النوم مرتين للتقية۔

وقال مصنف هذا الكتاب هذا هو الاذان الصحيح لا يزاد ولا ينقص منه، والمفوضة لعنهم الله قد وضعوا اخبارا وزادوا في الاذان "محمد وآل محمد خير البرية" مرتين وفي بعض رواياتهم بعد اشهد ان محمدا رسول الله "اشهد ان عليا ولي الله" مرتين ومنهم من روى بدل ذلك "اشهد ان عليا امير المؤمنين حقا" مرتين۔ ولا شك في ان عليا ولي الله وانه امير المؤمنين حقا وان محمدا وآله صلوات الله عليهم خير البرية ولكن ليس ذلك في اصل الاذان وانما ذكرت ذلك ليعرف بهذه الزيادة المتهمون بالتفويض المدلسون انفسهم في جملتنا وقال الصادق في المؤذنين انهم الامناء

مصنف کتاب ہذا (شیخ صدوق) کہتے ہیں کہ یہی صحیح اذان ہے اس میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ اور فرقہ مفوضہ نے اپنی طرف سے احادیث وضع کی ہیں اللہ ان پر لعنت کرے اور اذان میں محمد و آل محمد خیر البریۃ دو مرتبہ کا اضافہ کیا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ اشهد ان علیا ولی اللہ دو مرتبہ کا بھی اضافہ کیا اور بعض نے اس کی جگہ اشهد ان علیا امیر المؤمنین حقا دو مرتبہ لکھا ہے۔ اور اس میں تو شبہ نہیں کہ حضرت علی ولی اللہ ہیں وہ واقعی امیر المؤمنین بھی ہیں اور محمد اور آل محمد ساری مخلوق سے بہتر بھی ہیں۔ لیکن یہ سب حقائق جزو اذان تو نہیں ہیں میں نے اس لیے بیان کر دیا کہ معلوم ہو جائے یہ زیادتی مفوضہ نے کی ہے جو بہروپ بدل کر ہم میں شمار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ اور امام نے مؤذنوں کے متعلق فرمایا کہ وہ امین ہوتے ہیں۔

امام جعفر کی اس روایت اور شیخ صدوق کے بیان سے معلوم ہوا کہ

(۱) صحیح اذان وہی ہے جو اہل السنت کے ہاں رائج ہے۔

(۲) اذان میں فرقہ مفوضہ نے تین اضافے کیئے ہیں جن میں سے ایک اضافہ شیعہ نے اپنا لیا ہے۔

(۳) اذان میں اضافہ کرنے والے ملعون ہیں۔

(۴) ان اضافوں میں خلافت بلافصل کا ذکر نہیں یعنی شیخ صدوق کے زمانے تک اذان شیعہ میں یہ ٹکڑا شامل نہیں کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا اضافہ شیعوں نے نہیں کیا البتہ شیعوں نے اس ایجاد کو قبول کر کے اپنا لیا۔ جب اضافہ کرنے والے اسے قبول کرنے والوں کی نگاہ میں ملعون ہیں تو خود قبول کرنے والوں کے ملعون ہونے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔

فرقہ مفوضہ، شیعوں کا ہی ایک فرقہ ہے جو نبی کریم اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کاروبارِ عالم ان کو سونپ دیا گیا ہے۔ امام جعفر صادق مفوضہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

من زعم ان الله عزوجل فوض امر الخلق والرزق الی حججه فقد قال بالتفویض والقائل بالجبر کافر والقائل بالتفویض مشرک۔

(عیون اخبار الرضا ۱ : ۱۰۱)

امام جعفر فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوق کے کام اور رزق تفویض کر دئے ہیں تو اس نے تفویض کا عقیدہ رکھا۔ اور جبر کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے اور تفویض کا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے۔

یعنی فرقہ مفوضہ امام کی نگاہ میں مشرک ہے اور شیخ صدوق کی نگاہ میں ملعون ہے۔ اور علی ولی اللہ کا اضافہ مفوضہ نے کیا۔ شیعوں نے نہیں کیا۔

ان فیصلوں کا حاصل یہ ہے کہ عقیدہ تفویض کی وجہ سے فرقہ مفوضہ مشرک ہے اور اذان میں اضافہ کی وجہ سے ملعون ہے۔ مگر شیعوں نے ان کے فعل کو حق تسلیم کر کے ہی یہ اضافہ اپنی اذان کا جزو بنایا۔ تو انہیں کیا سمجھنا چاہیے؟

امام جعفر کا ایک قول ہے کہ "مؤذن امین ہوتا ہے"، مگر شیعہ نے اپنی اذان میں مفوضہ کا ایجاد کردہ اضافہ شامل کر کے خیانت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ یہ الفاظ اصل اذان میں نہیں ہیں۔

مفوضہ کے اضافوں میں "خلیفۃ بلا فصل" کے الفاظ نہیں ہیں اس لیے ثابت ہوا کہ یہ اضافہ مفوضہ نے نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کس نے کیا؟ ظاہر ہے کہ وہ شیعہ کے بغیر اور کون ہو سکتا ہے۔ جب اذان میں علی ولی اللہ کا اضافہ کرنے والے ملعون ٹھہرے تو

اس جملہ کے بڑھانے والے کیوں نہ ملعون ہوئے۔

اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ چوتھی صدی ہجری تک شیعوں کی اذان میں خلیفۃ بلا فصل کے الفاظ نہیں تھے۔ اس کے بعد اس خیانت کا ارتکاب کیا گیا۔

ایک اور شیعہ محقق جو شیعہ کے ہاں شہید اول کے لقب سے ملقب ہیں اپنی کتاب لمعۂ دمشقیہ ۱ : ۶۰ پر فرماتے ہیں۔

ولا یجوز اعتقاد شرعیة غیر هذه الفصول فی الاذان والاقامة کالتشهد بالولایة لعلی وان محمدا وآل محمد خیر البریه او خیر البشریة وان کان الواقع کذالك فما کل واقع حقا یجوز ادخاله فی العبادات الموظفة شرعا المحدودة من الله تعالے فیکون ادخال ذلك فیها بدعة تشریعا کما زاد فی الصلوٰة رکعة او تشهدا۔

اذان اور اقامت میں کسی کلمہ کا اضافہ کرنا شرعاً ناجائز ہے جیسے ولایت علی کی شہادت یا خیر البریہ کی شہادت وغیرہ گو یہ ایک حقیقت ہے مگر ہر حقیقت کا منصوصہ میں داخل کرنا بدعت ہے اور نئی شریعت بنانا ہے۔ جیسا کہ کوئی نماز میں رکعت کا یا تشہد کا اضافہ کر دے تو یہ نئی شریعت بنانا ہوگا۔

صاحب لمعۂ دمشقیہ شیعہ کے نزدیک شہید اول ہیں اور اس کتاب کے شارح جو روضہ بہیہ کے مصنف ہیں وہ شہید ثانی ہیں اور نور اللہ شوستری شہید ثالث ہے اس ترتیب سے ہی صاحب لمعۂ دمشقیہ کا مقام اور مرتبہ ظاہر ہے۔ اور اس کتاب کے شارح علی بن احمد دسویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دسویں صدی ہجری تک شیعہ نے اپنی اذان میں خلیفۃ بلا فصل کا اضافہ نہیں کیا تھا گو وہ اضافے قبول کر لیے تھے جو ملعونوں نے ایجاد کئے تھے۔ مگر بلا فصل والا اضافہ دسویں صدی کے بعد ہی اذان کا جزو بنایا گیا۔

پہلے محقق نے اذان میں اضافہ کرنے والوں کو ملعون قرار دیا۔ دوسرے محقق نے بدعتی اور نئی شریعت بنانے والے کہا۔ بہرحال شیعہ کا اصل مقام اپنے اکابر کے نزدیک تو متحقق ہو گیا کہ اذان میں اضافہ کر کے آدمی ملعون بھی ہوتا ہے بدعتی بھی اور جماعت سے خارج بھی ہوتا ہے۔

اصل اذان کے متعلق شیخ صدوق کی ایک اور تحقیق ملاحظہ ہو۔

عن ابی عبد اللہ قال لما اسری برسول اللہ وحضرت الصلوۃ فاذن جبرئیل فلما قال اللہ اکبر اللہ اکبر قالت الملائکۃ اللہ اکبر اللہ اکبر فلما قال اشھد ان لا الہ الا اللہ قالت الملائکۃ خلع الانداد فلما قال اشھد ان محمد ارسول اللہ قالت الملائکۃ نبی بعث فلما قال حی علی الصلوۃ قالت الملائکۃ حث علی عبادۃ ربہ فلما قال حی علی الفلاح قالت الملائکۃ افلح من اتبعہ۔

(معانی الاخبار صفحہ ۴۵)

امام جعفر فرماتے ہیں کہ معراج کی رات کو جب رسول کریم کو سیر کرائی گئی اور نماز کا وقت آگیا تو جبرئیل ؑ نے اذان کہی جب انہوں نے اللہ اکبر کہا تو فرشتوں نے بھی اللہ اکبر کہا جب انہوں نے اشھد ان لا الہ الا اللہ کہا تو فرشتوں نے کہا کہ شرک سے بری ہو گیا جب انہوں نے اشھد ان محمد رسول اللہ کہا تو فرشتوں نے کہا نبی مبعوث ہوا ہے۔ جب حی علی الصلوۃ کہا تو فرشتوں نے کہا کہ عبادت کرنے کی حرص دلائی جب حی علی الفلاح کہا تو فرشتوں نے کہا کہ نجات پا گیا جس نے اتباع کی۔

خیال رہے کہ یہ فرمان امام جعفر کا ہے اور بیان شیخ صدوق کا ہے کہ شب معراج جب حضور اکرم بیت المقدس پہنچے تو تمام انبیاء کی امامت کرائی۔ اذان جبرئیل نے کہی یہ وہی اذان ہے جو اصلی ہے اور اہل السنت کے ہاں معمول بہا ہے یعنی جبریل ؑ نے بھی وہی اصل اذان کہی فرشتے اور انبیاء بھی اس اذان سے واقف تھے۔

اذان کا حکم تو مدینہ طیبہ میں ہوا۔ اور معراج مکہ مکرمہ میں ہوا گویا اللہ تعالٰے نے معراج میں حضور اکرم کو جبرئیل ؑ کے ذریعے مطلع کر دیا کہ یہی اذان آپ کی امت کے لیے ہوگی لہٰذا اس اصل اذان میں اگر کوئی اضافہ کیا جائے گا تو رسول ؐ اس سے بری ہے اس لیے اس رسول کا کوئی امتی اصل اذان میں اضافہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہاں رسول ؐ سے باغی ہو کر جو چاہے کرتا پھرے۔

اسی معانی الاخبار کے صفحہ ۴۵ پر شیخ صدوق نے پورا ایک باب اذان اور اقامت کے الفاظ کی تعداد بیان کرنے میں باندھا ہے اس میں جو روایت بیان کی گئی ہے ان میں

پہلے امام باقر ہیں وہ اپنے والد زین العابدین سے وہ امام حسین سے وہ حضرت علی سے بیان کرتے ہیں۔ گویا تمام امام اس اذان میں متفق ہیں اس میں چار بار اللہ اکبر دو بار اشھد ان لا الہ الا اللہ دو بار اشھد ان محمد ا رسول اللہ پھر دو بار حی علی الصلوۃ پھر دو بار حی علی الفلاح ہے۔ اس اذان میں نہ تو اشھد ان امیر المؤمنین علی ولی اللہ ہے نہ خلیفۃ بلا فصل ہے۔ جس سے ظاہر ہے جو اذان شیعوں میں مروج ہے ائمہ کرام اس سے بری الذمہ ہیں۔ یہ سب سبائیوں کی کارستانی ہے۔

پھر اسی معانی الاخبار کے ص۴۲ پر تفصیل دی گئی ہے کہ "حضور جب چھٹے آسمان پر پہنچے تو ساتویں آسمان سے ایک فرشتہ اترا اور اذان کہی (وہی اذان جو اصل ہے اور اہل السنت میں مروج ہے) پھر اقامت کہی اس میں قد قامت الصلوۃ بڑھایا پھر حضور نے فرشتوں کی امامت کی۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ

۱ ۔ آسمان پر فرشتوں میں وہی اصل اذان کہی گئی جو اہل السنت کہتے ہیں۔

۲ ۔ بیت المقدس میں جبرئیل نے وہی اذان کہی۔

۳ ۔ شہید اول نے تسلیم کیا کہ اصل اذان میں پہلا اضافہ ملعون فرقہ مفوضہ نے کیا۔

۴ ۔ شارح لمعہ دمشقیہ نے واضح کر دیا کہ دسویں صدی ہجری تک اذان میں خلیفۃ بلا فصل کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔

اس کا ماحصل یہ ہے کہ شیعہ نے پہلے تو ملعون فرقہ کے اضافہ کو قبول کر کے پھر دسویں صدی کے بعد اپنی طرف سے ایک اور اضافہ کر کے اپنے آپ کو اسی مقام پر لا کھڑا کیا۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ دین، اہل دین کا اپنا ہے لہٰذا انہیں حق پہنچتا ہے کہ اپنی چیز میں ترمیم تنسیخ کمی بیشی کرتے رہیں۔ ہاں اگر دین اللہ اور رسول ؐ کا ہو تو اہل دین کا کام صرف اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت ہوتا ہے۔ غالباً اسی اصولی فرق کی وجہ سے اذان میں اضافے ہوتے رہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ اضافے نہیں ہوا کریں گے۔

۲۔ نماز

دین اسلام میں عقیدہ اور ایمان کی درستگی کے بعد عملاً انسان کی حیثیت بدل جانے کا مظاہرہ جس عمل سے ہوتا ہے وہ اقامت صلوٰۃ ہے۔ قرآن پاک میں ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا بیان بلافصل ہوتا ہے اور ان میں سرفہرست نماز کا بیان ہوتا ہے۔ اس لیے تارک نماز گناہگار یا فاسق متصور ہوتا ہے البتہ اس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

شیعہ کے نزدیک نماز کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ تارک صلوٰۃ کو بھی کافر قرار دیا گیا ہے چنانچہ حق الیقین اور انوار نعمانیہ میں وضاحت کی گئی ہے۔

ان الاصحاب رضوان اللہ علیہم قیدوا الاخبار الدالۃ علی تکفیر تارک بتارکہا عمداً مستحلا لذالک الترک ومن ثم ترتبت ھذہ العقوبات علی ذلک الترک ولکن الاحادیث الواردۃ یکون تارک الصلوٰۃ کافراخالیۃ من ھذہ القید

(حق الیقین ص۳۹۰ انوار ۲ : ۲۳۲)

اصحاب شیعہ نے ان احادیث کو جو تارک نماز کے کافر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اس قید سے مقید کیا ہے کہ وہ عمداً ترک کرے اور اس ترک کو جائز سمجھے ایسے تارک نماز کی سزا یہ ہے مگر ائمہ سے جس قدر احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں اس قید کا ذکر نہیں یعنی صرف یہ ذکر ہے کہ تارک نماز کافر ہے۔

ظاہر ہے کہ ائمہ نے مطلق بے نماز کو قطعی کافر قرار دیا ہے البتہ اصحاب شیعہ نے اس بے نماز کو کافر کہا ہے جو عمداً نماز ترک کرے اور اس فعل کو جائز سمجھے۔ اصحاب شیعہ نے جو رعایت دی ہے اس سے ترک نماز کا گناہ تو ہلکا ہو جاتا ہے مگر اس سے ائمہ کی مخالفت ضرور ہوتی ہے۔

ائمہ کے نزدیک ترک صلوٰۃ کفر ہے اور اس سے میل جول رکھنا گناہ کبیرہ ہے۔

ان من تبسم فی وجہ تارک الصلوٰۃ فکانما ھدم البیت المعمور سبع

جو شخص بے نماز شیعہ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آیا اس نے گویا بیت المعمور (فرشتوں

مرات وکانما قتل الف ملک من الملائکۃ المقربین والانبیاء المرسلین۔

(انوار نعمانیہ ۲ : ۲۳۲)

کا کعبہ) کو سات بار گرایا اور ایک ہزار مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کو قتل کیا۔

بے نماز کی نحوست کا یہ عالم ہے کہ محض اس کے ساتھ خندہ روئی سے پیش آنا اتنا بڑا جرم ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترک نماز خود کتنا بڑا جرم ہے۔ قرآن نے ایک عام مومن کے قاتل کی سزا خلود فی النار بیان کی ہے تو ایک ہزار انبیاء کے قاتل کی سزا کیا ہوگی۔

اسی کتاب کے اسی صفحہ پر ارشاد ہوتا ہے۔

ومن اعان تارک الصلوٰۃ بلقمۃ او کسرۃ فکانما قتل سبعین نبیاً۔

جس نے بے نماز کو ایک لقمہ روٹی کا دیا اس نے گویا ستر انبیاء کو قتل کیا۔

ظاہر ہے تارک نماز سے مکمل بائیکاٹ کا حکم ہے وہ بال برابر امداد کا مستحق نہیں لیکن اس کے باوجود ملنگوں کے وارے نیارے ہیں۔

پھر اسی صفحہ پر آگے ارشاد ہوتا ہے۔

لا ایمان لمن لا صلوٰۃ لہ ولا حظ فی الاسلام لمن لا صلوٰۃ لہ۔ ومن احرق سبعین مصحفا وقتل سبعین نبیا وزنا بامہ سبعین مرۃ وافتضی سبعین بکرا بطریق الزنا فھو اقرب الی رحمۃ اللہ من تارک الصلوٰۃ۔

بے نماز بے ایمان ہے اسلام میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور جو شخص ستر قرآن مجید جلا دے، ستر انبیاء کو قتل کرے، اپنی ماں سے ستر بار زنا کرے اور ستر کنواری لڑکیوں سے زنا کرے وہ شخص اللہ کی رحمت کے زیادہ قریب ہے بہ مقابلہ اس شخص کے جو نماز ترک کرے۔

یہ وعیدیں تارک صلوٰۃ کے لیے ہیں۔ اور ترک صلوٰۃ باجماعت بھی ایسی وعیدوں کا مستحق ہے۔

قال النبیؐ من لم یحضر الجماعۃ ثلاثۃ ایام متوالیۃ فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ

رسول کریمؐ نے فرمایا جو شخص تین روز متواتر نماز باجماعت نہ پڑھے اس پر اللہ کی فرشتوں

والناس اجمعین۔ فان تزوج فلا تزوجوہ وان مرض فلا تعودوہ الافلاصلوٰۃ لہ ولاصوم لہ ولا زکوٰۃ لہ فلا حج لہ ولاجہاد لہ
(انوار نعمانیہ ۲:۲۴۴)

کی اور تمام انسانوں لعنت یعنی وہ قطعی ملعون ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے رشتہ نہ دو اگر بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت نہ کرو خوب سن لو اس کی کوئی نماز نہیں کوئی روزہ حج زکوٰۃ جہاد نہیں۔

گویا ترک جماعت سے تمام اعمال ضائع ہوگئے۔ نتیجہ وہ بھی کفر کی زد میں آگیا۔

ان احادیث اور روایات سے صاف ظاہر ہے کہ تارک نماز صرف کافر ہی نہیں بلکہ انبیاء کے قاتل کی مانند ہے۔ اور معاشرے میں اس کا مقام یہ ہے کہ اپنی ماں سے زنا کرنے والے سے بھی گیا گزرا ہے۔ اور تارک نماز سے میل جول رکھنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں شیعہ حضرات کے عمل اور انکی عادت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نمازیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اس لیے جو بے نماز ہیں وہ تو کفر کے دائرہ میں چلے گئے۔ اور جو نماز پڑھا کرتے ہیں وہ بے نمازوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے سزا سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

بے نماز کے تفصیلی مناقب دیکھنے ہوں تو جامع الاخبار کا مطالعہ کیجئے جو شیعہ کی معتبر کتاب ہے عقائد کے باب میں عقیدہ آخرت کے تحت جزا و سزا کا جو قانون بیان ہوا ہے اس کا منشا تو یہ ہے کہ شیعہ کو نماز وغیرہ کا تکلف کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے ہاں نماز کی کوئی خاص اہمیت نہیں البتہ مختصر بصائر الدرجات میں ایک ایسی عبادت کی نشاندہی کی گئی ہے جو تمام عبادات سے افضل ہے۔

۱۔ عن ابی جعفر علیہ السلام قال ان اللہ عزوجل خلق جبلا محیطا بالدنیا من زبرجدۃ خضراء وانما خضرۃ السماء من خضرۃ ذلک الجبل وخلق خلقہ خلقا لم یفترض علیہم شیئا مما

امام باقر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے سبز زبرجد کا ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے آسمان کی سبزی اسی کی سبزی سے ہے اس پہاڑ کے پیچھے خدا نے ایک مخلوق پیدا کر رکھی ہے ان پر نماز زکوٰۃ

افترض علی خلقہ من صلوٰۃ وزکوٰۃ وکلہم یلعن رجلین من ہذہ الامۃ وسماہما۔

کچھ فرض نہیں ان کی عبادت صرف یہی ہے کہ اس امت کے دو آدمیوں (صدیق فاروق) پر لعنت کیا کریں اور ان کے نام لیے۔

۲۔ عن ابی الحسن الرضا قال سمعتہ یقول ان اللہ خلق ہذہ النطاق زبرجدۃ خضراء منہا اخضرت السماء قلت وما النطاق قال الحجاب وللہ عزوجل وراء ذلک سبعون الف عالم اکثر من عدد الجن والانس وکلہم یلعن فلانا وفلانا ؎

ص ۱۲/۱۱

موسیٰ رضا فرماتے ہیں میں نے ان سے سنا کہ اس نطاق کے پیچھے زبرجد کا پہاڑ ہے میں نے پوچھا نطاق کیا ہے فرمایا حجاب اور اس کے پیچھے ستر ہزار جہان آباد ہیں۔ ان کی تعداد جنوں اور انسانوں سے زیادہ ہے۔ یہ سب فلاں فلاں (صدیق و فاروق) پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

(۱) معلوم ہوا کہ شیعہ کے نزدیک شیخین پر لعنت بھیجنے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں اس عبادت کے لیے انسانوں میں سے شیعہ ناکافی تھے اس لیے اللہ تعالٰے نے ستر ہزار جہان پیدا کر دئے کہ بس یہی عبادت کرتے رہیں دوسری عبادتوں پر وقت ضائع نہ کریں جو انسانوں پر فرض کی گئی ہیں۔

(۲) وہ ستر ہزار جہان کوئی مادی دنیا معلوم نہیں ہوتی اور وہاں کی مخلوق بھی مادی مخلوق نہیں ورنہ موجودہ سائنسی ترقی پا جانے والوں اور جغرافیہ دانوں نے کوئی سراغ تو لگا لیا ہوتا۔

(۳) مذاہب عالم میں یہ واحد مذہب ہے جس میں گالیاں دینا عبادت شمار ہوتا ہے۔

افضل العبادات والذّ العبادات

عبادات اور اعمال صالحہ کے مدارج مختلف ہوتے ہیں جیسے فرض، واجب، سنت مستحب وغیرہ اور ہر درجہ کی عبادت کے مناسب صلہ اور ثواب مرتب ہوتا ہے۔ جب کسی عبادت کا اجر بیان کیا جاتا ہے اس سے اس عبادت کا مقام اور مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ اجر و ثواب کے بیان پر غور کیا جائے تو شیعہ کتب میں ایک عبادت ایسی ملتی ہے کہ دوسری کوئی عبادت اس کا ہم پلہ نہیں معلوم ہوتی۔ اور وہ ہے متعہ۔

متعہ کسے کہتے ہیں؟

فروع کافی میں متعہ کی حقیقت یوں بیان ہوئی ہے

عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال جاءت امرأة الی عمر فقالت انی زنیت فطھرنی. فامر بھا ان ترجم فاخبر بذلک امیر المؤمنین صلوات اللہ علیہ فقال کیف زنیت فقال مررت بالبادیة فاصابنی عطش شدید فاستقیت اعرابیا فابی ان یسقینی الا ان امکنه من نفسی فلما اجھدنی العطش وخفت علی نفسی سقانی فامکنته من

امام جعفر سے روایت ہے۔ ایک عورت حضرت عمر کے پاس آئی اور کہا میں نے زنا کیا مجھے پاک کر دیجئے حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا اس کی اطلاع حضرت علی کو ہوئی انہوں نے اس عورت سے پوچھا تو نے کس طرح زنا کیا۔ اس نے کہا۔ میں جنگل میں تھی مجھے سخت پیاس لگی میں نے ایک اعرابی سے پانی مانگا اس نے صرف اس شرط پر پانی دینا منظور کیا کہ میں اسے اپنے وجود پر قدرت دے دوں جب پیاس نے مجھے مجبور کر دیا مجھے جان کا خطرہ ہوا

نفسی فقال امیر المؤمنین هذا تزویج و رب الکعبة۔

(فروع کافی ۱۹۸:۲)

تو اس نے مجھے پانی پلایا اور میں نے اسے اپنی جان پر اختیار دے دیا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا رب کعبہ کی قسم یہ تو نکاح (متعہ) ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ:-

(۱) اس واقعہ میں جو کچھ پیش آیا اس عورت نے اسے زنا قرار دیا اور حضرت عمر کے سامنے آ کر زنا کا اقرار کیا۔

(۲) وہ عورت اہل زبان تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس وقت کے عام مسلمان اس صورت واقعہ کو وہی جرم سمجھتے تھے جسے شریعت نے زنا کہا ہے۔

(۳) یہ واقعہ حضرت عمر کے عہد خلافت کا معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ یہ سزا شریعت کی رو سے زنا کے مرتکب کے لیے ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ فعل شریعت کی نگاہ میں زنا ہے۔

(۴) شیعہ کے نزدیک یہ نکاح ہے۔ کہ ایک مرد اور ایک عورت باہمی رضامندی سے جو مباشرت کریں جس کے لیے ایجاب قبول شرعی، گواہ، مہر، وغیرہ کی ضرورت نہیں اور جس کے لیے طلاق کی ضرورت بھی نہیں۔ اور یہی متعہ ہے۔

(۵) اس روایت میں حضرت علی کی زبان سے یہ تو کہلوا دیا کہ یہ تزویج (متعہ) ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ زنا کیا ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ جس فعل کو عام مسلمان، شریعت اسلامی، اور قانون شریعت زنا کہتا ہے اور جس کی سزا سنگسار کرتا ہے شیعہ کے نزدیک وہ متعہ ہے۔ نام بدل دینے کا فائدہ یہ ہوا کہ زنا کرو تو مجرم، حرام کے مرتکب اور سزا کے مستحق اور متعہ کہہ دو تو یہی فعل جائز ہی نہیں عبادت بلکہ افضل ترین عبادت قرار پائے۔ کتنی آسانیاں ہیں۔ دنیا میں مزے لوٹو۔ شہوت رانی کرو۔ اور آخرت میں وہ نعمتیں اور وہ مقام حاصل کرلو جو ائمہ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) تفسیر منہج الصادقین۔ علامہ فتح اللہ کاشانی طبع ایران ص ۳۴۲

از صالح بن عقبہ از پدر انش کہ گفت از امام باقر پرسیدم کہ در متعہ کردن ثواب ہست؟ فرمود

اذا کان یرید بذلک وجہ اللہ تعالیٰ وخلافا من اکرھھا لم یتکلمھا بکلمۃ الا کتب اللہ بھا حسنۃ ولم یمد یدہ الیھا الا کتب اللہ لہ حسنۃ فاذا دنی منھا غفر اللہ لہ بذلک ذنبا فاذا اغتسل غفر اللہ لہ ذنوبہ بعدد ماء علی شعرۃ۔

صالح اپنے باپ سے بیان کرتا ہے کہ اس نے کہا میں نے امام باقر سے پوچھا متعہ کرنے میں کوئی ثواب بھی ہے؟ امام نے فرمایا کہ آدمی جب محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اور اس فعل کو اچھا نہ سمجھنے والوں کی مخالفت کی نیت سے متعہ کا ارادہ کرتا ہے تو ممتوعہ سے جو بات کرتا ہے ہر کلمہ کے عوض ایک نیکی لکھی جاتی ہے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جب اس کے قریب ہوتا ہے تو اس حرکت سے اللہ اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور جب وہ غسل کرتا ہے تو اللہ اس کے اتنے گناہ معاف کر دیتا ہے جتنے بالوں پر سے وہ پانی گزرے۔

ظاہر ہے کہ اس عبادت کی محض نیت کرنے سے ثواب شروع ہو جاتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ ثواب میں اضافہ ہوتا ہے حتی کہ اس کے سابقہ گناہ بھی دھل جاتے ہیں البتہ شرط یہ ہے کہ محض اللہ کی رضا کے لیے اور مخالفوں کو جلانے کے جذبہ سے یہ عبادت کرے۔

(۲) ایضاً ص ۲۷۳

قال النبیؐ من تمتع مرۃ واحدۃ عتق ثلثہ من النار ومن تمتع مرتین عتق ثلثاہ من النار ومن تمتع ثلث مرات عتق کلہ من النار۔

رسول خدا نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ متعہ کیا اس کے جسم کا تیسرا حصہ آگ سے آزاد ہو گیا جس نے دو مرتبہ متعہ کیا دو تہائی حصہ آگ سے آزاد ہو گیا اور جس نے تین مرتبہ متعہ کیا وہ کامل طور پر آگ سے آزاد ہو گیا۔

گو اس حدیث میں النار کا لفظ ہے جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ شہوت کی آگ ہے یا جہنم کی مگر النار کا لفظ جہنم کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے اس کے لیے اس عبادت سے انسان ایسا ناجی قرار پاتا ہے کہ جہنم کی آگ اسے چھو بھی نہیں سکتی بشرطیکہ ہمت کر کے تین مرتبہ یہ عبادت کر ڈالے۔

(۳) اس عبادت پر جب اتنا ثواب ملتا ہے تو اس کے لیے سرکاری پہرہ کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ منہج الصادقین ص ۳۷۴

و ہر گاہ متمتع و متمتعہ باہم بنشینند فرشتہ بر ایشاں نازل کردہ و حراست ایشاں کند تا آنکہ از آں مجلس برخیزند و اگر باہم سخن کنند سخن ایشاں ذکر و تسبیح باشد و چوں دست یکدیگر بدست گیرند ہر گناہے کہ کردہ باشد از انگشتاں ساقط گردد و چوں یکدیگر را بوسہ نہند حج و عمرہ برائے ایشاں بنویسند و چوں خلوت کنند بہر لذت و شہوت حسنات بنویسند مانند کوہ ہائے برافراشتہ بعد ازاں فرمود کہ جبرئیل مرا گفت یا رسول اللہ حق تعالیٰ می فرماید کہ چوں متمتع و متمتعہ برخیزند و بغسل کردن مشغول شوند در حالیکہ عالم باشند کہ من پروردگار ایشانم و ایں متعہ سنت من است بر پیغمبر من، با ملائکہ خود گویم کہ فرشتگان من نظر کنید بایں بندۂ من کہ برخاستہ اند و بغسل کردن مشغول اند و میدانند کہ من پروردگار ایشانم

جب ایک مرد اور ایک عورت متعہ کی نیت سے جمع ہوں تو ان پر ایک فرشتہ نازل ہوتا ہے جو انکی حفاظت کرتا ہے جب تک وہ علیحدہ نہ ہوں۔ ان کی آپس کی باتیں ذکر و تسبیح کا حکم رکھتی ہیں جب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں تو ان کے سابقہ گناہ ان کی انگلیوں سے جھڑ جاتے ہیں جب ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں ان کے نامۂ اعمال میں حج و عمرہ لکھا جاتا ہے۔ جب لذت لیتے اور شہوت کی آگ بجھانے کیلئے مباشرت کرتے ہیں تو انکی نیکیاں پہاڑوں کے برابر لکھی جاتی ہیں اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے کہا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ دونوں غسل کرنے لگیں یہ جانتے ہوئے کہ میں ان کا رب ہوں اور یہ متعہ میری سنت ہے جو میں نے اپنے پیغمبر پر نازل کی ہے۔ تو میں فرشتوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو میرے بندے جو مجھے اپنا رب سمجھتے ہیں غسل میں

گواہ باشید بر آنکہ من آمرزیدم ایشانرا و آب بر، ہیچ موئے ایشاں از بدن ایشاں نگذرد مگر آنکہ حق تعالیٰ بہر موئے دہ حسنہ برائے ایشاں بنویسد و دہ سیئہ محو کند و دہ درجہ رفع نماید۔ پس امیر المؤمنین برخاست وگفت یا رسول اللہ انا مصدقک من تصدیق کنندہ ام۔ یا رسول اللہ چیست جزائے کسے کہ دریں باب سعی کند فرمود لہ اجر ھما مرا ورا باشد اجر متمتع و متمتعہ۔ گفت یا رسول اللہ اجر ایشاں چہ چیز است؟ فرمود چوں بغسل مشغول شوند بہر قطرۂ آبکہ از بدن ایشاں ساقط شود حق تعالےٰ فرشتہ بیا فریند کہ تسبیح و تقدیس او سبحانہ کند و ثواب آں برائے غاسل ذخیرہ شود تا روز قیامت اے علی! ہر کہ ایں سنت را سہل فرا گیرد و احیائے آں نکند از شیعہ من نباشد و من از دے بری باشم۔

مشغول ہیں تم گواہ رہو کہ میں نے انہیں بخش دیا اور ان کے بدن کے جس بال پر غسل کا پانی بہتا ہے ہر بال کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ دس برائیاں معاف ہوتی ہیں اور دس درجے بلند کئے جاتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی اٹھے اور کہا یا رسول اللہ میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں۔ یا رسول اللہ جو شخص اس کام میں کوشش کرے اس کا اجر کیا ہے۔ فرمایا سعی کرنے والے کو ان دونوں کے برابر ثواب ملے گا۔ پوچھا یا رسول اللہ ان کا اجر کیا چیز ہے؟ فرمایا جب یہ غسل کریں ان کے بدن سے گرنے والے پانی کے ہر قطرے سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو قیامت تک تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتا ہے اور اس کا ثواب غاسل کیلئے جمع ہوتا رہتا ہے۔ اے علی! جو اس سنت کو معولی سمجھے اور اسے زندہ کرنے کی کوشش نہ کرے وہ میرے شیعوں میں سے نہیں اور میں اس سے بری ہوں۔

اس حدیث سے بہت سے نادر نکتے ہاتھ آتے ہیں۔

(۱) جونہی ایک مومن اور مومنہ اس عبادت یعنی متعہ کی نیت سے مل کر بیٹھیں ایک فرشتہ ان کے پاس بھیج دیا جاتا ہے کہ ان کی حفاظت کرے اور یہ بھی دیکھے کہ کوئی نامعقول آدمی ان کی عبادت میں مخل نہ ہو۔ شاید ان کی نیکیاں لکھنے کی ڈیوٹی بھی دیتا ہو۔

(۲) اس جوڑے کی باہم شہوت انگیز باتیں ذکر و تسبیح کے برابر ہیں۔ یہ نکتہ کوئی دانشور نہی

حل کر سکتا ہے کہ اس سے شہوت انگیز باتوں کی عظمت اور تقدس ظاہر ہوتا ہے یا ذکر و تسبیح کی توہین و تذلیل۔

(۳) یہ راز بھی کھل گیا کہ مومنین حج بیت اللہ کا کوئی خاص اہتمام کیوں نہیں کرتے۔ جب ممتوعہ سے بوس و کنار حج و عمرہ کے برابر ہے تو گھر بار چھوڑنے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے اور زر کثیر صرف کرنے کی حماقت بھلا کوئی کیوں کرے۔ اس لیے جب کبھی حج کا خیال پیدا ہوا کسی پارسا مومن نے کسی پارسا مومنہ کو پکڑا بوس و کنار میں مشغول ہو گئے۔ لذت بھی حاصل ہوئی اور حج کا ثواب بھی مل گیا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا دے۔

(۴) اللہ میاں فرشتوں کو ان عبادت گذاروں کے غسل کا منظر دکھاتے ہیں اور انکی بخشش کی بشارت سنا کر انہیں گواہ بناتے ہیں۔ عین حالت عبادت کا منظر دیکھنے کی دعوت شاید اس لیے نہیں دی جاتی کہ ابھی عبادت تشنۂ تکمیل ہوتی ہے۔

(۵) غسل کے پانی سے جو قطرے گریں ان کی تعداد کا اندازہ کون کر سکتا ہے پھر بھی لاکھوں سے کیا کم ہوگی۔ اتنے فرشتے ہر عبادت کے بعد غسل کرنے پر پیدا کرنا قیامت تک ان کا تسبیح و ذکر میں مصروف رہنا اور اس کا ثواب غاسل کے لیے ذخیرہ ہوتے رہنا عجب ... بر تعیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا ... ے ہے۔

(۶) اس عبادت کے لیے کسی مومن اور مومنہ کے درمیان رابطہ قائم کرنے والا اور اس مہم میں سعی کرنے والا جسے حرف عام میں دلال کہتے ہیں۔ اور بھی مزے میں رہتا ہے کہ اسے ہر دو کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اس لیے کوٹھے پر بیٹھنے اور دلالی کرنے میں کوئی عار کیوں سمجھے۔ اور اس کاروبار کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھا جائے۔

(۷) جو شخص اس سنت کو ادا کرنے اور اسے زندہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ شیعہ ہی نہیں اور رسول خدا اس سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں (معاذ اللہ) کون ہے جو اس وعید کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلے اور اس سنت کے احیا میں تن من دھن نہ لگا دے ایسے شخص کے لیے دوسری وعید بھی سن لیجئے۔

قال النبي من خرج من الدنيا ولم يتمتع جاء يوم القيامة وهو اجدع (ايضاً ص ۳۶۴)	رسول خدا نے فرمایا کہ جو شخص دنیا سے اس حال میں گیا کہ اس نے عمر بھر متعہ نہیں کیا وہ قیامت کے دن یوں اٹھے گا کہ اس کی ناک کٹی ہوئی ہوگی۔

ناک بچانے کے لیے تو لوگ گھر بار لٹا دیتے ہیں تو جو شخص اتنا کم ہمت ہے کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی یہ عبادت نہ کر سکے، اس کی ناک کیسے سلامت رہ سکتی ہے۔

مذکرہ بالا دو حدیثوں سے متعہ کے اجر و ثواب کا جو نقشہ بیان ہوا۔ اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آدمی ساری عبادات کو موقوف کر کے صرف اسی عبادت میں مصروف رہے تو اسے قیامت کے دن کس بات کی کمی کا احساس ہو سکتا ہے۔ پھر بھی ایک اور حدیث میں اس عبادت کا صحیح مقام یوں بیان ہوا ہے۔

قال رسول الله من تمتع مرة درجته كدرجة الحسين ومن تمتع مرتين درجته كدرجة الحسن ومن تمتع ثلث مرات درجته كدرجة علي ومن تمتع اربع مرات درجته كدرجتي۔ (ايضاً ص ۳۶۳)	رسول خدا نے فرمایا جو ایک دفعہ متعہ کرے اس کا درجہ حسین کے برابر ہے جو دو دفعہ کرے حسن کے برابر جو تین مرتبہ کرے علی کے برابر اور جو چار مرتبہ کرے اس کا درجہ میرے برابر ہے۔

ترجمہ از مصنف:- ہر کہ یک بار متعہ کند درجۂ او چوں درجۂ حسین باشد و ہر کہ دو بار متعہ کند درجۂ او چوں درجۂ حسن باشد و ہر کہ سہ بار متعہ کند درجۂ او چوں درجۂ علی ابن ابی طالب باشد و ہر کہ چہار بار متعہ کند درجۂ او چوں درجۂ من باشد۔

کہتے ہیں اہل بیت کا درجہ بہت بلند ہے۔ حسنین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور علی ابن ابی طالب بقول شیعہ تمام مخلوق سے افضل ہیں بلکہ آدم کو بتایا گیا تھا کہ اگر میں علی کو پیدا نہ کرتا تو دنیا ہی کو پیدا نہ کرتا۔ ادھر اتنی بلندی اور ادھر اتنی پستی کہ وہ فعل جسے دنیا زنا کہتی ہے اور شیعہ اسے متعہ کہتے ہیں زندگی بھر میں ایک مرتبہ کر لو تو حسین کے درجے تک پہنچ جاؤ گے۔ اگر امام حسین کو یہ نسخہ بروقت مل جاتا تو کربلا کے مصائب دیکھنے

کیلئے کیوں گھر سے نکلتے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اہل بیت کی توہین اس سے بڑھ کر بھی کسی طرح کی جا سکتی ہے۔ کیا خاتم الانبیاءؐ کی توہین کیلئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی اقدام کیا جا سکتا ہے کہ ایسا قول ان کی طرف منسوب کیا جائے۔

اس روایت میں چار کے عدد تک رک جانا حیرت کی بات ہے۔ چار کا عدد ہی مؤمنین کے لیے سوہان روح بن جاتا ہے اس کے لیے اچھا ہوتا اگر یہ حضرات اپنے محبوب عدد پانچ تک لے جاتے۔ اور یہ کہا جاتا کہ جو شخص پانچ مرتبہ متعہ کرے اس کا درجہ خدا کے برابر ہے۔

سابقہ طویل حدیث اور اس حدیث کو ملا کر پڑھنے سے ایک اور نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ سابقہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس نے متعہ کی سنت کا احیاء نہ کیا وہ شیعہ ہی نہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ جس نے ایک مرتبہ متعہ کیا وہ حسین کے برابر ہے نتیجہ یہ کہ جو شیعہ ہے۔ وہ لازماً حسین کے برابر ہے۔

عبادت خواہ کیسی ہو اس کے کرنے سے انسان زیادہ سے زیادہ نیک پارسا، ناجی وغیرہ بن سکتا ہے مگر متعہ ایسی عبادت ہے کہ اس کے ادا کرنے سے انسان امام اور رسولؐ کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ عبادت واقعی افضل العبادات ہے۔

اس عبادت کے متعلق چند عجیب واقعات:-

شیعہ محدث نعمت اللہ الجزائری نے اپنی مشہور کتاب انوار نعمانیہ میں اس عبادت کے متعلق کچھ سنے سنائے اور کچھ اپنے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک واقعات بیان کئے جاتے ہیں تاکہ اس عبادت کے جزئیات کی تفصیل بھی سامنے آ جائے اور اس عبادت کی تکمیل میں جو رکاوٹیں آتی ہیں ایک مومن ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا سلیقہ بھی سیکھ لے۔

وقد تمتع رجل من اصحابنا امرأة وكان ذلك الرجل فقيرا فصار القرار على درهمين	ہمارے ایک شیعہ دوست نے ایک عورت سے متعہ کیا وہ آدمی نادار تھا۔ دو درہم پر

نقريبا فجامعها تلك الليلة خمس مرات فلما اصبح طالبته بالدرهمين ولم يكن عنده شيئ فالحت عليه بحضور جماعة من المؤمنين فقالت ايها الناس انه جامعها خمس مرات ولم يعطها شيئا فقال لها يا حبابه تعالى ثم انه رفع اى جله فقال تعالى جامعني سبع مرات عوض الخمس المرات وقال الحاضرون الحق مع العالم۔

(انوار نعمانیہ ۲: ۱۶۴)

معاملہ طے ہوا رات کو اس نے عورت کے ساتھ پانچ بار مباشرت کی صبح کو عورت نے دو درہم کا مطالبہ کیا مگر اس کے پاس کچھ نہیں تھا عورت نے لوگوں کے سامنے پُر زور مطالبہ کیا اور برملا کہا کہ اس نے رات کو پانچ بار مجھ سے مباشرت کی اور اب کچھ نہیں دیتا۔ مرد نے کہا اے خاتون! ادھر آجا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں اوپر اٹھائیں (برہنہ ہوکر) اور کہا پانچ کے بدلے سات بار مجھ سے جماع کرلے۔ حاضرین کہنے لگے۔ یہ عالم مرد سچا ہے۔ (اور عورت جھوٹی ہے)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ۔

(۱) متعہ کرنے والا صرف نادار ہی نہیں تھا شیعہ عالم تھا۔

(۲) اس نے تہیدست ہونے کے باوجود دو درہم دینے کا اقرار کرلیا یعنی متعہ میں تقیہ کو بھی شامل کرکے عبادت کو دو آتشہ بنا دیا۔

(۳) عورت کو اجرت دینے کی بجائے اس کو دعوت دی کہ پانچ کے بدلے سات بار اس سے جماع کرلے۔

(۴) شیعہ حاضرین کے نزدیک مرد کا عورت سے جماع کرنا اور عورت کا مرد سے جماع کرنا دو مختلف چیزیں ہیں لہٰذا ان کی رگ انصاف پھڑکی اور فیصلہ سنایا کہ عالم سچا ہے۔

(۵) بھرے مجمع میں عالم کا ننگا ہوکر ٹانگیں بلند کرنا گویا شان علم کا اظہار ہے۔

(۶) عورت نے رات بھر کی کارروائی تفصیل سے سنادی۔ جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ

سرانجام دیا۔

(۷) مجتہد الجزائری کا یہ واقعہ اس تفصیل سے بیان کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس عبادت کی تشہیر کرنا بھی گویا ترغیب دلانے کی ایک تدبیر ہے۔

(۸) دو درہم کی حقیری رقم کے وعدہ کے بدلے بھی یہ عبادت ادا کی جاسکتی ہے جنت کتنی سستی کردی۔

۲۔ محدث صاحب اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔

وتمتع رجل من اصحابنا امرأة فى شيراز واعطاها محمدية۔ وكان الوقت حارا فصعدنا السطح واما هو فغلق باب الحجرة عليه وبقى مع المرأة۔ فلما قرب نصف الليل فاذا صوت المرأة قد ارتفع وهى تقول هلموا الى فقد قطع فرجها فنزلنا اليها فاتيت اليها وقلت لها ماجرى عليك فقالت ان الليل لم ينتصف وانه قارب عشرين مرة وما صرت اطيق فهذه المحمدية ياخذها ويعطيني من بقية الليل فقلت له يا فلان ما تقول فى كلامها هذا فقال انها

شیراز میں ہمارے ایک شیعہ دوست نے متعہ کیا اور عورت کو ایک محمدیہ (سکہ) دیا۔ گرمی کا موسم تھا ہم مکان کی چھت پر سوگئے۔ اس دوست نے .... عورت کو اندر لے جاکر کمرے کا دروازہ بند کردیا نصف شب کے قریب عورت نے چلانا شروع کردیا کہنے لگی لوگو پہنچو اس نے میری شرمگاہ پھاڑ دی۔ ہم چھت سے نیچے آئے میں نے عورت سے پوچھا کیا گزری۔ کہنے لگی رات ابھی آدھی نہیں گزری اور یہ میرے ساتھ بیس مرتبہ مباشرت کرچکا ہے اب میری طاقت جواب دے گئی ہے مرد اب مجھ سے محمدیہ واپس لے لے اور باقی رات کے لیے مجھے معاف رکھے۔ میں نے مرد سے پوچھا آپ کیا کہتے ہیں۔ وہ کہنے لگا عورت جھوٹی ہے میں ۲۰ تک نہیں پہنچا پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر

كذابة وما بلغت عشرين
فلزمني من يدي وقال
تعالى فاتيت معه فادخلني الحجرة فاذا
هو قد خط المرات خطوطا في الجدار فعددتها
فاذا هي ثمان عشر مرات فقال انظر
كيف كذبت علي فقلت له يا
فلان اقسم عليك بالله ما كان في نظرك
الشريف الى وقت الصباح من
مرات قال والله في خاطري
اربعين مرات ليكون بازاء كل
غازي مرة ثم ان المرأة اعطت
المحمدية وانصرفت نصف الليل
(ایضا ۲: ۱۶۴م)

لے گئی میں نے دیکھا کہ اس نے دیوار پر لکیریں کھینچ رکھی ہیں میں نے شمار کیا تو وہ ۱۸ خطوط تھے کہنے لگے دیکھو اس عورت نے مجھ پر کیسا بہتان لگایا ہے میں نے اس سے کہا اللہ کی قسم کھا کر بتائیے کہ آپ کے خیال مبارک میں صبح تک کتنی مرتبہ مباشرت کرنے کا ارادہ تھا۔ اس نے کہا اللہ کی قسم میرا ارادہ ۴۰ مرتبہ مباشرت کرنے کا تھا تاکہ ہر غازی (سکہ) کے بدلے ایک بار ہو جائے (ایک محمدیہ کے ۴۰ غازی بنتے ہیں) پھر اس عورت نے محمدیہ واپس کر دیا اور اس مرد سے جان چھڑالی۔

ظاہر ہے کہ:۔

(۱) یہ محدث الجزائری کا چشم دید واقعہ ہے۔ آپ نے معاملہ نمٹانے میں ذاتی طور پر حصہ بھی لیا۔

(۲) یہ شریفانہ کاروبار کوئی برائی نہیں بلکہ عبادت ہے البتہ عورت نے اس میں جھوٹ کی آمیزش کر کے اس کے تقدس کو نقصان پہنچایا اور نتیجہ بھی دیکھ لیا کہ بقیہ رات ثواب سے محروم ہو گئی۔

(۳) محدث صاحب کا متمتع سے خطاب کہ ما کان فی نظرک الشریف ظاہر کرتا ہے کہ ان کے دل میں اس عبادت گذار کیلئے عقیدت اور عظمت کس پائے کی تھی۔

(۴) دو درہم یا ایک محمدیہ پر معاملہ طے ہو جانا بتاتا ہے کہ جانبین کے پیش نظر اصل چیز ثواب حاصل کرنا یا امامت کے درجے تک پہنچنا ہوتا ہے یہ رقم تو محض تبرک کے

طور پر لی دی جاتی ہے۔

(۵) دیکھا گیا ہے کہ اس عبادت میں مومنہ عورتیں زیادہ ایثار پیشہ واقع ہوئی ہیں یا حصول ثواب میں زیادہ حریص ثابت ہوئی ہیں۔ طے شدہ رقم بھی وصول نہیں کرتیں۔

۴۔ محدث الجزائری اصفہان کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

وقد اراد بعض المؤمنين ان يتمتع في
اصفهان فقالت له عجوز دلالة انا
اهديك على امرأة جميلة فاخذته
الى بيت امرأة فرأى امرأة تحت
الاستار والحجب فظن بها
القبول وقد كان اعطها الدراهم
للعجوز وانصرفت فلما خلى
معها ورفعت الحجب نظر
الى وجهها واذا انها من العمر ما تجاوز
التسعين ولا تتكلم الا بالدلالة ادرى
لعدم الاسنان ففكر في نفسه فانتهى
فكره الى ان قال لها يا حبابة نريد
شيئا من الدهن فقامت واحضرته
عنده فكشف راسه ودهن دهنا جيدا
فقال لها قومي على اسم الله تعالى حتى
اقضي الحاجة فنامت فقدم راسه
فقالت ما تصنع فقال قاعدة
في بلادنا ان يأتون النساء برؤسهم فقال انظري
كيف يكون فقال من تحته وقالت هذه

اصفہان میں ہمارے مومن شیعہ نے متعہ کرنا چاہا ایک بوڑھی دلالہ نے اسے کہا کہ میں تجھے ایک خوبصورت عورت پیش کرتی ہوں چنانچہ ایک عورت کے گھر لے گئی اس نے ایک پردہ نشین عورت دیکھی بڑھیا کو رقم دی اور چلتا کیا جب عورت نے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی عمر ۹۰ برس سے متجاوز ہو گی منہ میں دانت مطلق نہیں۔ سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا مجھے تیل چاہیے وہ اٹھی اور تیل لے آئی مرد نے اپنے سر پر خوب تیل ملا۔ اور عورت سے کہا اللہ کا نام لے کر لیٹ جا تاکہ میں اپنا کام کر لوں وہ لیٹ گئی مرد نے اپنا سر آگے بڑھایا وہ کہنے لگی کیا کرنا چاہتے ہو۔ مرد نے کہا کہ ہمارے ملک میں یہی رواج کہ عورتوں سے مقاربت سر سے کرتے ہیں کہنے لگی اللہ تمہارے ملک کو تباہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہنے لگا تو ابھی دیکھ لے گی کیسے ہوتا ہے۔ نیچے سے

دراهك خذلا بارك الله فيها فلم
يقبل حتى ضاعفت له الدراهم
اضعافا كثيرة بالتماس كثير
حتى اخذها وخرج منها
(ايضاً ص ۱۶۳)

ہی تو ہونا ہے۔ کہنے لگی اپنی رقم واپس لے
اللہ نہیں اس رقم میں برکت نہ دے مرد نے
انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ اس عورت نے اپنی طرف سے
کثیر رقم ملا کر بڑی منت سماجت کی تب
مرد نے قبول کیا اور وہاں سے چلا گیا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ:-

(۱) مؤمنین کیلئے متعہ کا کاروبار عام تھا اور ہر شہر میں اس عبادت کیلئے رہنمائی کرنے کا فریضہ بوڑھی عورتوں نے سنبھال رکھا تھا جو اپنے منصب کے عین مطابق دلالہ کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔

(۲) دلالہ نے تقبر کیا۔ وعدہ کیا حسین و جمیل عورت کا اور پیش کی بوڑھی کھوسٹ۔

(۳) اس عبادت کے شروع کرتے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے تاکہ بابرکت ثابت ہو۔

(۴) شیعہ عورتیں اس عبادت پر اتنی حریص ہوتی ہیں کہ ۹۰ برس کی عمر میں بھی شوق باقی رہتا ہے کیوں نہ ہو عمر بھر کی مشق کی وجہ سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۵) عورت نے نادانی سے مرد کو عملاً عبادت کرنے کا موقع نہ دیا مگر اسے مالی فائدہ تو نقد ہو گیا اور اخروی ثواب اس کے نیک ارادہ پر ہی شاید مل گیا ہوگا۔

۴۔ اسی صفحہ پر اسی قسم کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔

وواحد اخر ايضا قد جرت عليه مثل
هذه المقدمة فلما خلى بها فراها تزيد
على عجوز بني اسرائيل في العمر قام
واخذ ابريقا الى الكنيف واخذ
لفافة عمامته وعصب بها
ذكره حتى صار كالجلدون الصغير
فاقبل اليها وهو يترجع بأن

ایک اور آدمی کے ساتھ یہی حالت پیش
آئی جب تخلیہ میں ممنوعہ کو دیکھا تو عمر میں
بنی اسرائیل کے زمانہ کی عورت معلوم ہوئی
اٹھا۔ کوزہ لیا اور خلوت خانہ میں چلا گیا
اپنی پگڑی کو اپنی شرمگاہ پر لپیٹ کر
باہر آیا اور عورت کی طرف متوجہ ہوا اس
حالت میں کہ وہ کراہ رہا تھا جب برہنہ ہوا

فانكشف لها فقالت ماهذه العصابة
على ذكرك فقال ان معي داء البثل
والطبيب امرني بان انمتع بامرأة
عجوزة والغظ بسم هذا الوجه اي
في فرجها حتى ابرأ فصاحت من هذا
الكلام وقالت خذ دراهمك لا
بارك الله لك فيها فقال هيهات
هيهات لا اقبل هذا ابدا حتى زادت على ما
اعطها زيادة وافرة فاخذها ومضى۔

تو عورت نے کہا یہ کیا پٹی باندھ رکھی ہے
اس نے کہا میں مرض بثل کا مریض ہوں
طبیب نے کہا ہے کہ کسی بوڑھی عورت سے
متعہ کروں اور یہ زہریلا مادہ اس کے رحم میں
داخل کر کے شفا پاؤں۔ عورت چیخ اٹھی کہنے
لگی اپنی رقم لے اللہ تجھے اس میں برکت
نہ دے کہنے لگا ہرگز نہیں۔ عورت نے کثیر
رقم اپنے پاس سے ملا کر پیش کی تب مرد
نے قبول کی اور اپنی راہ لی۔

مومن متاعی کو بڑا حاضر دماغ ہونا چاہیے کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو اس قسم کی کوئی ترکیب سوچ لے کہ عبادت کا موقع نہ مل سکے تو کم از کم مالی نقصان تو نہ ہو۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومنین بالعموم بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔ اصل مع سود لیے بغیر نہیں ٹلتے اور مومنات ایسی بھولی بھالی ہوتی ہیں کہ عبادت کے ثواب سے بھی محروم ہو جاتی ہیں اور پلے سے رقم دیکر مومنوں کو بھی محروم کر دیتی ہیں۔

۵۔ محدث صاحب شیراز کا واقعہ بیان کرتے ہیں جو ان کے ایک ہم مکتب ساتھی کو پیش آیا۔

ان رجلا من الاخوان تمتع ايضا في
شيراز وكان معنا في مدرسة
المنصورية قال فلما تكشفت لي و
استلقت على قفاها نظرت الى
ذالك الموضع واذا هي غلفا لو تختتن
فعمدت الى سكين صغير ذا نيت
بها واختنتها فصاحت وجرى

ہمارے ایک شیعہ بھائی نے شیراز میں
متعہ کیا۔ وہ ہمارے ساتھ مدرسہ منصوریہ
میں پڑھتا تھا اس نے کہا جب وہ عورت
برہنہ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ ختنہ شدہ
نہ تھی میں نے ایک چاقو لیا اور اس کا
ختنہ کر دیا۔ وہ چلائی اس کا خون بہنے لگا۔
اس نے اٹھ کر مجھ سے زخمی کرنے کی دیت

الدم فلما قامت طالبتنی بالجراحۃ فطالبتھا بکر دالختان وغلبتھا واخذت منھا القیمۃ ولکن لامن جنس الدراھم والدنانیر۔ (ایضا ص ۴۲۲)

طلب کی میں نے اس سے اجرت طلب کی آخر میں غالب آگیا اور اس سے اجرت وصول کرلی مگر وہ درہم و دینار کی صورت میں نہیں تھی۔

اس روایت سے بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

(۱) شیعہ مؤمنین زمانہ طالبعلمی سے ہی یہ عبادت شروع کردیتے ہیں۔ قدرتی طور پر انہیں ائمہ کے درجے تک پہنچنے کا شوق زیادہ ہی ہونا چاہیے۔

(۲) علم کے ساتھ فن بھی سیکھتے ہیں جیسے اس طالبعلم نے مدرسہ منصوریہ میں صرف علم کے حصول پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ ختنہ کرنے کا فن بھی سیکھ لیا تھا۔ یا ممکن ہے پہلے ہی موروثی طور پر یہ فن جانتا ہو پھر علم کا شوق چرایا ہو۔

(۳) متعہ کی عبادت شروع کرنے سے پہلے مقام عبادت کا معائنہ کرنا بھی شاید ضروری ہوتا ہے کیونکہ عبادت کیلئے طہارت شرط ہے۔

(۴) طالب علم نے ختنہ تو کردیا لیکن عورت بھی فن کار تھی دیت طلب کرلی۔ ادھر طالبعلم تھا باقاعدہ مناظرہ شروع ہوگیا۔ آخر جیت علم کی ہوئی۔ اور طالبعلم نے اجرت وصول کرلی مگر علمی زبان میں بتادیا کہ کس شکل میں وصول کی۔ واقعی علم کی بات ہی اور ہے گذشتہ دو روایتوں میں بتایا گیا ہے مومنین عبادت سے محروم رہے البتہ دولت پیدا کرلی مگر طالب علم نے عبادت بھی کرلی اور پیسے بھی بٹور لیے کیا مدرسہ منصوریہ کا اتنا فیض بھی نہ ہوتا۔

۶۔ ایضا ص ۴۲۳

ان واحدا من اخواننا الصالحین تمتع امرأۃ فی شیراز فلما غلق علیھا الابواب ونظر الی وجھھا فاذا ھی کالشن البالی ولیس لھا الاسنان فی فمھا فتکلم فیھا قال فتحصنت عینی وقبضت علی انفی واصبت منھا مرۃ فلما فرغت اردت فتح الباب فقالت لا تفتح ودعنا الیوم فی عیشنا وان لو ترد من القبل فھذا غیرہ حاضر فعرفت الموت فی المواقعۃ الاخری فصحت الی اصحابی ھلموا الیّ وخلصونی من یدی الموت فاتوا الی ففتحوا الباب واخرجونی منھا

ہمارے ایک صالح بھائی نے شیراز میں ایک عورت سے متعہ کیا جب دروازہ بند کیا تو عورت کے چہرہ پر نظر پڑی۔ اچانک وہ اسے پرانی بوسیدہ مشک کی مانند نظر آئی منہ میں دانت ندارد۔ بات پوری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں ناک پر ہاتھ رکھا اور ایک بار اس سے مجامعت کرلی جب فارغ ہوا تو باہر نکلنے کا ارادہ کیا کہنے لگی دروازہ مت کھول آج کی رات تو عیش میں گذرنے دے اگر تجھے اس راستے سے مجامعت کرنا پسند نہیں تو دوسرا راستہ حاضر ہے مجھے خلاف وضع فطرت میں موت نظر آئی میں چلا کر باہر دوستوں کو آواز دی کہ مجھے موت کے منہ سے نکالو۔ وہ آئے دروازہ کھولا اور مجھے باہر نکالا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ:

(۱) ایک صالح بھائی کا ذکر ہو رہا ہے واقعی بدکاروں کو کہاں ایسی عظیم عبادت کی توفیق مل سکتی ہے۔

(۲) عورت کی صورت سے نفرت کے باوجود آنکھ بند کرکے ناک پر ہاتھ رکھ کے یا یوں کہئے کہ دل تھام کر ایک سجدہ کر ہی لیا۔

(۳) متوعہ جو فنا فی العبادت تھی ایثار کرکے دوسرا راستہ پیش کردیا اور رات عیش میں بسر کرنے کی التجا بھی کی واقعی صالحین کو عبادت میں ہی عیش محسوس ہوتی ہے۔

(۴) اس روایت میں دینے دلانے کا ذکر نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مفت میں جنت کے حصول کی کوشش کی گئی۔

(۵) صالح بھائی بڑا کم حوصلہ ثابت ہوا کہ بار دگر ... سے موت نظر آنے لگی۔

اس عبادت کی ایک مفید اور عوامی قسم

یوں متعہ کی اصطلاح اپنے اندر کشش کا پورا جہان لیے ہوئے ہے مگر اسکی ایک افضل تر قسم کیلئے ایک اور اصطلاح بھی ہے اسے متعہ دوریہ کہتے ہیں یعنی بہت سے مرد چندہ جمع کرکے ایک عورت کو دیں اور ایک ہی رات تمام صالحین اس ایک عورت سے باری باری مجامعت کریں۔ مردوں کا مالی بوجھ کم ہوا اور عورت کا ثواب کئی گنا بڑھ گیا۔

علامہ نور اللہ شوستری پر متعہ دوریہ کے متعلق کسی کم عقل نے اعتراض داغ دیا تو آپ نے اپنی مشہور کتاب مصائب النواصب میں بڑا معقول جواب دیا فرماتے ہیں۔

واما ناسعا فلان ما نسبه الی اصحابنا من انهم جوزوا ان یتمتع الرجال المتعددون لیلة واحدة من امرأة سواء کانت من ذوات الاقراء ام لا۔ فها خان فی بعض قیوده ذلك لان الاصحاب قد خصوا ذلك بالآئسة لا بما یعم بالآئسة وغیرها من ذوات الاقراء۔

نواں اعتراض جو معترض نے کیا ہے کہ ہمارے شیعوں کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے بہت سے مردوں کا ایک عورت سے ایک رات میں متعہ کرنا جائز کہا ہے خواہ اس عورت کو حیض آتا ہو یا نہ آتا ہو تو اس سلسلے میں معترض نے بعض قیود میں خیانت کی ہے (جو شیعہ متعہ دوریہ میں لگاتے ہیں) ہمارے اصحاب شیعہ نے متعہ دوریہ اس عورت کے ساتھ مختص کیا ہے جسے حیض نہ آتا ہے۔ یہ عمل عام نہیں ہے کہ ہر عورت کے ساتھ کیا جائے خواہ وہ آئسہ ہو یا غیر آئسہ۔

واقعی بعض معترض بھی عجیب نامعقول قسم کے ہوتے ہیں۔ بات سمجھتے نہیں اور آنکھیں بند کرکے اعتراض داغ دیتے ہیں۔ علامہ نے بات واضح کر دی کہ متعہ دوریہ میں یہ شرط ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عورت ایسی ہو کہ حیض آنے کی حد سے گزر چکی ہو۔ اگر کسی غیر آئسہ سے یہ حرکت کی گئی تو عبادت مقبول نہ ہوگی اس لیے صلحاء کا یہ فرض ہے کہ عبادت کرتے وقت

تمام شرائط کا لحاظ رکھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ عبادت مردود قرار پائے اور رات بھر کی محنت رائیگاں جائے۔ جب اصحاب شیعہ نے اس عبادت کیلئے آئسہ کو مختص کر دیا تو اعتراض چہ معنی؟ معلوم ہوتا ہے ثواب کے اعتبار سے عام متعہ اور متعہ دوریہ میں وہی فرق ہے جو انفرادی عبادت اور اجتماعی عبادت میں ہوتا ہے۔ جماعت کی برکات کا کون انکار کر سکتا ہے۔

مناقب شہر ابن آشوب ۴ : ۸۳

امام جعفر سے روایت ہے قال ما من عبد یشرب الماء فذکر الحسین ولعن قاتله الا کتب الله له مائة الف حسنة ورفع له مائة الف درجة وکان کانما اعتق مائة الف رقبة ومحی مائة الف سيئة۔

یہ ایسے بدیہی حقائق ہیں جن کے معلوم کرنے کے لیے کسی گہری سوچ کی ضرورت نہیں ہاں چشم بینا ہو تو اس کا مشاہدہ اتنا عام ہے کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ دین میں ایمان کے بعد عبادات منصوصہ کا ذکر آتا ہے۔ اس لیے کوئی عبادت منصوصہ ایسی نہیں جس کا ثبوت نص صریح میں موجود نہ ہو۔ چونکہ ماتم کی عبادت اتنی اہمیت کی حامل ہے اس لیے اس کا ثبوت نص صریح میں موجود ہوگا۔ اگر عبارۃ النص سے نہ ہو تو دلالۃ النص، اشارۃ النص یا اقتضاء النص سے ضرور مل جانا چاہیے۔ مگر یہاں تک قرآن و سنت کا تعلق ہے جزع فزع کے برعکس صبر و ثبات کی تاکید ملتی ہے جس کا ثبوت آئندہ اوراق میں پیش کیا جائے گا رہا ائمہ کے اقوال یا تعامل کا تعلق تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ پھر اس عبادت کا ماخذ اور اس کی اصل کیا ہے؟
اس سوال کا جواب ہمیں کتب شیعہ سے ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ ملتا ہے۔ اور اس کی بنیاد بھی عامیانہ تعامل ہے کوئی علمی یا نظری ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ اس ترتیب کی تفصیل سے پہلے یہ تاریخی حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ اس عبادت کا سراغ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد ہی ملتا ہے اس لیے ہم شیعہ کتب سے اس شہادت کے متعلق چند حقائق پیش کرتے ہیں۔

حضرت امام کے قاتل کون تھے؟ اس سوال کے جواب سے کئی عقدے حل ہو جائیں گے اس لیے ہم کیوں نہ اہل بیت سے ہی پوچھیں کہ آپ کا قاتل کون ہے؟

(۱) کشف الغمہ ۲ : ۲۳۱ مطبع تبریز طبع جدید۔

حضرت حسینؓ نے میدان جنگ میں اہل کوفہ کو ایک خطاب کیا۔

تقدم علی فرسه الی القوم حتی واجههم | امام حسینؓ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قوم کی

باب

ماتم حسینؓ

اعمال صالحہ کی فہرست میں شیعہ حضرات کے ہاں ماتم کو جو مقام اور اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

(۱) اس عمل کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ مثلاً اجتماعی شکل ہو، سیاہ لباس ہو خواہ سادہ ہو یا عمدہ اور قیمتی کپڑے سے تیار کیا جائے۔

(۲) خاص وضع اختیار کی جائے ننگے پاؤں، ننگے سر، پریشان بال اور کبھی یہاں تک کہ چہرے اور سر پر راکھ یا مٹی ڈالی ہوئی ہو۔

(۳) خاص راگ اور راگنیوں میں نوحے ڈوہرے بین نالہ و شیون ہو۔

(۴) سینہ کوبی ہو مگر پوری ہم آہنگی کے ساتھ خاص تال پر اور کبھی ڈھول کی چوب کے ساتھ ساتھ۔

(۵) خواہ کسی تقریب پہ کوئی مجلس پڑھی جائے اس میں ماتم کا حصہ ضرور شامل ہو۔

(۶) گھوم کر جلوس کی شکل میں ہو اور اس کی خوب تشہیر ہو۔

(۷) اس اہتمام میں کوئی رکاوٹ ہو تو مرنے مارنے کی نوبت آ جائے مقدمہ بازی ہو لڑائی ہو کچھ ہو اس عبادت میں کوئی حائل نہ ہو۔

(۸) اس عبادت میں کچھ لوگ اس درجے تک پہنچے ہوئے ہوں کہ وہ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہوں۔ جن کی معیت میں یہ عبادت کی جائے۔ ایسے پیشہ ور فن کار رضاکارانہ طور پر شامل ہوں یا انہیں معاوضہ دے کر شامل کیا جائے بہر صورت ان کی معیت اور رہنمائی اس عبادت میں خاص کیفیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

(۹) اس اجتماعی شکل میں عورت مرد کی تمیز ضروری نہیں۔ اسی بنا پر شیعہ کے نزدیک ماتم کی بڑی اہمیت ہے۔

وقال لهم يا اهل الكوفة تبا لكم وتعسا حين استصرختمونا والهين فاتيناكم موجفين فشحذتم علينا سيفا۔

طرف بڑھے، اور بالمواجہ کلام کی اور فرمایا اے اہل کوفہ پھٹکار اور ہلاکت ہو تم پر۔ تم نے محبت کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں مدد کے لیے بلایا اور ہم بڑی سرعت سے تمہاری مدد کو پہنچے مگر تم نے ہم پر تلوار کھینچی۔

امام کے اس خطاب سے ظاہر ہے کہ

(۱) اہل کوفہ نے امام سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے امام کو دعوت دی کہ ہماری مدد کو آئیں۔

(۲) ان بلانے والوں نے ہی امام پر تلوار اٹھائی۔

(۲) منتہی آلامال ص۳۳

فرمان امام حسین ورائے شما در نامہائے بمن نوشتہ آید برگشتہ است با کے نیست برمی گردم کہ بیاورد آں خرجیں را کہ نامہ ہا در آں است۔ پس خرجیں کہ مملو از نامہ کوفیاں آورد و آنرا بیروں ریخت۔

(۳) اس اجمال کی مزید تفصیل جلاء العیون ص۳۳ پر لکھا ہے کہ

"اہل کوفہ نے امام حسین کو ۱۲ ہزار خطوط لکھے"

خلاصہ یہ کہ اہل کوفہ نے امام کو بلایا ۱۲ ہزار خطوط لکھے اور انہی بلانے والوں نے امام پر تلوار اٹھائی۔

(۴) منتہی آلامال۔ سید عباس قمی طبع جدید سازمان چاپ و انتشارات جاویدانی۔

بدانید کہ منم علی بن حسین بن علی بن ابی طالب پسر آنکس کہ او را در کنار فرات ذبح کردند بے آنکہ از و خون طلب داشتہ باشند منم پسر آنکہ ہتک حرمت او نمودند و مالش را بغارت بردند و عیالش را اسیر کردند۔ منم فرزند او کہ او را بقتل صبر کشتند ہمیں فخر مرا کافی است۔

اے مردم سوگند دہم شما را بخدا آیا فراموش کردید شما کہ نامہائے بہ پدرم نوشتید چوں مسالمت شما را اجابت کرد از در خدعت بیروں شدید۔ آیا یا د نمی آورید کہ با پدرم عہد و پیمان بستید و دست بیعت فرا دادید آنگاہ او را کشتید و مخذول داشتید پس ہلاکت باد شما را برائے آنچہ برائے خود با آخرت فرستادید چہ زشت است رائے کہ برائے خود پسند یدید ص۲۱۲

یعنی بقول شیعہ معصوم ابن معصوم اہل کوفہ کی فرد جرم بیان کر رہے ہیں کہ تم نے میرے والد کو بلایا۔ تم نے دھوکا دیا ذلیل کیا اور قتل کیا۔

(۵) الطبرسی الاحتجاج طبع جدید طہران ۱ : ۳۱۵

زینب فرمود اے اہل ظلم و جور اے اہل مکر و حیلہ اے اہل کوفہ ہمانا عہد خویش را شکستید و آنچہ وعدہ دادہ خلف کردید چہ بحضرت برادرم نامہائے پے در پے نوشتید و او را باین ولایت آوردید۔ و چوں بیاوردید از نصرت و یاری برادرم بازگشتہ و از پیمان خود گردیدہ با دشمنان او معین شدید و اہل کذب و زنا را یاری نمودید۔

حضرت زینب کے مختصر سے بیان میں کئی حقائق موجود ہیں۔

(۱) اہل کوفہ نے امام کے ساتھ ظلم ہی نہیں کیا بلکہ مکر و فریب اور عہد شکنی بھی کی۔

(۲) پے در پے دعوتی خطوط بھیجے۔

(۳) امام جب آئے تو صرف یہ نہیں کہ نقض عہد کر کے امام کی مدد سے دستکش ہوئے بلکہ الٹا دشمن کی مدد کی۔

(۴) دشمن بھی وہ نہیں جو امام کے مقابلے میں مدد کا مستحق ہو۔ بلکہ دشمن بھی اہل کذب و زنا۔

(۶) اسی کتاب کے ۱ : ۲۸۱ پر حضرت زینب کے طولانی خطبہ میں اس کی کچھ اور وضاحت ہوئی ہے

اما بعد یا اهل الكوفة يا اهل الختل و الغدر والخذل و المكر اتبكون فلا رقات الدمعة .... الا ساء ما قدمتم لانفسكم وساء تذرون ليوم بعثكم و بعدا لكم وسحقا و تعسا وتبت الايادي وخسرت الصفقة وبؤتم بغضب من الله وضربت عليكم الذلة والمسكنة۔

اے دھوکا باز مکار اہل کوفہ کیا تم روتے ہو .... تم نے اپنے لیے بہت برا توشہ آخرت بھیجا ہے۔ لعنت اور پھٹکار ہو تم پر

حضرت زینب کے اس خطاب سے ایک بات مزید معلوم ہوئی کہ اہل کوفہ نے مکر و غداری سے قتل بھی کیا اور پھر رونا پیٹنا بھی شروع کر دیا۔ مگر اس کے باوجود لعنت اور پھٹکار کے مستحق ہی ٹھہرے۔

(۷) ناسخ التواریخ ۱: ۳۰۱

حضرت ام کلثوم دختر علی اور زوجۂ فاروق اعظم کا خطبہ۔

وبالجملہ ام کلثوم فرمود یا اہل

الکوفہ سوءۃ لکم ما لکم خذلتم حسینا

وقتلتموہ وانتہبتم اموالہ وورثتموہ

وسبیتم نساءہ ونکبتموہ فتبا لکم

وسحقا۔ ویلکم اتدرون ای دواہ

دھتکم وای وزر علی ظہورکم۔ ۔ ۔ ۔

وای اموال انتہبتموہا قتلتم خیر رجالات

بعد النبی ونزعت الرحمۃ من قلوبکم الا

ان حزب اللہ ہم الفائزون وحزب الشیطان ہم الخاسرون۔

می فرماید اے مردم کوفہ بدا بر حال شما چہ افتاد شما را کہ حسین را خوار ساختید و مخذول و بے یار و بے یاور گزاشتید و او را بکشتید و اموالش را بغارت بر دید و چوں میراث خویش قسمت ساختید۔

حضرت ام کلثوم کے بیان سے اہل کوفہ کے مکر و فریب اور ظلم و جور کے علاوہ اہل کوفہ سے یہ شکایت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے قتل حسینؓ کے بعد اہل بیت کا مال بھی لوٹا اور میراث سمجھ کر آپس میں تقسیم کیا۔

ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہوگیا کہ اہل کوفہ شیعوں نے امام حسینؓ کو خطوط لکھ کر بلایا۔ جب آئے تو مکر و فریب سے ساتھ چھوڑ دیا ستم بالائے ستم یہ کہ دشمن کے ساتھ مل کر امام کو قتل کیا اسی پر بھی نہیں پھر اہل بیت کے اموال لوٹے اور میراث سمجھ کر آپس میں

تقسیم کئے۔

حضرت زینب کے خطبہ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس پر حضرت زینب نے یہ دعا دی۔

(۸) ناسخ التواریخ ص ۲۹۷

اے اہل عذر و فریب و حیلت و خدیعت از کمال غداری و مکاری وعدۂ نصرت و دیاری دہید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہرگز چشم شما خشک مباد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آنکس را کہ باصرار و نگارش آں جملہ مکاتیب بدیار خویش بیاوردید۔ تیغ بروے برکشیدید و یاد شمنش یار شدید و او را تنہا گذاشتہ تا بقتل درآمد تا آنکہ بایں روزگار درآوردید بر ما گریستن گیرید۔ ہرگز چشم شما خشک مباد و سینۂ شما از آتش غم و اندوہ و نالہ آسودہ مباد۔

(۹) ایضاً ص ۳۰۲

راوی گوید چوں اہل کوفہ ایں کلمات را بشنیدند الخ۔ یکدفعہ صدا بار ابگریہ بلند شد و ہمی بگریستند و نوحہ و سوگواری نمودند و موہہا پریشان کردند و خاک بر سر ریختند و صورتہا بخراشیدند و طاچہ بر سر و رو بزدند۔

فلم یُرباک و باکیۃ اکثر من ہذا الیوم۔

حضرت زینب کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ

(۱) شہادت حسین کے بعد رونا پیٹنا قاتلین حسین نے شروع کیا۔

(۲) نوحہ کرنا۔ بال پریشان کرنا۔ سر پر خاک ڈالنا۔ منہ نوچنا۔ اور چہرے اور سر پر چپڑ مارنا۔ قاتلین حسینؓ نے شروع کیا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ماتم کرنا گو فرض نہیں مگر سنت تو ضرور ہے ہاں قاتلین حسین کی سنت ہے۔

(۳) حضرت زینب نے اس فعل کو ناپسند کرتے ہوئے بددعا دی کہ تمہارے آنسو خشک نہ ہونے پائیں ہمیشہ روتے ہی رہو اور تمہارا سینہ آتش غم سے جلتا ہی رہے۔

تو معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے ماتم اور سینہ کوبی کا شغل اختیار کیا انہوں نے قاتلین حسینؑ کی سنت کو زندہ رکھنے کا فرض ادا کیا۔ اور حضرت زینب کی بددعا کا یہ اثر ہے کہ قاتلین حسینؑ کی یہ سنت ان کے پیروؤں نے زندہ رکھی ہوئی ہے۔

(۹) جن تفاصیل اور شرائط سے قاتلین حسینؑ نے ماتم کیا ان تمام جزئیات کو بھی ان لوگوں نے زندہ رکھا یعنی نوحہ، سینہ کوبی، پریشان بال اور خاک بر سر کی جزئیات کے ساتھ اتباع سنت قاتلین حسین کو اب تک سینے سے لگا رکھا ہے۔

(۱۰) ایضاً ص۳۰۰ ام کلثوم کا ایک اور بیان۔

وبالجملہ زنان کوفیاں بر ایشاں زار زاری گریستند جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا سر از محمل بیروں کردہ باآں جماعت فرمود۔

یا اھل الکوفۃ تقتلنا رجالکم وتبکینا نساءکم فالحاکم بیننا وبینکم اللہ یوم فصل القضا۔	اے اہل کوفہ تمہارے مردوں نے ہمیں قتل کیا اور تمہاری عورتیں ہم پر روتی ہیں اچھا! اللہ تعالیٰ ہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلے کے دن فیصلہ کرے گا۔

حضرت ام کلثوم کے بیان سے معلوم ہوا کہ آپ نے اہل کوفہ کے رویہ پر تعجب کیا کہ شاید انہوں نے تقسیم کار کا اصول اپنا رکھا ہے۔ کہ مردوں کا کام گھر بلا کر قتل کرنا اور عورتوں کا کام اظہار غم یا اظہار ندامت کے لیے رونا پیٹنا ہے۔ مگر یہ تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ڈرامہ ہو رہا ہو اور مختلف ایکٹر اپنی اپنی پسند کی ایکٹنگ کر رہے ہوں۔

مگر اس سنت کی پیروی کی موجودہ شکل گویا تلافیٔ مافات ہے کہ اب مرد اور عورتیں دونوں ایک ہی کام یعنی نوحہ وزاری میں لگے ہیں۔ جب مردوں کو قتل کرنے کیلئے ایسے لوگ نہ ملیں تو بیچارے کیا کریں عورتوں کا کام ہی سنبھال لیا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۳۱۰ پر بھی ام کلثوم کا اس سے ملتا جلتا بیان موجود ہے۔

(۱۱) اسی کتاب کے ص۳۱۱ پر

بروایت ریاض الاحزان دیعضے دیگر چوں نالۂ اہل کوفہ بنالہ ونحیب برخاست ام کلثوم فرمود۔

تقتلنا رجالکم وتبکینا نساءکم لقد تعدیتم علینا عدوانا عظیما لقد تعدیتم علینا عدوانا عظیما لقد جئتم شیئا ادا تکاد السموات یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھدا۔

روایت کنند ابو حدیلہ اسدی در سال شہادت حسینؑ در کوفہ بودم ناگہاں زنہائے کوفہ را گریباں ہائے چاک وموئے پریشاں و لطمہ بر چہرہ زناں نگراں شدم دریں حال شیخے کہن سال روئے بمن آورد۔ پرسیدم سبب ایں گریستن ونالیدن چیست۔ گفت بعلت دیدار سر مبارک حسینؑ است۔

کوفہ کی عورتوں کو گریبان چاک کئے ہوئے روتے پیٹتے ہوئے دیکھ کر ابو حدیلہ اسدی کو تعجب ہوا کہ یہ عورتیں کیوں یہ منظر پیش کر رہی ہیں اس کی وجہ پوچھنے پر بتایا گیا کہ انہیں حضرت حسین کا سر مبارک دیکھ کر رونا آیا۔

مگر سوال یہ ہے کہ جب ان کے مردوں کو حسینؑ کا سر تن سے جدا کرتے ہوئے ترس نہ آیا تو ان عورتوں کے دلوں میں غم کے جذبات کیسے ابھر آئے۔ بات تو وہی ہوئی ع

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

قاتلین حسین کون تھے؟ یہ بحث امامت کے باب میں تفصیل سے گذر چکی ہے اور ثابت کیا جا چکا ہے کہ

(۱) معصومین مدعیوں کے بیانات سے واضح ہو گیا کہ امام کو کوفہ بلانے والے، امام کے آنے کے بعد اس کی مخالفت کرنے والے امام پر پانی بند کرنے والے، بیدردی سے گرم ریت پر لٹا کر ذبح کرنے والے۔ خاندان نبوت کے خیموں کو لوٹنے والے، یہ مال غنیمت آپس میں تقسیم کرنے والے اور اس کے بعد رو پیٹ کر طمانچہ زنی اور خاک ریائی کر کے ڈرامائی انداز میں اظہار غم کرنے والے سب شیعہ تھے۔ ان مدعیان کے بیانات کے بعد مدعا علیہم کا اقرار جرم پیش کر دیا گیا جو نور اللہ شوستری شہید ثالث کی معتبر کتاب مجالس المؤمنین جلد دوم مجلس ہشتم میں موجود ہے۔

یہاں اس کا ضروری حصہ جس کا تعلق ماتم سے ہے نئے حوالوں سے پیش کیا گیا تاکہ ثابت ہو جائے کہ ماتم کی ابتدا قاتلین حسینؓ نے کی اور ان کے اخلاف نے اس سنت کو قائم رکھنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

مذکورۃ الصدر باب میں جہاں یہ ثابت کیا گیا ہے وہاں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ شیعہ علماء نے یزید کو اس قتل سے بری الذمہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں چند مزید اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) منتہی الآمال صـ۲۴۴

روزیکہ آں سر مطہر را بمجلس یزید می بردند قاتل آنحضرتؑ سر مبارک را بر داشت و رجز می خواند کہ رکاب مرا پر از طلا و نقرہ کن پادشاہ بزرگ را کشتہ ام کہ از جہت پدر و مادر از ہمہ کس بہتر است۔ یزید گفت ہرگاہ میدانستی کہ او چنیں است چرا او را کشتی و حکم کرد کہ او را بقتل آوردند۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ یزید، امام حسینؓ کے قتل سے راضی نہیں تھا جبھی تو انعام کا مطالبہ کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

دوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ قاتل کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ دنیا کی افضل ترین ہستی ہیں ایسا عقیدت مند صرف شیعہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۲) اسی کتاب کے صـ۲۴۶ پر یزید اور اس کی بیوی کا مکالمہ درج ہے۔

جب ہندہ زوجہ یزید اہل بیت کو دیکھنے گئی غصے سے بھری واپس آئی یزید سے سخت کلامی کی تو یزید نے کہا۔

"اے ہندہ! دل مرا بدرد آوردی۔ خدائے بکشد پسر مرجانہ را کہ حسینؑ را بکشت و مرا در دو جہاں روسیاہ ساخت۔"

پھر بیوی سے کہا کہ تم ان کے پاس جاؤ۔

"و بگو کہ من نہ بکشتن او راضی بودم"

صاحب منتہی الآمال سید عباس قمی مستند شیعہ عالم نے یہ واقعہ بیان کرکے یہ ثابت

کر دیا کہ یزید نے یہ بات اپنے گھر میں اپنی بیوی سے کی کہ وہ امام حسینؑ کے قتل میں راضی نہیں تھا۔

(۳) پھر اسی کتاب کے صـ۲۴۹ پر یزید کا ایک طویل بیان درج ہے۔

"لاجرم بر قتل امام پشیمانی گرفت و خویشتن را بہ نکوہش سپرد وہمی گفت بر من چہ شدے اگر احتمال آزار کردمے و حسین را بخود در سرائے خود آوردمے و در آنچہ خواست حکومتش دادمے ہرچند در قبول مسئولش در ارکان سلطنت من وہنے فرود آمدے تا حفظ جانب رسول اللہ و رعایت حق و قرابت حسین را بجائے نہادمے خدائے پسر مرجانہ را طعن کند کہ حسینؑ را بحال اضطرار و ناچار ساخت با ایں کہ از وے خواستہ شد کہ دست خود در دست من گزارد یا بیکے از ثغور جائے کند تا بہ دیگر سرائے رو نہد پسر مرجانہ از وے نہ پذیرفت و او را بکشت و در قتل او عموم مسلمانان را بہ من بر آشفت و تخم دشمنی مرا در مزرع قلوب ایشاں بکاشت چہ جملہ جہانیاں قتل حسین را بر من عظیم شمردند مرا با بن مرجانہ چہ کار است خدا بیش ملعون و مغضوب بگرداند"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ یزید تو یہاں تک تیار تھا کہ حکومت چلی جاتی تو بہتر تھا مگر حسین کو قتل نہ کیا جاتا۔ پھر ابن مرجانہ کو ملعون اور مغضوب کہہ کر اس امر کا اظہار کر دیا کہ یزید کی نگاہ میں بدترین جرم تھا۔

(۴) پھر اسی کتاب کے صفحہ ۲۷۴ پر یزید کے وہ الفاظ درج ہیں جو اس نے اس وقت کہے جب امام کا سر لانے والا اپنی تقریر ختم کر چکا۔

"وہ چوں آں ملعون بیا آورد یزید لختے سر فرو داشت و سخن نکرد پس سر بر آورد و گفت اگر حسین را نمی کشتید من از کردار شما بہتر خوشنود می شدم و اگر من حاضر بودم حسین را معفو می داشتم و او را عرصۂ ہلاک و دمار نمی گزاشتم و گفت ابن زیاد تخم عداوت مرا در دل تمام مردم کشت"

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ یزید کی ہرگز یہ خواہش نہ تھی کہ امام حسینؓ کو قتل کیا جائے اور اس نے قاتلین حسینؓ سے جو سلوک کیا اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اس قتل سے راضی نہ تھا۔

یزید کی اس ناخوشی کے اظہار سے بڑھ کر ایک اور عمل کی نشاندہی صاحب ناسخ التواریخ نے کی ہے۔ کہ جس وقت اہل بیت رسول قید ہو کر یزید کے پاس پہنچے تو

"ہیچ کس از آل معاویہ و آل ابی سفیان بجائے نماند۔ جز انیکہ با گریہ و فریاد و نوحہ ایشاں را پذیرا کردند و ہمی بر حسینؓ ندبہ نمودند و جامہ و حلیہ از تن بیر ریختند و تا سہ روز بہ سوگواری بہ نشستند آنگاہ یزید ملعون فرمان کرد تا ایشاں را بہ سرائے خاصہ او در آوردند و زاں پس ہیچ صبح و شام بر خوان طعام نہ نشستے جز اینکہ علی ابن الحسین حاضر شدمی"

(ناسخ التواریخ صـ ۴۷)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ یزید نے صرف اظہار ناخوشی نہیں کیا بلکہ

۱ ۔ اس کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔
۲ ۔ یزید کے گھرانے میں سب لوگوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔
۳ ۔ نوحہ اور بین شروع کئے۔
۴ ۔ کپڑے پھاڑے اور زیور اتار پھینکے۔
۵ ۔ تین دن تک سوگ منایا۔

گویا اس ہیئت سے حسین کا ماتم کرنا ۔ آل یزید نے شروع کیا۔ اور ماتمی حضرات نے یزید کی اس سنت کو اس قدر پسند کیا کہ نہ صرف اس کو جوں کا توں قائم رکھا بلکہ اس میں کئی اضافے بھی کئے ہ اور اس کے حق میں دور از کار تاویلات کر کے دلائل بھی ڈھونڈ نکالے۔

ان صفحات میں ماتم کی ابتدا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے اس ہیئت کے ساتھ ماتم کرنا اول تو قاتلین حسین کی سنت ہے پھر یزید کی سنت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سنت کو قائم رکھنے والوں کو قاتلین حسین اور یزید سے کتنی محبت ہے۔

شیعہ قاتلین حسین اور یزید میں اتنی سی قدر مشترک دیکھ کے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں گروہوں کے اعمال میں سرے سے کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ اس اشتراک کے باوجود اختلاف بھی پایا جاتا ہے مثلاً

(۱) شیعہ کوفیوں نے امام کو بارہ ہزار دعوتی خطوط لکھ کر گھر بلایا۔ مگر یزید نے امام کو کوفہ آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔

(۲) شیعہ کوفیوں نے امام کا ساتھ دینے کا عہد کرنے کے بعد امام سے دشمنی کی۔ یزید نے امام سے کوئی ایسا فریب نہیں کیا۔

(۳) شیعہ کوفیوں نے امام پہ پانی بند کیا۔ امام کے خیموں کو لوٹا۔ جلاء العیون میں ہے شیعہ لوٹتے بھی تھے اور روتے بھی تھے ۔ جب اہل بیت نے کہا یہ عجیب حرکت ہے کہ لوٹتے بھی ہو اور روتے بھی ہو تو جواب دیا کہ روتے اس لیے ہیں کہ خاندان نبوت کا مال لوٹ رہے ہیں اور لوٹتے اس لیے ہیں کہ ہم نہ لوٹیں گے تو کوئی اور لوٹ لے گا۔ ناسخ التواریخ صـ ۲۴۲ پر بھی یہی بات درج ہے۔ مگر یزید نے اہل بیت کا مال نہیں لوٹا بلکہ اس نقصان کی تلافی کی۔ جیسا کہ طراز المذہب صـ ۴۷۶ میں ہے۔

۲۲ ہزار اشرفی امام حسین کا خون بہا یزید نے اہل بیت کو دیا۔

پھر صـ ۴۷۵ پر

"یزید لعنۃ اللہ علیہ ازاں پس برد و منا دید ذاکیاس از ذہب دفعہ از بہر ایشاں حمل کرد و ہرچہ از ایشاں ماخوذ شدہ بود شعف برابر باز پس داد"

یعنی محبان حسین نے اہل بیت کا جتنا مال لوٹا تھا یزید نے اس سے دگنا مال دے کر اس نقصان کی تلافی کی۔

(۴) شیعہ کوفی ماتمیوں نے حسینؓ کو قتل بھی کیا پھر اہل بیت کو رسوا بھی کیا۔ یزید نے قتل کی اطلاع ملنے پر ناخوشی کا اظہار بھی کیا۔ اہل بیت کو سرائے خاصہ میں

ٹھیرایا اور اس وقت تک کھانا نہ کھایا جب تک زین العابدین موجود نہ ہوتے (ناسخ التواریخ صـ۴۷۱)

(۵) شیعہ کوفیوں کے متعلق ائمہ نے جو مستقل رائے قائم کر رکھی تھی اس کا اظہار امام باقر نے اس وقت کیا جب حضرت زید نے خروج کا ارادہ کیا تھا۔ شیخ عباس قمی نے اپنی مشہور کتاب تتمۃ المنتہیٰ صـ۵۸ میں بیان کیا ہے۔

"چوں زید ارادہ کرد با برادر خود امام باقر مشورت کرد حضرت فرمود اعتماد بر اہل کوفہ نشاید چہ ایشاں اہل عذر و مکر باشند در کوفہ شہید شد جد تو امیر المؤمنین علی۔ و زخم زدند عم تو حسن بن علی و شہید شد پدرت حسین بن علی"

یعنی یزید کے ذمے صرف امام حسینؓ کا قتل لگایا گیا جس کی تردید خود شیعہ علماء نے کر دی اور اسے بری قرار دے دیا مگر شیعان کوفہ کے متعلق تو کئی جرم امام باقر نے بیان کر دئے کہ حضرت علی کو انھوں نے قتل کیا۔ حضرت حسن کو انھوں نے ایذا پہنچائی اور حضرت حسین کو انھوں نے قتل کیا اس کے برعکس امام زین العابدین کے ساتھ یزید کی جو گفتگو ہوئی اس سے امام مطمئن ہو گئے اور فرمایا

انا عبد مکرہ ان شئت فبع .....

منتہی الآمال میں تو جابجا یزید کی ندامت اور اس زیادتی کی تلافی کا ذکر موجود ہے جو ابن مرجانہ کے ہاتھوں امام حسین کے ساتھ کی گئی۔ مثلاً صـ۴۳۴

"وو پسر زیاد لعین در امر او تعجیل کرد و من بہ کشتن او راضی نہ بودم"

صـ۴۳۶ حضرت سید السجاد علیہ السلام را در مجلس خویش می طلبید قتل امام حسین را با ابن زیاد نسبت می داد و را لعنت می کرد بر ایں کار۔ و اظہار ندامت می کرد۔

اور صـ۴۴۲ پر امام زین العابدین کے ساتھ یزید کی گفتگو۔

اور صـ۴۴۴ پر بروایت شیخ مفید یزید حضرت سید السجاد را طلبید در مجلس

خلوتے و گفت خدا وند لعنت کند پسر مرجانہ را۔ بخدا قسم اگر من نزد پدرت حاضر بودم آنچہ از من طلب مے نمود عطا می کردم و ہر چہ ممکن بود مرگ از او دفع میدارم و نمیگذاشتم کہ کشتہ شود ...... از برائے برون آوردن حاجت تو حاضرم ہر چہ خواہی از مدینہ برائے من بنویس تا حاجت ترا برآنم"

خلاصہ یہ کہ ماتم کی ابتداء کرنے میں محبان اہل بیت اور یزید برابر ہیں مگر اہل بیت کے ساتھ اہل کوفہ محبان اہل بیت نے جو سلوک کیا۔ ائمہ اور شیعہ علماء کے بیان کے مطابق یزید اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا بقول حضرت زینب

بؤتم بغضب من اللہ وضربت علیکم المسکنۃ۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیرے   بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردنے

بات ماتم کی چل رہی تھی درمیان میں ضمناً یہ بات آگئی کہ محبان اہل بیت اور یزید میں سے کون سے گروہ کی کرم فرمائیاں اہل بیت کے حق میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔

معتبر کتب شیعہ سے یہ ثابت کیا جا چکا کہ ماتم کی ابتداء قاتلین حسین نے کی۔ اب یہ دیکھئے کہ اس میں مزید رنگ کس نے بھرا اور اس عبادت کو اور زیادہ باعث کشش کس نے بنایا۔

(۱) ناسخ التواریخ صـ۴۷۵

پس از آں اہل بیت را از مجلس یزید بیروں بردہ بخانۂ یزید درآوردند و از یں وقت ہیچ زنے از اہل یزید نماند جز اینکہ نزد ایشاں بیامد۔ و سوگواری بپا کردند و از آنچہ اہل بیت ماخوذ شدہ بود بہ یسبدند و دو چنداں بآں تقدیم کردند۔

یعنی جب اہل بیت یزید کے گھر میں داخل ہوئے تو یزید کے گھر کی تمام مستورات ان کے پاس جمع ہو گئیں۔ اور ماتم برپا کر دیا۔ اور اہل بیت کا جو مال نقصان ہوا تھا اس کا دو چند پیش کیا۔ یہ پہلے گذر چکا ہے کہ یزید نے ہاگنا رقم

پیشی کی اور یزید کے گھر والوں نے دو چند تم پیشی کی مزید کیا انھوں نے ماتم بھی کیا۔

(۲) منتہی الآمال ص۳۴۹

پس جناب فاطمہ دختر سید الشہداء فرمود اے یزید دختران رسول خدا را اسیر کردی۔ اہل مجلس و اہل خانہ یزید از استماع ایں کلمات گریستن گرفتند چنداں کہ صدا ہائے گریہ و شیون بلند شد۔

یعنی یزید کے اہل خانہ نے رونا شروع کیا یہاں تک ان کے شور و شیون کی آواز بلند ہوئی۔

(۳) ایضاً ص۳۴۲

چوں مخدرات اہل بیت عصمت و جلالت علیہم السلام داخل خانہ آں شدند زنان آل ابوسفیان زیور ہائے خود کندند و لباس ماتم پوشیدند صدا بہ گریہ و نوحہ بلند کردند۔

یعنی یزید کے اہل خانہ نے تین کام کیے۔ اول اپنے زیور نوچ ڈالے۔ دوم لباس ماتم پہن لیا۔ سوم گریہ اور بلند آواز سے نوحہ شروع کر دیا۔ گویا موجودہ مروجہ ماتم کے یہ تین اجزاء یزید کے گھر سے شروع ہوئے۔

(۴) منتہی الآمال ص۳۴۴

خانہ برائے ایشاں مقرر کردند و ایشاں جامہائے سیاہ پوشیدند و ہر کہ در شام بود از قریش و بنی ہاشم در ماتم و زاری و تعزیت و سوگواری با ایشاں موافقت کردند۔ و تا ہفت روز برآں جناب ندبہ و نوحہ و زاری کردند

اس بیان سے معلوم ہوا کہ:۔

(۱) یزید نے ماتمی عورتوں کے لیے الگ مکان مقرر کیا۔

(۲) انہوں نے سیاہ لباس زیب تن کیا۔

(۳) شام میں بنی ہاشم نے ان کے ساتھ موافقت کی۔

(۴) سات روز تک ماتم، نوحہ اور تعزیت کا سلسلہ جاری رہا۔

شیعہ کتب کے ان چار اقتباسات سے معلوم ہوا کوفہ کے بعد شام میں ماتم کے عبادت جاری کرنے والے یزید کے گھر کی مستورات تھیں۔ اور انہوں نے ماتم کے آداب میں زیور نوچ ڈالنا، سیاہ لباس پہننا مل کر بلند آواز سے نوحے پڑھنا۔ اور سات روز تک اس عبادت کو جاری رکھنے کی بنیاد رکھی۔ اس اعتبار سے موجودہ ماتم گویا اہل خانہ یزید کی سنت ہے۔ یعنی ماتم کی ابتدا کوفہ سے ہوئی جو قاتلین حسین ؓ کی پھر شام میں اس کی توثیق ہوئی۔ اور وہ یزید کے گھر کی عورتوں نے کی۔ دونوں مقامات میں قدر مشترک یہ ہے وہاں بھی عورتوں نے اس کی بنیاد رکھی اور یہاں بھی عورتوں نے ہی اس میں اضافے کیے۔ گویا ماتم کی ابتدا میں دو امور واضح ہیں کہ اول تو ماتم شروع کرنے والے دشمنان اہل بیت تھے دوم عورتوں سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ تو اس عبادت کو جاری رکھنے میں بیک وقت دو سنتیں ادا ہوئیں اول دشمنان اہل بیت کی سنت دوم عورتوں کی سنت۔

اس کے بعد ماتم کے بارے میں تاریخ خاموش ہے یہاں تک کہ چوتھی صدی کے دوسرے وسط میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

منتہی الآمال ص۴۵۲: جملہ (ای مورخین) نقل کردہ اند کہ سنہ ۳۵۲ (سی صد و پنجاہ و دو) روز عاشور معز الدولہ دیلمی امر کرد اہل بغداد را بہ نوحہ و لطمہ و ماتم بر امام حسین و آنکہ زنہا موہیا را پریشان و صورت ہا را سیاہ کنند و بازار ہا را بہ بندند و بر دکانہا پلاس آویزاں نمائند و طباخین طبخ نکنند و زنہائے شیعہ بیروں آمدند در حالیکہ صورتہارا بہ سیاہی دیگ وغیرہ سیاہ کردہ بودند و سینہ می زدند و نوحہ می کردند و سالہا چنیں بود و اہل السنت عاجز شدند از منع آں لکون السلطان مع الشیعۃ۔

اس تاریخی دستاویز سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ۳۵۲ھ میں معز الدولہ دیلمی نے حکماً بغداد میں ماتم کرنا جاری کیا۔

(۲) اس کام کے لیے عاشورا کا دن مقرر کیا۔

(۳) اہل بغداد امام حسین کے ماتم کے لیے نوحے کریں اور منہ نوچیں۔

(۴) عورتیں بال بکھارے اپنے چہرے کو سیاہ کریں۔

(۵) بازار بند ہو جائیں۔
(۶) نابنائی کھانا نہ پکائیں۔
(۷) شیعہ عورتیں اس حالت میں باہر آئیں کہ چہروں کو دیگ کی کالک سے سیاہ کئے ہوئے تھیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ اور نوحے کر رہی تھیں۔
(۸) کئی سال تک یہی کچھ ہوتا رہا۔
(۹) اہل السنت اس کی رکاوٹ کرنے سے عاجز آگئے کیونکہ بادشاہ شیعوں کے ساتھ تھا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ماتم کی ابتداء تو قاتلین حسین اور خانۂ یزید سے ہوئی پھر تین سو سال تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ تین سو سال کے بعد ایک شیعہ بادشاہ نے حکماً یہ عبادت جاری کی جس کا مطلب یہ ہے کہ عبادات کے تعین میں جو منصب اللہ رسول کو ہے وہ شیعہ بادشاہ کو سونپ دیا۔

اس میں بھی عورتیں پیش پیش ہیں۔ اور اہل السنت روکنا تو چاہتے تھے کیونکہ یہ مذہب میں اور دینی عبادات میں اضافہ ہے مگر روک نہ سکے کیونکہ شاہی حکم تھا اور اقتدار اس کی پشت پر تھا۔

منتهی الآمال ص ۴۵۳

وبعضے از علماء این مطلب را از معجزات باہرات آنحضرت شمردہ واز زمان سلطنت دیلمیہ تاکنوں در ہمہ سال لوائے تعزیہ داری ایں مضمون در شرق و غرب عالم برپا است و مشاہدہ می شود کہ مردم شیعی مذہب در ایام عاشورا چہ گونہ بے تاب و بے قرار ہستند و در جمیع بلاد مشغول نوحہ سرائی و اقامۃ مجلس تعزیہ و بر سر و سینہ زدن و لباسہائے سیاہ پوشیدن و سائر لوازم مصیبت ہستند۔

یعنی علمائے شیعہ نے معز الدولہ کی اس تحریک کو امام کا معجزہ قرار دیا گویہ معجزہ تین صدیوں بعد ظہور پذیر ہوا۔ مگر یہ معجزہ تو معز الدولہ کا ہے کہ اس کے بعد اب تک ان شرائط کے ساتھ تعزیہ داری مشرق مغرب میں رائج ہے۔

رہا یہ سوال یہ سب لوازم مصیبت ہیں۔ اس میں کلام ہے۔ مصیبت تین سو سال پہلے آئی اور لوازم مصیبت تین سو سال بعد ظاہر آئے۔ مصیبت اہل بیت پر آئی اور لوازم مصیبت قاتلین اہل بیت کے گھر سے ظاہر ہوئے۔ مصیبت امام حسین کے گھر میں آئی اور لوازم مصیبت نے یزید کے گھر سے سر نکالا۔ جن پر مصیبت آئی کیا انہوں نے بال نوچے، سینہ کوبی کی منہ پر تھپڑ مارے۔ دیگ کی کالک منہ پہ ملی۔ سیاہ لباس پہنا۔ نوحے پڑھے۔ بین کئے۔ مگر وہ کیسے کر سکتے تھے۔ انہیں لوازم مصیبت سے بڑھ کر لوازم دین کا پاس تھا۔ اللہ کی کتاب کی ستر سے زیادہ بار صبر کی تلقین ان کے لیے مشعل راہ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت انہیں یاد تھی، حضرت علی کے ارشادات ان کے سامنے تھے اس لیے لوازم مصیبت ان پر کیونکر غالب آ سکتے تھے۔

مصیبت اور لوازم مصیبت

دنیا دار المحن ہے۔ انسان پر مصائب کا آنا قدرتی امر ہے یہ اور بات ہے کہ مصائب کی نوعیت اور مصیبت کی شدت مختلف افراد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ بہرحال جب مصائب کا آنا قدرتی امر ہے تو اس کا ردعمل ہونا بھی قدرتی امر ہوگا۔ پھر یہ ردعمل دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو غیر اختیاری ہوگا اور اس پر آدمی ماخوذ نہ ہوگا۔ دوسرا وہ جو اختیاری ہوگا اور اختیار کے استعمال میں آئین شرع کی پابندی لازمی ہے اور اختیار کے غلط استعمال پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے ردعمل کو قرآنی زبان میں صبر کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وبشر الصابرين الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون اور ان کے انعامات کا اعلان کیا ہے کہ اولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة واولئك هم المهتدون۔

اور دوسرے ردعمل کو جزع فزع کہتے ہیں۔ جس کے لیے بہت سی وعیدیں آئی ہیں۔ مختصر یہ کہ قلب کا متاثر ہونا اور آنکھوں سے آنسو بہ نکلنا غیر اختیاری ہے لہٰذا منافی صبر نہیں۔ زبان اور ہاتھوں کا حرکت میں آنا اختیاری فعل ہے اس

لیے زبان سے شکوہ نوحہ بین وغیرہ اور ہاتھوں سے بال نوچنا اور سینہ کوبی وغیرہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کی ایک صورت ہے جو اللہ کے غضب اور اسکی ناراضی کا سبب ہے۔ اب ہم کتب شیعہ سے ان دونوں قسم کے ردعمل کا اجمالی ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ انوار نعمانیہ ص۳۱۷ طبع ایران۔ صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

ان القرآن والحدیث قد اکثر من مدحہ حتی انہ سبحانہ وتعالیٰ وصف الصابرین باوصاف وذکر الصبر فی القرآن فی نیف وسبعین موضعا واضاف اکثر الخیرات والدرجات الی الصبر وجعلها ثمرۃ له فقال عزوجل وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا وقال تمت کلمة ربك الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا وقال انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب من الآیات۔

وقال صادق الصبر من الایمان بمنزلة الراس من الجسد فاذا ذهب الراس ذهب الجسد کذلك اذا ذهب الصبر ذهب الایمان لما سئل صلی اللہ علیہ وسلم عن الایمان قال هو الصبر۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

۱۔ قرآن وحدیث میں صبر کی مدح کثرت سے کی گئی ہے۔
۲۔ اللہ تعالیٰ نے صابرین کو بہت سے اوصاف سے متصف فرمایا ہے۔
۳۔ قرآن کریم میں ستر سے زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر آیا ہے۔
۴۔ قرآن نے اکثر نیکیوں اور درجات کو صبر کے ساتھ منسوب کیا ہے اور ان درجات کو صبر کا ثمرہ قرار دیا ہے۔
۵۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کی وجہ سے لوگوں کو ہدایت کا امام بنا دیا۔
۶۔ صبر کرنے والوں کو بے حساب صلہ دینے کا یقین دلایا۔
۷۔ امام جعفر صادق نے فرمایا جو حیثیت جسم کے لیے سر کی ہے وہی حیثیت ایمان کے لیے صبر کی ہے۔

۸۔ اگر سر کٹ جائے تو دھڑ بے کار ہے اسی طرح اگر صبر جاتا رہے تو ایمان بھی جاتا رہا۔
۹۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایمان کیا ہے تو آپ نے فرمایا ایمان صبر ہے۔

مختصر یہ کہ صبر نہ ہے تو ایمان غائب اور امامت کا درجہ صرف اسی کو ملتا ہے جو صبر کرے۔ صبر نہ کرے تو امام ہدایت نہیں بن سکتا۔

(۲) انوار نعمانیہ ص۳۱۸ امام جعفر فرماتے ہیں:۔

انا لصبر وشیعتنا اصبر منا لانا صبرنا علی ما نعلم وشیعتنا یصبرون علی ما لا یعلمون۔

یعنی امام جعفر نے صرف اپنے متعلق نہیں کہا بلکہ اپنے خاندان اہل بیت کے متعلق فرمایا کہ ہم صبر کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اس حقیقت کا علم ہے کہ مصیبت کہاں سے آرہی ہے۔ نیز یہ فرمایا کہ ہمارے شیعہ علم نہ ہونے کے باوجود بھی صبر کرتے ہیں۔ گویا شیعہ وہی ہے جو صابر ہوتا ہے۔ جو صبر نہ کرے وہ شیعہ نہیں۔

(۳) نہج البلاغہ ۲ : ۱۶۸

قال علی علیکم بالصبر فان الصبر من الایمان کالراس من الجسد ولا خیر فی جسد لا راس معہ ولا ایمان فی ما لا صبر معہ۔

حضرت علیؓ نے صبر کی تاکید فرمائی اور اس کی وجہ بتائی کہ ایمان کے لیے صبر کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لیے سر کی ہوتی ہے جس طرح دھڑ بغیر سر کے بیکار ہے اسی طرح ایمان بغیر صبر کے کسی کام کا نہیں۔

(۴) ایضاً ۲ : ۱۸۵

قال علی ینزل الصبر علی قدر المصیبة ومن ضرب یدہ علی فخذہ عند مصیبة حبط عملہ۔

یعنی حضرت نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ مصیبت کی شدت کے مطابق صبر ہوتا

ہے جس پر جیسی مصیبت آئے اسے اسی کے متناسب صبر کرنا ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ جو شخص مصیبت آنے پر اتنی بے صبری کا اظہار بھی کرے کہ اپنے زانو پر ہاتھ مارے اس کے اعمال ضائع ہو گئے۔

امام تو فرمائیں کہ مصیبت کے وقت زانو پر ہاتھ مارنے والے کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور یہاں سے یہ اصرار کہ سینہ کوبی کرنا، منہ کالا کرنا، بال نوچنا عبادت ہے تو آدمی سوچے کہ اعمال تو پہلے دھلے میں ضائع ہو گئے۔ اب مزید ضائع ہونے کے لیے تو کچھ رہا نہیں لہٰذا اس کے وبال کا بوجھ ہی اس کی گردن پر رکھا جاسکتا ہے۔

(۵) فیض الاسلام شرح نہج البلاغہ ۲ : ۱۱۳ علیکم بالصبر

یہی بات درۃ النجفیہ ۲ : ۳۶۶ میں بھی درج ہے۔

یہ ہے مصیبت کے مقابل میں ردِ عمل کا ایک پہلو اب دوسرا پہلو ملاحظہ ہو۔
صبر کے مقابل جزع فزع ہے اس کے متعلق حضرت علی کا ارشاد ہے

(۱) درۃ النجفیہ ۲ : ۳۶۶

ان اللہ قد جعل للانسان قوۃ استعداد لان یصبر بمقدار مصیبۃ و من ثم استعدادہ ایفض علیہ ذلک المقدار من الصبر و من قصر فی الاستعداد حصول ہذہ الفضیلۃ وارتکب ضدھا وھو الجزع حبط اجرہ وثوابہ علی الصبر لان شدۃ الجزع یستلزم کراھیۃ قضاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت علیؑ کے ارشاد میں اظہار حقیقت بھی ہے حکمت اور فلسفہ بھی ہے۔ صبر کی فضیلت بھی ہے اور جزع فزع کی ممانعت بھی جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں صبر کی قوت اور استعداد رکھی ہے۔

۲۔ اس استعداد کے مطابق مصیبت نازل ہوتی ہے۔

۳۔ جو شخص فطرت کی عطا کردہ استعداد کے مطابق صبر نہ کرے اور صبر کی فضیلت حاصل نہ کرے اور اس کی ضد یعنی جزع فزع شروع کر دے تو اس کا اجر و ثواب

ضائع ہو گیا۔

۴۔ شدت سے جزع فزع کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلہ خلاف احتجاج کر رہا ہے اور اس فیصلے کو ناپسند کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا امام حسینؑ اور اہل بیت میں بھی یہ استعداد اللہ تعالیٰ نے رکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کے اس قول کی روشنی میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے مستثنیٰ ہوں لہٰذا ان میں بھی یہ استعداد موجود تھی۔

۲۔ کیا ان پر آنے والی مصیبت اس استعداد کے مطابق تھی یا نہیں؟ یہ بات دل کو لگتی ہے کہ استعداد اس مصیبت پر صبر کرنے کی زیادہ نہ ہو تو اس کے مطابق ضرور تھی۔

۳۔ کیا انہوں نے صبر کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اس استعداد سے کام لیا یا نہیں۔
اگر یہ تصور کیا جائے کہ کام نہیں لیا تو ظاہر ہے کہ انہوں نے صبر کی ضد جزع فزع سے کام لیا۔

۴۔ اگر تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا لازم آئے گا کہ انہیں اللہ کا فیصلہ پسند نہیں تھا اور انہیں اس کے خلاف شکایت تھی۔ یہ بات وہی تسلیم کر سکتا ہے جسے اہل بیت سے دلی بغض ہو۔

۵۔ دوسری بات یہ لازم آتی ہے کہ اگر انہوں نے جزع فزع کی تو ان کے اعمال اکارت گئے۔ پھر امامت کا کیا بنے گا۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان پر جو مصیبت آئی وہ استعداد کے مطابق تھی اور انہوں نے صبر کا حق ادا کر دیا اور جزع فزع کر کے اللہ کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لیا۔ پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ موجودہ وضع پر جزع فزع اور ماتم کرنا۔ ائمہ کی مخالفت بھی اور اللہ کے فیصلے کے خلاف احتجاج بھی اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کی ایک صورت

بھی ہے۔

(۲) نہج البلاغہ ۲ : ۳۶۹

قال علیؑ من لم ینجح الصبر اھلکہ الجزع ای من لم یصبر علی المصیبۃ لینجو فخرج ھلک ۔

یعنی صبر ہی حقیقی کامیابی ہے اور جزع فزع نری ناکامی اور جو شخص مصیبت میں صبر نہ کر سکا کہ کامیابی حاصل کر سکے اور جزع فزع شروع کیا وہ ہلاک ہوگیا۔

حضرت علیؑ کے اس قول کی روشنی میں پھر دیکھنا پڑے گا کہ امام حسینؑ کامیاب ہوئے یا ناکام۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام نے یا اہل بیت نے جزع فزع کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کہنے والا یہ اعلان کر رہا ہے کہ معاذ اللہ وہ ہلاک ہوگئے۔ اگر یہ جرأت نہ کر سکے تو یہ ماتم اور سینہ کوبی آخر کس مقصد کے لیے ہے

(۳) آیت قرآنی لا یعصینک فی معروف کی تفسیر میں شیخ مقداد مفسر شیعہ نے اپنی تفسیر کنز العرفان میں لکھا ہے۔ عنی بہ النھی من النوح وتمزیق الثیاب وجزع الشعر وشق الجیب وخدش الوجہ والدعا بالویل ۔

یعنی معروف میں نافرمانی نہ کرنے کے عہد سے مراد نہی اور ممانعت ہے نوحہ کرنے سے، کپڑے پھاڑنے سے، بال نوچنے سے، گریبان چاک کرنے سے منہ پر تھپڑ مارنے سے اور ہائے وائے کرنے سے۔

اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ شیعہ مفسر نے قرآنی آیت کی رو سے اس ماتم کو حرام قرار دیا ہے۔ حیرت ہے کہ حرام کا ارتکاب اور اللہ کی نافرمانی ہی اگر بہترین عبادت ہے تو گناہ کی تعریف کیا ہوگی۔

(۴) تفسیر فرات بن ابراہیم میں ہے مرض موت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو وصیت فرمائی ۔ یا فاطمۃ بنت النبی ۔۔۔۔ ان النبی لا یشق علیہ الجیب ولا تخمش علیہ الوجہ ولا یدعی علیہ بالویل ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، پھر ارشاد بھی وصیت اور وہ بھی اپنی بیٹی کو۔

بات کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے وہ بات کیا ہے؟ گریبان چاک کرنے منہ پیٹنے اور زبان سے ہائے وائے کرنے کی ممانعت ہے۔

یہ ہے مصیبت کے وقت رد عمل کی دوسری صورت کی حقیقت کی ہاتھ اور زبان کو اس انداز سے استعمال کرنے کی ممانعت۔

(۵) تفسیر صافی میں شیعہ مفسر محسن کاشی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم لا تلطمن خدا ولا تخمشن وجھا ولا تنتفن شعرا ولا تشققن جیبا ولا تسودن ثوبا ولا تدعین بالویل ۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خاص طور پر یہ عہد لیا کہ ہرگز چہرے پر تھپڑ نہ مارنا، منہ نہ نوچنا، بال نہ نوچنا، گریبان چاک نہ کرنا، کپڑے کالے نہ کرنا اور ہائے وائے نہ کرنا۔ تو ان امور کے ممنوع اور حرام ہونے میں شبہ کیا رہا۔ مگر اہل کوفہ کی عورتوں نے اور یزید کے اہل خانہ نے خدا اور رسول کی صریح مخالفت کر کے یہ سارے کام کئے اور محبان اہل بیت نے اسے چوٹی کی عبادت قرار دیا۔

(۶) تفسیر منہج الصادقین، فتح اللہ کاشانی اسی آیت کے تحت نوحہ نکنند، جامہ نہ درند، و موئے نکنند۔ و روی نہ خراشند الخ ۔

(۷) تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے تحت۔

عنی بالمعروف النھی عن النوح، والتمزیق الثیاب وجزع الشعر وشق الجیب وخمش الوجہ

(۸) کتاب المیزان۔ طبا طبائی۔ اسی آیت کے تحت

امام جعفر صادق نے اس سے یہی مطلب لیا ہے

لا تلطمن خدا، ولا تخمشن وجھا ولا تنتفن شعرا ولا تشققن جیبا ولا تسودن ثوبا۔

(۹) تفسیر قمی اسی آیت کے تحت یہی الفاظ درج ہیں۔

شیعہ تفاسیر میں مروجہ ماتم کے تمام اجزا اور شرائط کی ممانعت کا ذکر ہو چکا اب دوسری کتب شیعہ سے اسی دوسرے رد عمل کے متعلق کچھ اجمالی بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) اصول کافی میں صبر کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے جو کتاب الکفر والایمان کے ذیل میں ہے۔

(۲) من لا یحضرہ الفقیہ ۱ : ۱۶۲

سئل الصادق عن الصلوۃ فی القلنسوۃ السوداء فقال لا تصل فیہا فانہا لباس اہل النار۔

امام جعفر صادق نے سیاہ لباس کو دوزخیوں کا لباس قرار دیا اسی وجہ سے اس کی ممانعت فرمائی۔ مگر محبان اہل بیت بڑے اہتمام سے دوزخیوں کے ساتھ مشابہت پیدا کر کے یہ عبادت کرتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے۔

(۳) ایضاً ۱ : ۱۶۳

قال امیر المومنین علیہ السلام فیما علم اصحابہ ولا تلبسوا السواد فانہ لباس فرعون۔

حضرت علیؓ نے اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ سیاہ لباس مت پہننا کہ یہ فرعون کا لباس ہے۔ اور شیعان علی عبادت کے طور پر سیاہ لباس پہنتے ہیں یعنی اس فعل سے حضرت علیؓ کی عداوت اور فرعون سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ محبت دل کا فعل ہے جو پوشیدہ معاملہ ہے اور محبت چھپائے چھپتی بھی نہیں لہٰذا کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو کے رہتی ہے اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا محبوب کون ہے۔ اس لیے سیاہ لباس سے عشاق کی محبت فرعون کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی صفحے پر ہے۔

وعن الصادق علیہ السلام انہ قال اوحی اللہ عزوجل الی نبی من انبیاء قل للمومنین لا یلبسوا لباس اعدائی الی ان قال فیکونوا اعدائی۔ فاما لبس السواد للتقیۃ فلا اثم علیہ۔

اللہ تعالٰی نے اپنے کسی نبی کو وحی کے ذریعے فرمایا کہ مومنوں سے کہہ دو کہ سیاہ لباس پہن کر میرے دشمن مت بنو۔ یعنی سیاہ لباس اللہ کے دشمنوں کی نشانی ہے۔

امام نے فرمایا کہ تقیہ کے طور پر سیاہ لباس پہننے میں کوئی گناہ نہیں۔ مگر ماتم کے جلوس میں تقیہ کا کون سا محل ہے۔ تقیہ تو کسی کے ڈر کی وجہ سے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے کہ خطرہ دور ہو جائے۔ ماتم میں دوزخی بننا اور فرعون کا محب بننا کس خطرے سے بچاؤ کی صورت ہے۔

امام نے ایک موقعہ پر سیاہ لباس پہنا۔

اسی صفحے پر ہے کہ

فاتاہ رسول العباس خلیفۃ یدعوہ فدعا بمطر احد وجہیہ اسود والآخر ابیض فلبسہ ثم قال اما انی البسہ وانا اعلم انہ لباس اہل النار۔

خلیفہ کے بلانے پر امام چلے تو ایسا لباس پہنا جس کا کچھ حصہ سیاہ کچھ سفید تھا۔ امام نے پہنا اور یہ وضاحت کر دی کہ یہ دوزخیوں کا لباس ہے۔ یہ تقیہ کا موقع نظر آتا ہے۔ لہٰذا امام نے پہنتے ہوئے عین موقع پہ وضاحت کر دی کہ میں کسی مجبوری کے تحت یہ لباس پہن رہا ہوں ورنہ ہے تو یہ دوزخیوں کا لباس۔

(۴) الطرائف المذہب صـ ۲۱۲ امام حسینؑ کی وصیت۔

یا اخت تعزی بعزاء اللہ فان السکان السموات یفنون واہل الارض کلہم یموتون وجمیع البریۃ یہلکون۔ آنگاہ فرمود یا اخت۔ یا ام کلثوم۔ وانت یا زینب، وانت یا فاطمہ وانت یا رباب انظرن اذا انا قتلت فلا تشققن علی جیبا ولا تخمشن علی وجہا ولا تقلن ہجرا۔

قاعدہ ہے اور مشاہدہ ہے کہ وصیت ہمیشہ کسی اہم ترین کام کے متعلق کی جاتی ہے اور پھر جسے موت سامنے نظر آ رہی ہو وہ تو لازماً ایسے کام کی وصیت کرتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہو امام حسینؑ نے ایسے ہی موقع پر اپنے اعزہ کو وصیت کی کہ میرے قتل ہونے پر کپڑے نہ پھاڑنا۔ منہ نہ نوچنا اور ہائے وائے نہ کرنا۔

اسی کتاب کے صـ ۲۱۳ پر شارح لکھتا ہے

بعد ازاں فرمود رقیہ، سکینہ و فاطمہ را بخواند .... وصیت می کنم شمارا کہ

من کشتہ می شوم گریبان بر من پارہ مکنید و چہرہ را لطمہ مزنید و صورت مخراشید۔ بقیہ مکالمات چنانست۔

(۵) فروع کافی ۱: ۲۴۱ باب اللباس حسین بن مختار سے روایت ہے۔

قال قلت لابی عبداللہ ایحرم الرجل فی الثوب الاسود قال لا و لایکفن بہ المیت،

امام جعفرؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ انسان سیاہ لباس میں نہ احرام باندھ سکتا ہے۔ نہ میت کو سیاہ کپڑے میں کفن دیا جا سکتا ہے۔

اس سے سیاہ لباس کے تقدس کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

لوازمات مصیبت کے سلسلے میں ہر دو ردعمل کے متعلق معتبر شیعہ کتب سے وضاحت کر دی گئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) اللہ تعالےٰ، رسول کریمؐ، حضرت علی، امام جعفر صادق اور شیعہ محدثین کے اقوال پیش کئے گئے جن میں مصیبت کے وقت صبر کی تاکید کی گئی ہے۔

(۲) قرآن مجید، تفسیر قرآن، حدیث نبوی سے ماتم کی ممانعت اور اس کے حرام ہونے کا حکم بیان کر دیا گیا۔

(۳) امام حسین کی وصیت، حضرت علیؓ کے اقوال پیش کئے گئے کہ سیاہ لباس پہننا، نوحہ کرنا، بال نوچنا، گریبان چاک کرنا سب حرام ہے۔

(۴) ائمہ کا بیان کہ سیاہ لباس دوزخیوں کا لباس ہے اور فرعون کا لباس ہے۔

اس ساری ممانعت کے باوجود محبان اہل بیت جس اہتمام سے ماتم کرتے ہیں اور جن شرائط اور آداب سے ماتم کرتے ہیں اس سے اس امر کا اظہار ہے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی، رسول کی مخالفت حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، امام جعفر صادق سب کے خلاف کرنے کا اس قدر اہتمام کر رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ عین مخالفت ائمہ کے دوران انکی محبت کے گیت بھی گائے جاتے ہیں۔

آیات قرآنی، مفسرین کی تشریحات، احادیث رسول اور ائمہ کے اقوال میں ماتم کی حرمت اور ممانعت کے سامنے ماتم کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہاں آدمی دور از کار تاویلات کر کے خود فریبی کا شکار ہو جائے تو اور بات ہے البتہ چند ایک امور کے متعلق شیعہ حضرات کو تردد ہوتا ہے مثلاً

(۱) اصل قاتل کوفی شیعہ نہیں تھے بلکہ یزید تھا کیونکہ اس نے حکم دیا تھا۔ اس اشتباہ کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ کوفی قاتل نہیں تھے۔ مگر یہ صرف دعویٰ ہے۔ اور شواہد اس کے خلاف ہیں۔ مثلاً کوفیوں نے امام کو دعوت دی تھی۔

دعوت دینے والوں نے وعدہ خلافی کی دشمن کے ساتھ مل گئے اور امام کو شہید کیا۔ اس لیے اصل قاتل وہی ہیں جنہوں نے گھر بلا کر فریب دیا اور دشمن کے ساتھ مل گئے۔

پھر اہل بیت کی شہادت موجود ہے حوالہ جات گذر چکے ہیں امام حسینؓ نے فرمایا ہمارے شیعوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ امام زین العابدین نے کوفیوں کو قاتل ٹھیرایا۔ حضرت زینب اور ام کلثوم کی شہادت انہی کے خلاف ہے اور کوفی شیعوں نے خود اعتراف کیا ہے مجالس المؤمنین میں ان کا اقبال جرم موجود ہے۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ قاتل یزید ہے۔ شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ یزید نے امام کو دعوت نہیں دی۔ شیعہ کتب کے حوالوں سے پیش کیا جا چکا ہے کہ شیعوں نے یزید کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ امام زین العابدین کا بیان موجود ہے۔

(۲) دوسرا اشکال یہ ہے کہ جن کوفیوں نے خطوط لکھے وہ شیعہ نہیں تھے۔ بلکہ ان خطوط میں موجود ہے کہ لیس علینا امام اس لیے وہ منکر امامت تھے شیعہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ اشکال بھی بس دعویٰ ہی ہے۔ جبکہ دلائل اس کے خلاف ہیں مثلاً پہلا خط سلیمان بن صرد مسیب بن بقفہ اور رفاع بن شداد بجلی وغیرہ نے لکھا کہ تمام شیعہ مؤمنین (جمیع شیعہ) کی طرف سے یہ خط لکھا گیا ہے۔

دیکھئے جلاء العیون ص۲۴۳ اسی طرح منتہی الآمال اور ناسخ التواریخ میں بھی موجود ہے۔ پھر طراز المذہب، مجالس المؤمنین، ریاض المصائب، بحر المصائب، مفتاح البکاء، اکسیر العبادات، مقتل ابی مخنف، مہیج الاحزان، روضۃ المناظر، مقتل الشہداء، ریاض الشہادت، محرق القلوب، حرقۃ الفواد، مخزن البکاء، طوفان البکاء،

مطالع الاحزان، روضۃ الاذکار، لہوف فی قتل الصفوف، اسرار الشہادۃ، انیس الذاکرین عین البکاء، واصل البکاء، مصائب الابرار، حدیقۃ السعداء، معدن البکاء، نوحۃ الاحزان، شفاء الصدور، خلاصۃ المصائب، ذبح عظیم، احتجاج طبرسی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو خطوط لکھے گئے ان میں شیعہ کا لفظ موجود تھا۔ اور جس خط میں یہ لفظ نہیں بوجہ شہرت کے چھوڑ دیا گیا ہے۔

پھر جلاء العیون ص۴۳۱ پہ امام حسین کا وہ جوابی خط موجود ہے جو ۱۲ ہزار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اس کا مضمون یوں شروع ہوتا ہے۔

بسم اللہ...... یہ خط حسین بن علی کا مومنوں، مسلمانوں شیعوں کی طرف ہے۔

س ص الیس علینا امام کا معاملہ تو امام کا موجودہ مفہوم بعد کی ایجاد ہے۔ اس وقت امام کے متعلق یہ عقیدہ کسی کا نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم یزید کو حاکم تسلیم نہیں کرتے اور اس کے خلاف اٹھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ائمہ معصومین جب صاف اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے قاتل شیعہ ہیں اور ملزم خود اقراری ہیں تو کوئی تیسرا شخص اس مسلمہ حقیقت کو کیونکر جھٹلا سکتا ہے۔

اپنے اور پرائے

دنیا میں مختلف خیالات، مختلف نظریات اور مختلف عقائد کے لوگ بستے چلے آئے ہیں۔ اور انسان وہی عقیدہ اختیار کرتا ہے جسے اچھا سمجھتا ہے اور اس کی پسند کے مطابق ہوتا ہے یہ ایک فطری عمل ہے ایسا نہ ہو تو کوئی کسی خاص نظریے سے چمٹا کیوں رہے۔ اس فطری دائرے سے آگے ایک مقام وہ آتا ہے جہاں انسان اپنے عقائد کو دوسرے عقائد سے بہتر اور افضل سمجھتا ہے ایسا کرنا بھی اسی فطری جذبہ ہی کا ایک حصہ ہے مگر اس سے آگے بڑھیں تو ایسے منظر بھی سامنے آتے ہیں کہ انسان صرف اپنے عقیدے کو صحیح اور دوسرے عقائد کو غلط قرار دیتا ہے اور ایسا کرنا ایسے ٹھوس دلائل پہ مبنی ہوتا ہے کہ انسان اپنے عقائد کے علاوہ دوسرے تمام عقائد کو بُرا بھلا کہتا ہے اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے علاوہ تمام لوگوں کو برملا صلواتیں سناتا ہے۔ شاید اسی کو تعصب کہتے ہوں اور ممکن ہے کسی منطق کی رو سے اسے معقول قرار دیا جا سکے۔ بہرحال ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق عقیدہ اختیار کرنے کا حق ہے اور کوئی شخص یہ فطری حق چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح دوسروں کے متعلق اپنے طور پہ آزادانہ رائے رکھنے کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے البتہ یہ آخری شق عقل کو جچتی نظر نہیں آتی۔

اس انسانی فطرت کے پیش نظر اب ہم شیعہ کتب سے یہ بیان کرتے ہیں کہ شیعہ حضرات غیر شیعہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔

(۱) روضہ کافی ص۱۱

بہتر بلکہ ضروری ہے۔

ناصبی کی تعریف :۔

انوار نعمانیہ ١ : ١٨٥

ولعلك تقول ان مخالفينا يزعمون انهم لا يبغضون عليا وهذا زعم باطل وقد روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان علامة بغض على تقديم غيره عليه وتفضيله عليه۔

شاید تمہارا خیال ہو کہ ہمارے مخالف حضرت علی کو بُرا نہیں جانتے یہ خیال باطل ہے حقیقت یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے بغض علی کی علامت یہ بتائی ہے کہ حضرت علی پر کسی کو فضیلت دی جائے یا کسی کو مقدم سمجھا جائے (خلافت میں)

اور استبصار ١ : ١٠١

عن الصادق عليه السلام انه ليس الناصب من نصب لنا اهل البيت فانه لا تجد ولا يقول انا ابغض محمدا وآل محمد ولكن الناصب من نصب لكم وهو يعلم انكم تولونا وانتم شيعتنا۔

امام جعفر فرماتے ہیں ناصبی وہ نہیں جو ہم اہل بیت کی مخالفت کرے کیونکہ تو کوئی ایسا آدمی نہیں پائے گا جو کہے کہ میں محمدؐ اور آل محمدؐ سے بغض رکھتا ہوں بلکہ ناصبی وہ ہے جو تمہاری مخالفت کرے یہ جانتے ہوئے کہ تم ہمیں دوست رکھتے ہو اور ہمارے شیعہ ہو۔

اور ملا باقر مجلسی نے حق الیقین صفحہ ٦٨٨ پر بیان کیا ہے۔

"ابن ادریس نے کتاب سرائر میں کتاب مسائل محمد بن علی بن عیسیٰ سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے حضرت علی نقی کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ہم ناصبی کے جاننے اور پہچاننے میں اس سے زیادہ محتاج ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین پر ابوبکر و عمر کو مقدم جانے اور ان دونوں کی امامت کا اعتقاد رکھے حضرت نے جواب میں مرقوم فرمایا سو جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے وہ ناصبی ہے"

ان روایات میں ناصبی کا مفہوم بڑی وضاحت سے بیان ہُوا ہے اور وہ یہ ہے

(١) حضرت علی پر کسی دوسرے کو مقدم سمجھے یا فضیلت دے۔ مقدم سے مراد یہ ہے کہ حضرت علی سے پہلے جن حضرات کو خلافت ملی اس کو حق سمجھے۔

(٢) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو خلیفہ برحق سمجھے اور ان حضرات کو حضرت علی سے افضل سمجھے۔

یہ دونوں باتیں اہل السنت والجماعت کے عقیدہ کا حصہ ہیں لہٰذا شیعہ کے ہاں ناصبی کی اصطلاح سنی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور گذشتہ روایات میں آچکا ہے کہ ناصبی کتے سے بھی زیادہ نجس ہے اور دنیا کی دوسری غیر شیعہ آبادی کی طرح ولد الزنا ہے۔

سنیوں سے یہ بغض کیوں؟

سنیوں کو اپنی توجہات خصوصی کا نشانہ بنانے کی وجہ معلوم کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علل الشرائع ١ : ٣٧٧

عن ابى جعفر عليه السلام قال قال امير المؤمنين عليه السلام هلك الناس فى بطونهم وفروجهم لانهم لا يؤدون الينا حقنا الا ان شيعتنا من ذلك وابنائهم فى حل۔

امام باقر سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا لوگ ہر لحاظ سے ہلاک ہو گئے کیونکہ وہ ہمارا حق (خمس) ہمیں نہیں دیتے خوب سمجھ لو کہ ہمارے شیعہ اور ان کی اولاد حلالی ہیں۔

٢ - عن ابى جعفر قال قال امير المؤمنين عليه السلام حللهم من الخمس يعنى الشيعة ليطيب مولدهم۔

امام باقر نے فرمایا کہ حضرت علی کا ارشاد ہے شیعہ کے لیے خمس حلال ہے تاکہ انکی اولاد پاکیزہ یعنی حلالی ہو۔

مراد یہ ہے کہ خمس اہل بیت کا حق ہے اس لیے جو لوگ خمس ادا نہیں کرتے وہ اپنے مال کو حرام مال بنا لیتے ہیں سنی خمس ادا نہیں کرتے۔ اسی مال سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ نکاح میں مہر اسی مال سے دیتے ہیں اس لیے ان کا نکاح نہیں ہوتا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان کی اولاد پاکیزہ نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے غیر شیعہ کو امام نے اولاد البغایا اور اولاد الزنا کہا۔

اگر حلالی اور حرامی ہونے کا معیار یہی ہے تو تاریخی اعتبار سے ایک الجھن پیدا ہوتی ہے جیسے رجال کشی ص

عن ابی جعفر علیہ السلام قال کان الناس اھل الردۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا ثلاثۃ فقلت من الثلاثۃ فقال المقداد بن اسود وابو ذر الغفاری وسلمان الفارسی ثم عرف الناس بعد یسیر.

امام باقر فرماتے ہیں کہ رسول کریم کی وفات کے بعد تمام آدمی مرتد ہوگئے صرف تین باقی رہ گئے میں نے پوچھا وہ تین کون ہیں فرمایا مقداد بن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی بعد میں آہستہ آہستہ لوگوں تک حق پہنچا تو رفتہ رفتہ شیعہ ہونے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل شیعہ تو صرف تین ہیں۔ ان کی نسل جو آگے چلی وہ صحیح النسب اور پاکیزہ لوگ ہوئے دوسرے سنی رہے جنہیں شیعہ حضرات مرتد کہتے ہیں۔ اور سنی کا نام ناصبی ہے اور ناصبی حلالی نہیں ہوتا (بقول شیعہ) ان کی اولاد جو آگے چلی خواہ سنی ہوئے یا شیعہ وہ تو بدستور حلالی ہونے سے رہے۔ کیونکہ مذہب تو تبدیل ہو سکتا ہے مگر نسب تو نہیں بدل سکتا۔ اس لیے ان تین حضرات کی نسل کے بغیر سب شیعہ سنی ایک جیسے ہیں۔

دوسری الجھن یہ ہے کہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ حرامی کیلئے نجات ہے نہ جنت اس لیے بعد میں شیعہ ہونے کے باوجود نسب تو بدلا نہیں لہذا نجات اور جنت سے محروم ہی رہے لہذا شیعہ ہونے کا تکلف کرنا بے فائدہ ٹھیرا۔ لہذا تبلیغ دین بے کار مشغلہ ہے۔ تبلیغ سے عقائد ہی بدلیں گے اعمال ہی بدلیں گے نسب تو نہیں بدلے گا لہذا نجات ناممکن اور تبلیغ بیکار یہ حقیقت علل الشرائع ۲: ۵۶۴ پر واضح کی گئی ہے۔

عن الصادق قال یقول ولد الزنا یا رب ما ذنبی فما کان لی فی امری صنع قال فینادیہ مناد فیقول انت شر الثلاثۃ اذنب والداک فنبت علیھا وانت رجس

امام جعفر فرماتے ہیں ولد الزنا قیامت کے دن اللہ تعالے سے کہے گا الٰہی میرا کیا قصور ہے تو ایک منادی ندا کرے گا تم تینوں میں سے بدتر ہو تیرے والدین نے گناہ کیا تو پیدا ہوا اور تو ناپاک ہے اور

ولن یدخل الجنۃ الا طاھر

(ا) عن ابی عبد اللہ ان اللہ تعالی خلق الجنۃ طاھرۃ مطھرۃ فلا یدخلھا الا من طابت ولادتہ۔

جنت میں صرف پاک لوگ ہی داخل ہونگے

امام جعفر فرماتے ہیں اللہ تعالے نے جنت کو پاک بنایا اور جنت میں داخل وہی ہوگا جو پیدائش کے لحاظ سے پاک ہو۔

(ا) انوار نعمانیہ ص۲۹۴

والحق ان الاخبار متظافرۃ فی الدلالۃ علی سوء حالہ وانہ من اھل النار وروی الصدوق باسنادہ الی الامام ابی عبد اللہ جعفر بن محمد الصادق قال یقول ولد الزنا یا رب ما ذنبی فما لی فی امری صنع قال فینادیہ مناد فیقول انت شر الثلاثۃ الخ

اور حق یہ ہے کہ ولد الزنا کی بدحالی پر اور اس کے جہنمی ہونے پر کثیر احادیث ظاہر الدلالۃ ہیں اپنی سند کے ساتھ شیخ صدوق امام جعفر سے روایت کرتا ہے کہ ولد الزنا کہے گا الٰہی میرا کیا قصور ہے ...... الخ

(یہ روایت اوپر گذر چکی ہے)

ان روایات سے ظاہر ہے کہ شیعہ کے نزدیک تمام غیر شیعہ ذریۃ البغایا ہیں۔ ناصبی یعنی سنی نجس ترین مخلوق ہیں۔ جنت اور نجات صرف پاک لوگوں کیلئے ہے اور پاک صرف شیعہ ہیں۔

پاک و ناپاک کے سلسلے میں ایک عجیب روایت ملتی ہے۔

من لا یحضرہ الفقیہ باب المکان للحدث

دخل ابو جعفر الباقر الخلا فوجد لقمۃ خبز فی القذر فاخذھا وغسلھا ودفعھا الی مملوک معہ وقال یکون معک لاکلھا اذا خرجت فلما خرج قال للمملوک این اللقمۃ قال اکلتھا یا ابن رسول اللہ فقال انما استقرت فی جوف احد الا وجبت لہ الجنۃ

امام باقر بیت الخلا میں داخل ہوئے روٹی کا ایک ٹکڑا پاخانہ میں پڑا دیکھا۔ اٹھایا، دھویا اور اپنے غلام کو دیا کہا پاس رکھ جب میں باہر آؤں گا تو کھا لوں گا جب امام باہر آئے غلام سے وہ لقمہ طلب کیا غلام نے کہا وہ تو میں نے کھا لیا فرمایا جس شخص کے پیٹ میں یہ لقمہ گیا وہ جنتی ہو گیا پس

فاذھب انت حرا کرہ ان استخدم من اھل الجنۃ ۔

جاؤتم آزاد ہو میں جنتی کو خادم بنانا پسند نہیں کرتا۔

اس روایت سے معلوم ہوُا کہ:۔

(۱) گندگی میں لتھڑا ہوُا روٹی کا ٹکڑا صرف پاک ہی نہ ہوُا بلکہ پاک کرنے کی خاصیت بھی پیدا ہو گئی ۔

(۲) حصول جنت کا آسان ذریعہ ہاتھ آگیا۔ مگر روز روز کہاں بیت الخلاؤں میں روٹی کے ٹکڑے ملتے ہیں اور فلش سسٹم عام ہونے کی وجہ سے گندگی میں لتھڑا ہوُا ٹکڑا بھلا کہاں مل سکے گا گویا بقول غالب ع

آسان تو یہی ہے کہ آسان ہی نہیں

(۳) اس ٹکڑے کی برکت سے غلام کو دو نعمتیں مل گئیں غلامی سے نجات مل گئی اور جنت کی بشارت زندگی میں ہی مل گئی۔

(۴) امام ہمیشہ جہنمیوں سے خدمت لیا کرتے تھے جونہی کسی کے متعلق معلوم ہوُا کہ یہ جنتی ہے اس سے خدمت لینا بند کر دیا۔

علل الشرائع میں اس سے بھی عجیب تر ایک روایت ملتی ہے ۔

عن علی بن الحسین قال ان المخلوق لایموت حتی تخرج منہ النطفۃ التی خلقھا اللہ تعالیٰ منھا من فیہ اومن غیرہ ۔ صـ۲۹۹

امام زین العابدین سے روایت ہے کہ ہر پیدا ہونے والا جب مرتا ہے تو اس کے منہ سے وہ نطفہ نکلتا ہے جس سے وہ پیدا ہوُا۔

یہی روایت فروع کافی ۱: ۸۵ پر بھی موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ نطفہ قطرۂ منی کو کہتے ہیں ، اور اسی سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ نطفہ سے علقہ بنتا ہے علقہ سے مضغہ بنتا ہے پھر ترقی کرتے کرتے پوری انسانی شکل اختیار کرتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مرتے وقت پھر لوٹ کر نطفہ بن جاتا ہے اور انسان کے منہ کے راستے باہر نکلتا ہے یہ تو دیکھا گیا ہے کہ مختلف آدمیوں کے منہ سے مرتے

وقت مختلف باتیں نکلتی ہیں اور اہل ایمان کے منہ سے کلمہ شہادت نکلتا ہے ممکن ہے شیعہ کے منہ سے نطفہ یعنی قطرۂ منی ہی نکلتا ہے۔ بہر حال منہ سے پاک شے ہی نکلے تو اچھا ہے۔

دینِ اسلام اور دینِ شیعہ

دین کے اجزائے ترکیبی ایمان اور عمل صالح ہیں۔ ایمان یا عقیدہ بنیاد یا بیج کی حیثیت رکھتا ہے اسی پر زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور اسی سے ایک پھلنے پھولنے والا درخت نشو و نما پاتا ہے۔ دین اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سامنے انسان کی پوری زندگی ہے یعنی حیات دنیوی اور حیات اخروی۔ اور اسلام کی رہنمائی کا انداز یہ ہے کہ انسان کو حیات دنیوی بسر کرنے کا وہ سلیقہ سکھائے کہ اس کی حیات اخروی راحت اور چین سے گزرے۔ گویا اصل مقصد حیات اخروی کی کامرانی ہے جس کا واحد ذریعہ حیات دنیوی اس انداز سے گزارنا ہے جس کی رہنمائی اسلام کرتا ہے۔

اسلام کے کچھ بنیادی عقائد ایسے ہیں جن کے قبول کرنے سے انسان اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے اور ان کا انکار کرنے سے انسان اس دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ بنیادی عقائد ضروریات دین کی فہرست میں آتے ہیں۔ اب ہم کتب شیعہ سے اس سلسلے میں کچھ تصریحات پیش کرتے ہیں۔

(۱) انوار نعمانیہ ۲ : ۳۳۹

المراد من الدين الماخوذ في التعريف هو دين الاسلام على ما صرحوا به لا

تعریف میں جو مذکور ہے وہ دین اسلام ہے جیسا کہ تصریح کرچکے ہیں نہ کہ فقط دین

دين الشيعة فقط وذلك انه لو كان المراد بالمرتد من انكر ما علم ثبوته من دين الشيعة ضرورة لكان مخالفونا كلهم مرتدين في هذه الدنيا لان كون علي ابن ابي طالب هو الخليفة الاول بالنص والاستحقاق مما ثبت من دين الشيعة ضرورة فكان يجب ان يحكم على عامة اهل الخلاف بالارتداد والمصرح به من علمائنا بخلافه۔

شیعہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر دین سے دین شیعہ مراد لیں تو مرتد سے مراد ہر وہ شخص ہوگا جو اس بات کا انکار کرے جو دین شیعہ کی ضروریات سے ہو اس طرح شیعہ کے تمام مخالفین مرتد ثابت ہوں گے۔ کیونکہ حضرت علی کا خلیفہ اوّل ہونا استحقاق اور نص دونوں سے ثابت ہے جو دین شیعہ کی ضروریات سے ہے پس واجب ہوگا کہ شیعہ کے تمام مخالفین پر مرتد کا حکم لگایا جائے اور ہمارے شیعہ علماء اس کے خلاف تصریح کرچکے ہیں۔

اس وضاحت سے ثابت ہوا کہ شیعہ کے نزدیک۔

(۱) دین سے مراد دین اسلام ہے۔ دین شیعہ نہیں۔
(۲) دین اسلام میں ضروریات دین اور ہیں اور دین شیعہ میں اس سے مختلف ہیں۔
(۳) ضروریات دین کے اختلاف کی وجہ سے دین اسلام اور دین شیعہ دو مختلف چیزیں ہیں۔
(۴) حضرت علی کو خلیفہ اوّل تسلیم کرنا دین شیعہ کی ضروریات میں سے ہے دین اسلام کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔
(۵) حضرت علی کے خلیفہ اوّل ہونے کا انکار کرنے سے انسان مرتد نہیں ہوتا یعنی دین اسلام سے خارج نہیں ہوتا، ہاں دین شیعہ سے خارج ہوجاتا ہے۔ یعنی آدمی کا مسلمان ہونا اور چیز ہے اور شیعہ ہونا چیزے دیگر۔
(۶) شیعہ علماء اس کی تصریح کرچکے ہیں۔

۲۔ انوار نعمانیہ ۱ : ۲۷۶

اما داى الكفر) في اصطلاح فقهائنا

شیعہ فقہا کی اصطلاح میں کفر سے مراد یہ

رضوان اللہ علیہم فالکافر من جحد من دین الاسلام ضرورۃ کمن انکر الصلوٰۃ والزکوٰۃ و الصوم والحج ونحوھا واما ما ذکر من دین الشیعۃ بالضرورۃ لامن دین الاسلام کتقدیم امیر المؤمنین بالخلافۃ والفضیلہ وتکفیر من نخلف محلہ فھی لیس بمؤمن لکنہ لا یخرج عندہم عن دین الاسلام۔

ہے کہ آدمی ضروریات دین اسلام سے انکار کرے جیسے نماز اور حج وغیرہ۔ اور جو شخص ان چیزوں کا انکار کرے جو ضروریات دین شیعہ سے ہیں مگر ضروریات دین اسلام سے نہیں مثلاً خلافت میں کسی کو حضرت علی پر مقدم ماننا یا کسی کو ان پر فضیلت دینا تو وہ دین شیعہ سے خارج ہے مگر دین اسلام سے خارج نہیں۔

اس تصریح کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) دین اسلام کی ضد کفر ہے۔ دین شیعہ کی ضد کفر نہیں۔

(۲) دین شیعہ کوئی مختلف فقہی مسلک نہیں بلکہ ایک مختلف دین ہے۔

(۳) دین اسلام اور دین شیعہ میں ضروریات دین ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

(۴) خلافت میں حضرت علی کی تقدیم اور فضیلت کا عقیدہ رکھنا دین اسلام کا حصہ نہیں بلکہ شیعہ کی ضروریات دین میں سے ہے۔

(۵) حضرت علی کو خلیفہ اول تسلیم نہ کر کے بھی آدمی مسلمان رہتا ہے ہاں شیعہ نہیں رہتا۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک امر وضاحت طلب ہے کہ دین اسلام کی دعوت تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ اسلام کے عقائد عبادات معاملات اور ضروریات دین نبی کریمؐ کو بذریعہ وحی اللہ تعالٰے کی طرف سے ملے اور آپ نے اپنے شاگردوں کو وہ احکام سکھلائے سنائے ان پر عمل کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ اور اپنے سامنے ان پر عمل کرایا اسلام کی اصولی تعلیمات پوری جامعیت کے ساتھ قرآن کریم کی صورت میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں ان احکام میں جو باتیں ضروریات دین کی حیثیت رکھتی ہیں اللہ کے آخری رسولؐ نے ان کی نشاندھی کر دی۔ ان کا انکار کفر ہے۔ انسان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور حضرت علی کو خلیفہ اوّل تسلیم کرنا اللہ کے رسولؐ نے ضروریات دین اسلام میں داخل نہیں کیا اسی لیے شیعہ محدث الجزائری کہتے ہیں کہ اس کے انکار سے آدمی اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ہاں دین شیعہ سے خارج ہو جاتا ہے تو جو چیزیں ضروریات دین شیعہ ہیں ان کو ضروریات میں شامل کس نے کیا۔ اللہ کے رسولؐ نے تو شامل نہیں کیا ورنہ انکے انکار سے آدمی کافر ہو جاتا۔

دین شیعہ جب دین اسلام سے الگ چیز ہے جیساکہ شیعہ علماء تصریح کر چکے ہیں تو دین شیعہ کا داعی کون ہے؟ اس کا بانی کون ہے؟ اس کو یہ دین اور اس کے عقائد کہاں سے ملے؟

رجال کشی صاے کی عبارت پیش کر کے ذکر کیا جا چکا ہے کہ دین شیعہ کے اعظم رکن دو ہیں امامت اور تبرا بازی۔ اور یہ دونوں عبداللہ بن سبا یہودی نے ایجاد کئے شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین شیعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین نہیں بلکہ عبداللہ بن سبا یہودی کا ایجاد کردہ دین ہے جس کا بہت سا حصہ اس یہودی نے یہودیت سے مستعار لیا۔

عبداللہ بن سبا نے اس مذہب کی بنیاد سطحی جذباتیت نعرہ بازی اور سیاسی پارٹی بازی پر رکھی۔ دین کے اصولی اور فروعی مسائل کا وہاں کوئی نشان نہیں ملتا۔ بلکہ اصول کافی میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ

کانت الشیعۃ قبل ان یکون ابو جعفر علیہ السلام لا یعلمون حلالھم وحرامھم

امام باقر سے پہلے شیعہ کو اپنے مذہب کے حلال و حرام کا کوئی علم نہیں تھا۔

اور عقائد ہوں یا عبادات معاملات ہوں یا اخلاق حلال و حرام میں خط فاصل کھینچنا اور امتیاز کرنا ہی دین کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور وہ بنیاد امام باقر سے پہلے موجود نہیں تھی۔ اور شیخ مرتضٰی نے فرائد الاصول میں تصریح کر دی ہے کہ دین شیعہ یقیناً ائمہ سے ماخوذ نہیں ہے۔ جب رسولؐ سے ماخوذ بھی نہیں اور ائمہ سے ماخوذ بھی نہیں تو پھر کس سے ماخوذ ہے۔ یہ ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب تاریخ سے تلاش کرنا پڑے گا۔

دین شیعہ کے ماخذ کون سے ہیں

قاعدہ ہے کہ الہامی یا آسمانی مذہب کی بنیاد وہ تعلیمات ہوتی ہے جو وحی والہام کے ذریعے اللہ کی طرف سے اللہ کے رسول کو پہنچتی ہیں چنانچہ انبیاء کرام پر آسمانی کتابیں اور آسمانی صحیفے نازل ہوتے رہے۔ اور اللہ کے آخری نبی کے ذریعے آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کی صورت میں انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی۔ یہ کتاب دین اسلام کا پہلا اور بنیادی ماخذ ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم اس لیے دین اسلام میں قرآن مجید پر ایمان لانا اور اسے پہلا مستند اور بنیادی ماخذ تسلیم کرنا ضروری ہے۔

دین شیعہ اگر الہامی اور آسمانی مذہب سمجھا جائے تو اس کیلئے آسمانی کتاب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور آسمانی کتاب قرآن مجید کے بعد کوئی نازل نہیں ہوئی اس لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد بھی قرآن پر ہے۔ مگر شیعہ کلھم اس کی تردید کرتے ہیں اور موجودہ قرآن کو اصل اور صحیح آسمانی کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ

فصل الخطاب ص ۲۱۱

١ - الاخبار الكثيرة المعتبرة الصحيحة الصريحة في وقوع السقط ودخول النقصان في الموجود من القرآن على ما ذكر في ضمن الادلة السابقة وانه اقل من تمام ما نزل اعجازا على قلب سيد الانس والجان من غير اختصاصها باية او سورة وهي متفرقة في الكتب المعتبرة التي عليها المعول عند الاصحاب جمعت على ما عثرت عليها في هذا الباب

بہت سی حدیثیں جو معتبر ہیں موجودہ قرآن میں کمی اور نقصان پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔ علاوہ ان احادیث کے جو دلائل سابقہ کے ضمن میں بیان ہوچکی ہیں اور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موجودہ قرآن اس مقدار سے بہت ہی کم ہے جو نبی کریم کے قلب اطہر پر نازل ہوا تھا۔ اور یہ کمی کسی آیت یا کسی سورۃ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ حدیثیں ان متفرق

کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں جن پر ہمارے مذہب کا اعتماد ہے اور شیعہ مذہب کا مرجع ہیں میں نے وہ حدیثیں جمع کردی ہیں جو میری نظر سے گذری ہیں۔

(۱) قرآن موجودہ کے متعلق جو حدیثیں بتائی ہیں کہ یہ مقدار کے لحاظ سے اس قرآن کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے جو حضور اکرم پر نازل کیا گیا ان حدیثوں کے اوصاف یہ ہیں اوّل کثیر ہیں یعنی چند ایک نہیں۔ دوم معتبر ہیں ناقابل التفات نہیں سوم صریح ہیں یعنی صاف صاف بتاتی ہیں کوئی ابہام نہیں۔

(۲) یہ کمی کسی خاص سورۃ یا آیت میں نہیں بلکہ پورے قرآن میں جا بجا کمی واقع ہوئی ہے۔

(۳) اس کمی کی نشاندہی ان کتابوں میں ہوتی ہے جو معتبر ہیں اتنی معتبر کہ ان پر شیعہ مذہب کا مدار ہے۔

پھر اسی طرح فصل الخطاب ص ۲۳۹

٢ - وعندي ان الاخبار في هذا الباب متواترة معنى وترك جميعها يوجب رفع الاعتماد عن الاخبار رأسا بل ظني ان الاخبار في هذا الباب اعتماد عن اخبار الامامة فكيف يثبتونها بالخبر۔

میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں معنیً متواتر ہیں اور ان سب کو ترک کر دینے سے ہمارا تمام ذخیرۂ احادیث بے اعتبار ہو جائے گا بلکہ میرا خیال ہے کہ تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت کی روایتوں سے کم نہیں۔ اگر تحریف قرآن کی روایتوں کا اعتبار نہ کیا جائے تو مسئلہ امامت بھی روایتوں سے ثابت نہ ہوگا۔

(۱) اس اقتباس میں تحریف قرآن کی روایتوں کا ایک وصف بیان ہوا کہ وہ متواتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ متواترات کا انکار کفر ہے لہٰذا تحریف قرآن کا انکار بھی کفر ٹھہرا۔

(۲) یہ روایتیں اس پایہ کی ہیں کہ ان پر اعتبار نہ کیا جائے تو شیعہ کا سارا ذخیرۂ احادیث

بے کار ہو جاتا ہے۔

(۳) تحریف قرآن کی روایتیں ان روایتوں سے کسی طرح کم نہیں جن سے امامت کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔

(۴) اگر تحریف قرآن کو تسلیم نہ کیا جائے تو امامت کے عقیدہ سے دست بردار ہونا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ مسئلہ امامت تو دین شیعہ کی جان ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا کہ موجودہ قرآن اصل قرآن نہیں اتنا ہی ضروری ہے جتنا امامت کے عقیدہ کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جب امامت کا منکر دین شیعہ سے خارج ہے تو تحریف قرآن کا منکر بھی دین شیعہ سے خارج ہے۔

۳۔ اصول کافی ص۶۷۱ باب النوادر

ان القرآن جاء به جبرائيل الى محمد سبعة عشر الف آية ۔

جو قرآن جبرائیل لیکر حضور اکرم کے پاس آئے وہ سترہ ہزار آیت کا تھا۔

اور فصل الخطاب ص۱۱۴ پر ہے" کہ موجودہ قرآن مشہور مذہب کے مطابق ۶۲۳۶ آیت کا ہے۔

یعنی موجودہ قرآن اصل قرآن کا قریباً ایک تہائی حصہ ہے اور قریباً دو تہائی ضائع ہوگیا ہے اور موجودہ قرآن کے متعلق بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں کیا تبدیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا موجودہ قرآن نہ لائق اعتبار رہے نہ قابل حجت۔

شیعہ کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح نقلاً ثابت ہے کہ قرآن موجودہ محرف ہے اسی طرح عقلاً بھی اس کے محرف ہونے میں شک نہیں۔

مرآت العقول ۱: ۱۷۱

والعقل يحكم بانه اذا كان القرآن متفرقا منتشرا عند الناس وتصدى غير المعصوم لجمعه يمتنع عادة ان يكون جمعه كاملا موافقا للواقع ۔

اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ جب قرآن کے اجزا مختلف لوگوں کے پاس بکھرے پڑے تھے اور ان اجزا کے جمع کرنے کا کام غیر معصوم نے کیا تو عادتاً ممنوع ہے کہ قرآن ٹھیک ٹھیک بغیر کسی کمی بیشی کے جمع ہوا۔

شیعہ کتب سے قرآن مجید کے محرف ہونے کے متعلق چھ امور ملتے ہیں۔

(۱) روایات تحریف کثیر ہیں دو ہزار سے زائد ہیں اور روایات امامت سے کم نہیں۔

(۲) یہ روایات تحریف قرآن پر صاف دلالت کرتی ہیں۔

(۳) یہ روایات متواتر ہیں۔

(۴) ان روایات کی بنیاد پر شیعہ حضرات تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

(۵) یہ روایات ان کتب شیعہ میں ہیں جن پر شیعہ مذہب کا مدار ہے۔

(۶) قرآن کا محرف ہونا جیسا نقلاً ثابت ہے ویسا ہی مطابق عقل بھی ہے۔

اس وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ موجودہ قرآن کو شیعہ صحیح آسمانی کتاب نہیں مانتے لہٰذا اسے شیعہ مذہب کا ماخذ تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اصل قرآن امام غائب کے پاس ہے وہ آئے گا تو قرآن لائے گا تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن آئے اس سے اپنے مذہب کے مسائل نکال کر پیش کیجئے اور انکی تبلیغ کیجئے۔ جب کتاب ہی موجود نہیں تو لوگوں کو دین بے کتاب کی دعوت دینے میں کیا تُک ہے۔

اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ شیعہ مذہب الہامی اور آسمانی دین نہیں بلکہ انسانوں کی دماغی اختراع ہے تو پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ انسانوں کو آزادی ہے جو عقائد چاہیں اختراع کرلیں۔

کتاب اللہ کے بعد دین اسلام کا دوسرا ماخذ کتاب اللہ کی وہ علمی تفسیر ہے جو نبی کریمؐ نے اپنے صحابہ کو سکھائی جو حضورؐ کے براہ راست شاگرد تھے اور کتاب اللہ کی وہ عملی تعبیر ہے جو حضورؐ نے اپنے عمل سے پیش کی اور صحابہ کی زندگیوں کو اس سانچے میں ڈھالا جسے سنت رسولؐ کہتے ہیں اور جو احادیث کے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

سنت نبویؐ کو اس صورت میں دین کا ماخذ اور حجت قرار دیا جا سکتا ہے جب نبیؐ کو معصوم عن الخطا تسلیم کیا جائے اور مانا جائے کہ مخلوق میں سے کوئی ہستی حضورؐ کے فیصلہ کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ اور قرآن مجید کی جو قولی تشریح اور عملی تعبیر آپ نے پیش فرمائی اسے حرف آخر سمجھا جائے۔ اس سے سرمو انحراف کرنا دین سے انحراف کرنے

کے مترادف تسلیم کیا جائے مگر شیعہ کے نزدیک امام ایک ایسی ہستی ہے جو نبی کے فیصلہ کو بدل سکتی ہے۔ نبی نے کسی امر کو حلال قرار دیا ہے تو امام اسے حرام قرار دے سکتا ہے۔ اور نبی نے کسی امر کو حرام قرار دیا ہے تو امام اسے حلال قرار دے سکتا ہے۔ چنانچہ اصول کافی میں امام جعفر سے روایت ہے۔

ما جاء به علیّ اخذ به وما نهی عنه انتهی عنه جری له من الفضل مثل ما جری لمحمد ص۱۱۷	میں ان احکام پر عمل کرتا ہوں جو حضرت علی لائے ہیں اور ان کاموں سے باز رہتا ہوں جن سے انہوں نے منع کیا ان کا مرتبہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ منصب رسول کریم کو دیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا۔ اور صاحب اصول کافی امام جعفر سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ مقام حضرت علی کو حاصل ہے جو شیعہ کے نزدیک پہلے امام ہیں۔ مرتبہ اور مقام دونوں کا برابر سہی لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعد میں آنے والے پہلوں کے فیصلوں کو منسوخ کرسکتے ہیں۔ لہٰذا شیعہ کے نزدیک دین کا ماخذ امام کی ذات ہے۔

پھر اصول کافی میں ائمہ کے متعلق ایک ضابطہ بیان ہوا ہے۔

فهم يحلون ما يشاؤن ويحرمون ما يشاؤن ص۲۷۸	ائمہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں جسے چاہیں حرام قرار دیں۔

پھر مختصر بصائر الدرجات میں امامت کا منصب بیان کرتے ہوئے بتایا کہ امام مہدی ظاہر ہوں گے تو

اول من بايعه محمد رسول الله۔	سب سے پہلے محمد رسول اللہ امام مہدی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ بیعت کرنے والا لازماً اس سے کم درجہ کا ہوتا ہے جس کے ہاتھ پر وہ بیعت کرے جیسے مرید مقلد ہوتا ہے اور شیخ مقتدا ہوتا ہے۔ مطیع کے مقابلے میں مطاع کو ہی حجت قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا دین شیعہ کا ماخذ سنت نبوی کو بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

کیونکہ نبی کے اوپر ایک اور اتھارٹی امام جو موجود ہے۔

دین اسلام کا تیسرا ماخذ ان مقدس ہستیوں کا تعامل ہے جنہوں نے براہ راست نبی کریم سے اللہ کی کتاب سنی، اس کی تفسیر اور تشریح خود نبی کریم کی زبان حقیقت ترجمان سے سنی۔ اور ان احکام کی عملی تعبیر جو نبی کریم نے پیش فرمائی یہ لوگ اس کی زندہ مثالیں بن کر رہ گئے اور ان ہی لوگوں نے یہ علمی سرمایہ اور یہ عملی نمونہ مشرق سے مغرب تک پھیلایا ان شاگردان رسول کے قول و فعل کو ذخیرہ احادیث میں محفوظ کرلیا گیا۔ اور خود اللہ تعالیٰ نے اس مقدس جماعت کو بعد میں آنے والوں کے لیے مثال اور نمونہ قرار دیا کما قال تعالیٰ۔

والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار

والذين اتبعوهم باحسان۔ رضی اللہ عنہم الخ

اور حضور اکرم نے اپنے شاگردوں کو معیار ہدایت قرار دیتے ہوئے فرمایا ما انا علیہ و اصحابی اور حضور اکرم نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی تاکید فرماتے ہوئے فرمایا علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين اور حضور اکرم کے شاگردوں نے اللہ کا دین، دین اسلام۔ اللہ کے بندوں تک پہنچانا اپنا مقصد حیات صحیحہ رکھا تھا اور یہ تعداد میں چند ایک نہیں تھے بلکہ ہزاروں تھے جیسا کہ اصابہ ص۱۲۶

تعداد ما واذا توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن سمع منه زيادة على مائة الف انسان من رجل وامرأة كلهم قد روى عنه سماعا ورؤية۔	حضور کی وفات کے وقت رواۃ حدیث کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی ان میں مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ ان تمام نے نبی کریم کی حدیثیں بیان فرمائیں اور کچھ دوسرے صحابہ سے سن کر بیان فرمائیں۔

ان سب کا ایک ہی عقیدہ تھا ایک جیسے اعمال اور ایک ہی قسم کی عبادات تھیں اگر کوئی اختلاف تھا تو بمقتضائے فہم و رائے تھا۔ چنانچہ حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ میں اختلاف رائے کے باوجود حضرت علی نے علی الاعلان فرمایا

والظاهر ان ربنا واحد ونبينا واحد و	اور ظاہر ہے کہ امیر معاویہ وغیرہ کا اور

دعوتنا فی الاسلام واحدة ولا نستزیدہم فی الایمان باللہ والتصدیق برسول اللہ ولا یستزیدونا الامر واحد۔ (نہج البلاغہ ۳۰: ۱۲۵)

ہمارا رب ایک ہے نبی ایک ہے اور اسلام کی دعوت ایک ہے اللہ اور رسول پر ایمان لانے میں نہ ہم ان سے زائد ہیں نہ وہ ہم سے زائد ہیں بات ایک ہی ہے۔

حضرت علی کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ تمام صحابہ کا مذہب ایک ہی تھا۔ حضرت علی کا مذہب دوسرے صحابہ سے جدا نہیں تھا۔ ہاں جسے حضرت علی کی بات پسند نہ آئے یا ان کو سچا نہ سمجھے تو پھر جو چاہے کہتا پھرے۔

دین شیعہ میں اس مقدس گروہ کا تعامل بھی حجت نہیں اس لیے ماخذ دین بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک اس گروہ کا تجزیہ یہ ہے۔

عن ابی جعفر قال کان الناس اهل الردة الا ثلثة فقلت من الثلاثة فقال المقداد بن الاسود ابوذر الغفاری وسلمان الفارسی۔ (رجال کشی ص۴)

امام باقر فرماتے ہیں کہ تمام لوگ مرتد ہو گئے تھے صرف تین رہ گئے۔ راوی نے سوال کیا وہ تین کون تھے۔ فرمایا مقداد، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ صرف تین آدمی حضور اکرمؐ کی نبوت کے عینی شاہد رہ گئے جنکی بات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اگر ان کو دین شیعہ کا ایک ماخذ تسلیم کیا جائے تو عقائد، عبادات اور معاملات میں ان تین حضرات کی روایات کثرت سے ہونی چاہئیں مگر آج تک شیعہ کے پاس ان تین حضرات کی پانچ پانچ روایات موجود نہیں ہیں۔

پھر ان تین حضرات کا یہ حال تھا کہ اپنے دل کی بات اور اپنا عقیدہ اپنے ہم مذہب بھائی کو بھی نہیں بتاتے تھے دوسروں کو دین کیا پہنچاتے۔ چنانچہ اصول کافی میں ہے۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ذکرت التقیة یوما عند علی بن الحسین فقال واللہ لو علم

امام جعفر سے روایت ہے کہ ایک روز امام زین العابدین کے پاس تقیہ کا ذکر چھڑ گیا امام نے فرمایا خدا کی قسم اگر ابوذر کو سلمان

ابوذر ما فی قلب سلمان لقتله ولقد آخا رسول اللہ بینهما فما ظنکم بسائر الخلق (ص۲۵۴)

کے دل کی بات معلوم ہو جاتی تو اسے قتل کر دیتا۔ حالانکہ ان دونوں کو حضورؐ نے بھائی بنایا تھا تو باقی مخلوق کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

اور رجال کشی ص۔ پر ہے۔

عن ابی بصیر قال سمعت ابا عبد اللہ یقول قال رسول اللہ یا سلمان لو عرض علمك علی مقداد لکفر یا مقداد لو عرض علمك علی سلمان لکفر۔

ابو بصیر کہتا ہے میں نے امام جعفر سے سنا وہ کہتے تھے حضور اکرمؐ نے فرمایا اے سلمان اگر تمہارا علم مقداد کو معلوم ہو جائے تو وہ کافر ہو جائے اور اے مقداد تمہارا علم سلمان کے سامنے پیش ہو تو وہ کافر ہو جائے۔

پہلی روایت سے ظاہر ہے کہ ابوذر اور سلمان کے عقائد اس قدر مختلف تھے کہ ایک دوسرے پر ظاہر ہوتے تو وہ قتل کر دیتے۔ اور قتل ارتداد کی سزا ہے تو یہ حضرات ارتداد سے کیونکر بچے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہے کہ ان تینوں کے عقائد اتنے مختلف تھے کہ اگر ظاہر ہو تو ہر ایک، دوسرے کی نگاہ میں کافر ہوتا۔ لطف یہ کہ حضور اکرمؐ کو اس کا علم بھی تھا اور آپ نے انکی اصلاح بھی نہیں فرمائی۔

اہل الردہ والی روایت سے ایک حقیقت واضح ہو گئی مگر ایک پیچ بھی پڑ گیا۔ یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک حضور اکرمؐ کے بعد تمام صحابہ یعنی تمام مسلمان دو گروہوں میں حقیقت بٹ گئے۔ ایک گروہ میں تین صحابی سلمان مقداد اور ابوذر، دوسرے میں باقی تمام صحابہ۔

پہلے گروہ نے اپنا عقیدہ اور اپنا دین اپنے کسی بھائی کے سامنے بیان نہ کیا، ہمیشہ جھوٹ بولتے رہے البتہ ان کے جھوٹ کا نام تقیہ ہے۔ دوسرا عظیم گروہ اسلام کے دعویٰ کے ساتھ مسلمان معاشرہ میں شمار ہوتا رہا اور ہمیشہ جھوٹ ہی بولتا رہا ان کے جھوٹ کا نام نفاق ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین رسولؐ ان دو جھوٹوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔ اور معاذ اللہ حضور اکرمؐ نے ۲۳ برس کی محنت شاقہ کے باوجود ایک آدمی بھی تیار نہ کیا جو سچی بات کر سکے۔

نتیجہ یہ کہ دین اسلام تو حضورؐ کی اس دنیوی زندگی تک محدود رہا۔ پھر جھوٹوں کے سوا

کوئی بچا نہیں تھا تو دین کون پھیلاتا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پس یہ پڑ گیا کہ ارتداد سے صرف تین بچے ان میں حضرت علی حضرت فاطمہ اور اہل بیت کا نام نہیں وہ کس کھاتے میں ڈالے گئے۔ اگر ان پر "الناس" کا اطلاق ہوتا ہے تو ارتداد کی زد سے بچے کیسے؟ اور اگر یہ "الناس" میں شامل نہیں تو کیوں نہیں؟

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ دین شیعہ کا ماخذ نہ کتاب اللہ ہے نہ سنت رسولؐ ہے نہ تعامل صحابہ ہے ہاں لے دے کے ایک ماخذ معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے امام کی ذات۔ آئیے اب اس کا جائزہ لیں۔

امامت کے سلسلے میں سرفہرست حضرت علی کا نام آتا ہے۔ یہ حقیقت گذشتہ ابواب میں واضح کی جاچکی ہے کہ حضرت علی کو خلفائے ثلثہ کے بعد اقتدار ملا۔ وہ با اختیار حاکم تھے مگر انہوں نے اپنے سارے دور اقتدار میں کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو خلفائے ثلثہ کے عمل کے خلاف ہو کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا جو خلفائے ثلثہ کے کسی حکم کے خلاف ہو معلوم ہوا کہ حضرت علی اسی دین پہ زندہ رہے اسی پر وفات پائی جو خلفائے ثلثہ نے نبی کریمؐ سے سیکھا اور دنیا میں پھیلایا البتہ ایک پہلو توجہ طلب یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت علی نے معاشرہ کے دباؤ کے تحت دین اسلام کے خلاف نہ کچھ کیا نہ کہا ہو مگر خفیہ طور پر ایسے شاگرد تیار کئے ہوں جنہیں دین شیعہ کی تعلیم دی۔ کیونکہ آپ شیر خدا تو تھے ہی۔ اس امر کا کچھ سراغ ملتا ہے

چنانچہ احتجاج طبرسی ص۴۹

ما من الامة احد بایع مکرھا غیر علی و اربعتنا۔

امت محمدیہ میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس نے حضرت ابوبکر کی خوشی سے بیعت نہ کی ہو۔ سوائے حضرت علی اور ہمارے چار آدمیوں کے۔

ظاہر ہے کہ یہ چار آدمی تو حضرت علی سے کسب فیض کرتے رہے ہوں گے اور دین شیعہ کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ مگر وہ چار کون تھے؟ یہ عقدہ رجال کشی کی ایک روایت سے حل ہوتا ہے۔

ثم ینادی منادا این حواری علی ابن ابی طالب وصی محمد بن عبد اللہ رسول اللہ فیقوم عمرو ابن الحمق الخزاعی و محمد ابن ابی بکر و میثم بن یحیی التمار مولی بنی اسد و اویس القرنی (رجال کشی ص۶)

پھر قیامت کے دن منادی ندا کرے گا کہاں ہیں علی ابن ابی طالب وصی رسولؐ کے حواری تو عمرو بن الحمق، محمد بن ابی بکر، میثم اور اویس قرنی کھڑے ہو جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن یہ چار آدمی حضرت علی کے حواری کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے ظاہر ہے کہ یہی جنتی ہوں گے۔ اس لیے یہی حضرت علی کے وہ شاگرد ہو سکتے ہیں جنہیں شیر خدا نے انسانوں سے ڈر کے مارے خفیہ طور پر دین شیعہ سکھایا ہوگا۔ ان چار آدمیوں سے کم از کم پانچ احادیث مرفوع، نبی کریمؐ سے ملنی چاہئیں۔ مگر شیعہ کتب میں کہیں نہیں ملتیں دوسری بات کہ ان چار سے کوئی بات آگے چلتی ہے تو ان سے تواتر نہیں چلتا۔ جب مذہب میں تواتر نہ رہا تو وہ باطل ہو گیا۔

یہاں ایک اور الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تین آدمی جو ارتداد سے بچ نکلے تھے وہ قیامت کے دن حضرت علی کے حواریوں میں نہیں کھڑے ہوں گے۔ پھر ان کا کیا حشر ہوگا۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ دین شیعہ پہلے امام سے تو ماخوذ نہیں ہے۔ دوسرے امام حضرت حسن ہیں ان کے متعلق رجال کشی میں بیان ہوا ہے۔

ثم ینادی منادا این حواری الحسن بن علی بن فاطمہ بنت محمد بن عبد اللہ رسول اللہ فیقوم سفیان بن ابی لیلی الھمدانی و حذیفہ بن اسید الغفاری (ص۶)

پھر منادی ندا کرے گا کہاں ہیں حسن بن علی کے حواری تو سفیان ہمدانی اور حذیفہ غفاری کھڑے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ دوسرے امام کے حواری صرف دو رہ گئے۔ ان میں سے بھی ایک کا معاملہ مشتبہ ہے رجال کشی ص۷۳ پر ہے کہ جب حضرت حسن نے امیر معاویہؓ سے صلح کر لی تو سفیان نے حضرت حسن کو کہا السلام علیک یا مذل المؤمنین یعنی سفیان نے امام کے فعل کو ذلیل فعل کہا اور اصول کافی میں اس عنوان سے پورا باب باندھا ہے کہ امام جو کام کرتا ہے بحکم خدا کرتا ہے اس لیے امام نے امیر معاویہ سے صلح بحکم خدا کی۔ اور سفیان نے خدا کے حکم کو ذلیل کہا تو مسلمان کیسے رہا۔ تو دوسرے امام کا اکلوتا حواری صرف حذیفہ رہ گیا۔ اگر

دین شیعہ کا ماخذ دوسرے امام کی تعلیمات ہوں۔ تو اصولاً تمام روایات جن پہ دین شیعہ کا مدار ہے انکی سند حذیفہ عن حسن عن علی ہونی چاہیے مگر کتب شیعہ میں یہ بات نہیں ملتی۔ اس لیے معلوم ہوا کہ دین شیعہ دوسرے امام سے بھی نہیں چلا۔

تیسرے امام حضرت حسین کے متعلق رجال کشی میں ذکر ہے۔

ثم ینادی مناد این حواری الحسین بن علی بن ابی طالب فیقوم من استشهد ولم یتخلف (ص)

پھر منادی پکارے گا کہاں ہیں حسین بن علی کے حواری تو ہر وہ شخص کھڑا ہوگا جو حسین کے ہمراہ کربلا میں شہید ہوا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام حسین کے متبع وہی لوگ تھے جو کربلا میں شہید ہو گئے اگر کوئی بچ رہا تو مرتد یا غیر ناجی ہے۔ بس دین شیعہ اگر تیسرے امام سے خود تسلیم کیا جائے تو انکی شہادت کے ساتھ دین شیعہ بھی ختم ہوگیا کیونکہ ان کے پیرو تو ان کے ساتھ شہید ہو گئے۔ باقی تو قاتلین ہی رہ گئے۔ قاتلین حسین سے بھلا دین حسین کیسے اشاعت پذیر ہوسکتا ہے ایسے ہی دین کے شیدائی ہوتے تو حسین کو خود گھر بلا کر قتل کیوں کرتے۔

معلوم ہوا کہ تیسرے امام کی شہادت تک دین شیعہ منصۂ شہود پر نہ آسکا ہاں وہ دین جو رسول کریم لائے تھے وہ تو صحابہ کرام برابر دنیا میں پھیلاتے رہے جیسا کہ فصل الخطاب میں ہے

وکم کثیر من البلاد فتح خلافة عمر و تلقن اصحاب تلك البلاد سنن عمر فی خلافة من نوابه رهبة ورغبة كما یلقنوا شهادة ان لا اله الا الله محمد رسول الله فنشأ علیها الصغیر ومات علیه الکبیر

(فصل الخطاب ص ۱۶۴)

عہد فاروقی میں بہت سے شہر فتح ہوئے۔ وہاں کے باشندوں کو حضرت عمر کے نائب خوشی یا جبر سے انہی کے طریقہ کی تلقین کرتے تھے جیسے کلمہ طیبہ کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ ہر بچہ اسی طریقہ پر پیدا ہوا اور ہر بڑا اسی پر مرا۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ شیعہ کے نزدیک تمام اسلامی سلطنت میں مذہب فاروقی پھیلا وہی مذہب جو رسول کریم نے صحابہ کو سکھایا جسے آج اہل السنت والجماعت کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دین اسلام کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے علی ولی اللہ وصی رسول اللہ وغیرہ کا دین اسلام کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ کی بنیاد یعنی کلمہ ہی دین اسلام سے مختلف اور نرالی بات ہے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت عمر کے زمانے تک ایران، عراق، یمن، روم شام مصر وغیرہ دیگر تمام ممالک میں دین اسلام ہی پھیلتا رہا اور حضرت علی نے چونکہ خلفائے ثلثہ کے دین کے خلاف کوئی عمل کیا ...... نہ کوئی حکم جاری کیا اس لیے ظاہر ہے کہ حضرت علی کے عہد کے خاتمے تک بھی وہی دین اسلام پھیلایا جاتا رہا۔ اور اس دین کے استحکام کی شہادت خود حضرت علی دیتے ہیں۔

ووليهم وال فاقام واستقام حتى ضرب الدين بجرانه

نهج البلاغه ۳: ۲۶۳

مسلمانوں کا والی جب حاکم ہوا تو دین کو قائم کیا اور خود سیدھے رستے پر قائم رہا یہاں تک کہ دین نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا یعنی مستحکم ہوگیا۔

اور درۃ النجفیہ جو نہج البلاغہ کی شرح ہے اس میں ہے کہ

ووليهم وال المنقول ان الوالی هو عمر بن الخطاب

علمائے شیعہ سے منقول ہے کہ والی سے مراد عمر بن الخطاب ہے۔

یعنی حضرت علی شہادت دیتے ہیں کہ دین اسلام حضرت عمر کے زمانہ میں نہ صرف پھیلا بلکہ مستحکم ہوگیا اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا کہ

وليمكنن لهم دينهم الذی ارتضى هم۔

قرن اول کی دینی حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ بقول شیعہ جو دین نبی کریمؐ نے اللہ تعالیٰ سے لے کر صحابہ تک پہنچایا وہ صحابہ کے مرتد ہو جانے کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ جو تین آدمی ارتداد سے بچ گئے وہ تقیہ کی زندگی بسر کرتے رہے اور کسی کے سامنے دین رسول پیش نہ کرسکے۔ پہلے ارتداد سے جو لوگ بچ گئے وہ امام حسین کے ساتھ شہید ہو گئے اور دین کو آگے پہنچانے والا کوئی فرد زندہ نہ بچا۔

قرنِ دوم کی حالت:

اب چوتھے امام زین العابدین کے زمانہ کا جائزہ لیجئے۔ انکی حالت یہ تھی کہ

(۱) یزید کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ کہا "میں تیرا غلام ہوں" (روضہ کافی اور جلاء العیون ص۵۸۶)

(۲) آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہے اور گوشہ نشین رہے۔

(۳) انہوں نے دین شیعہ کی تبلیغ کبھی نہیں کی چنانچہ شیعہ کتب میں انکی روایتیں بس برائے نام ہیں۔

پانچویں امام باقر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ دین شیعہ ان سے شروع ہوا چنانچہ اصول کافی میں ہے۔

ثم كان محمد بن علي ابا جعفر وكانت الشيعة قبل ان يكون ابو جعفر وهم لا يعرفون مناسك حجهم وحلالهم وحرامهم حتى كان ابو جعفر ففتح لهم وبين لهم مناسك حجهم وحلالهم وحرامهم حتى صار الناس يحتاجون اليهم من بعد ما كانوا يحتاجون الى الناس ص۴۹۶

پھر امام باقر آئے ان سے پہلے شیعہ حج کے احکام اور حلال وحرام سے مطلق واقف نہیں تھے۔ امام باقر نے شیعہ کے لیے حج کے احکام بیان کئے اور حلال وحرام میں تمیز کا دروازہ کھولا یہاں تک کہ دوسرے لوگ ان مسائل میں شیعہ کے محتاج ہونے لگے جبکہ اس سے پہلے شیعہ ان مسائل میں دوسروں کے محتاج تھے۔

اس اقتباس سے ان امور کی وضاحت ہو گئی کہ

(۱) امام باقر سے پہلے شیعہ کو حلال وحرام کی تمیز نہیں تھی کیونکہ حلت وحرمت کی تعیین ہی نہیں ہوئی تھی۔

(۲) امام باقر کے بغیر کسی کو حلال وحرام کا علم ہی نہیں تھا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دین ومذہب کی ابتدا ہی حلال وحرام سے ہوتی ہے۔ عقائد میں عبادات میں معاملات میں حد فاصل دین ہی تو کرتا ہے۔ کوئی مذہب خواہ الہامی ہو یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ اس کا پہلا کام یہ ہے کہ جائز وناجائز اور حلال وحرام کی حد بندی کرے۔ اس لیے جب امام باقر سے پہلے شیعہ حضرات حلال وحرام سے واقف ہی نہ تھے تو ظاہر ہے کہ شیعہ

مذہب کا وجود ہی نہیں تھا۔ امام باقر سے شروع ہوا۔

دین اسلام میں یہ بات اساسی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ حلال وحرام کی تعیین کرنا اللہ اور رسول کا کام ہے۔ کسی دوسرے کا یہ منصب ہی نہیں۔ بلکہ جو شخص اللہ ورسول کے مقرر کردہ حرام کو حرام نہ سمجھے اس سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

مختصر یہ کہ پانچویں امام تک دین شیعہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ امام باقر نے دین شیعہ کے حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تعیین کی اور اسے روشناس کرایا۔ اس بنا پر پانچویں امام کا منصب نبی کا منصب ٹھیرا۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر امام نے حلال وحرام کی تعیین اللہ تعالیٰ کے احکام حاصل کرکے کی۔ تو وہ نبی ہوئے اور ان پر وحی کا آنا تسلیم کرنا پڑے گا اس سے عقیدۂ ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ اور یہ صریح کفر ہے۔

اگر امام نے محض اپنی رائے سے یہ کام کیا تو دین شیعہ الہامی اور آسمانی مذہب نہیں انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اور

اگر امام دین کے احکام کی صرف روایت کریں تو سلسلہ روایت پہلے امام تک پہنچائیں مگر یہ صورت ممکن نہیں جیسا کہ پہلے چار اماموں کے حالات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے یا تو امام کی سیرت مجروح ہوتی ہے یا کفر لازم آتا ہے اور ان سے پہلے دین شیعہ کا ثبوت نہیں ملتا اور ان کے بعد دین کا اجرا تسلیم کریں تو دین شیعہ خدا کا دین نہیں بلکہ خودساختہ دین ثابت ہوتا ہے۔

علامہ دلدار علی مجتہد شیعہ نے اپنی کتاب اساس الاصول میں اس عقدے کا ایک حل پیش کیا ہے۔

لا نسلم انهم كانوا مكلفين بتحصيل القطع واليقين كما يظهر من سجية اصحاب الائمة بل كانوا مامورين باخذ الاحكام من الثقاة و

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اصحاب ائمہ کے لیے یقینی علم حاصل کرنا لازم تھا جیسا کہ ان کی روش سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ اصحاب ائمہ کو

وغيرهم ايضا مع قرينة تفيد الظن كما عرفت مرارًا بانحاء مختلفة كيف ولو لم يكن الامام كذلك لزم ان يكون اصحاب ابو جعفر والصادق الذين اخذ يونس كتبهم و سمع احاديثهم مثلا هالكين مستوجبين النار وهكذا حال جميع اصحاب الائمة بانهم كانوا مختلفين في كثير من المسائل الجزئية الفرعية كما يظهر ايضا من كتاب العدة وغيره وقد عرفته و لم يكن احد منهم قاطعا لما يرويه الاخر متمسكه كما يظهر ايضا من كتاب العدة وغيره ولنذكر في هذا المقام رواية رواها محمد بن يعقوب الكليني في الكافي فانها مفيدة لما نحن بصدده و نرجوا من الله ان يطمئن

حکم تھا کہ دین کے احکام معتبر اور غیر معتبر ہر قسم کے لوگوں سے حاصل کریں بشیر طیکہ کوئی قرینہ مفید ظن موجود ہو جیسا کہ بار ہا تمہیں مختلف طریقوں سے معلوم ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لازم آئے گا کہ امام باقر اور امام صادق کے اصحاب جنکی کتابوں کو یونس نے لیا اور ان کی حدیثیں سنیں ہلاک ہونے والے اور دوزخ کے مستحق ہو جائیں اور یہی حال ان تمام اصحاب ائمہ کا ہوگا کیونکہ وہ بہت سے مسائل جزئیہ فرعیہ میں باہم اختلاف رکھتے تھے جیسا کہ کتاب العدہ وغیرہ سے ظاہر ہے اور تمہیں معلوم ہو چکا ہے اور ان میں سے کوئی شخص اپنے مخالف کی روایت کی تکذیب نہیں کرتا تھا جیسا کہ کتاب العدۃ وغیرہ سے ظاہر ہے یہاں ہم ایک روایت ذکر کرتے ہیں جسے محمدؒ بن یعقوب کلینی نے کافی میں ذکر کیا ہے وہ روایت ہمارے مقصد کیلئے مفید ہے اور ہمیں قوی امید ہے کہ اس روایت سے مومنوں کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوگا اور انہیں میرے بیان کے حق ہونے کا یقین ہو جائے گا لہذا میں

بها قلوب المؤمنين يحصل لهم الجزم بحقيقة ما ذكرنا فنقول قال ثقة الاسلام في الكافي علي بن ابراهيم من الشريع بن الربيع قال لم يكن ابن ابي عمير يعدل بهشام بن الحكم شيئا ولا يغيب ايمانه ثم انقطع عنه وخالفه و كان سبب ذلك ان ابا مالك الحضرمي كان احد رجال هشام وقع بينه وبين ابن ابي عمير ملاحاة في شيء من الامامة قال ابن عمير الدنيا كلها للامام من جهة الملك وانه اولى بها من الذين هي في ايديهم وقال ابو مالك كذلك املاك الناس لهم الا ما حكم الله به للامام الفيء والخمس والغنم فذلك له و ذلك ايضا قد بين الله للامام ان يصنعه وكيف

کہتا ہوں کہ ثقۃ الاسلام نے کافی میں بیان کیا ہے کہ علی بن ابراہیم نے شریع بن ربیع سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن ابی عمیر ہشام بن الحکم کی بہت عزت کرتا تھا اس کے برابر کسی کو نہ سمجھتا تھا بلاناغہ اس کے پاس جاتا تھا پھر اس سے قطع تعلق کر لیا اور مخالف ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابو مالک حضرمی جو ہشام کے راویوں میں سے تھا اس کے اور ابن ابی عمیر کے درمیان مسئلہ امامت کے متعلق گفتگو ہوئی ابن ابی عمیر کا کہنا تھا کہ دنیا ساری کی ساری امام کی ملکیت ہے اور امام کو تمام چیزوں میں تصرف کرنے کا حق ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کے قبضہ میں وہ چیزیں ہیں ابو مالک کہتا تھا کہ لوگوں کی مملوکہ چیزیں انہی کی ہیں امام کو صرف اسی قدر ملے گا جو اللہ نے مقرر کیا ہے مثلاً مال فئے، خمس اور غنیمت اور ان کے متعلق بھی اللہ نے بتا دیا ہے کہ امام اسے کہاں خرچ کرے آخر ان دونوں نے ہشام کو اپنا حکم بنایا دونوں اس کے پاس گئے ہشام نے اپنے شاگرد ابو مالک کے موافق فیصلہ دیا۔ اس پر ابن ابی عمیر کو غصہ آیا اور اس نے ہشام سے قطع تعلق کر لیا یعنی

بجمع به فتراهما بهشام بن الحکم ومارا
الیه نحکم هشام رلابی مالک فغضب
ابن ابی عمیر وهجر هشاما بعد
ذلک فانظروا یا اولی الالباب واعتبروا
یا اولی الابصار فان هذه الاشخاص
الثلاثة کلهم کانوا من ثقاة اصحابنا
وکانوا اصحاب الصادق والکاظم والرضا علیهم
السلام کیف وقع النزاع بینهم حتی وقعت المهاجرة فیما
بینهم مع کونهم متمکنین من تحصیل العلم والیقین من
جناب الائمة۔ (اساس الاصول ص۱۴۴)

سلام و کلام ترک کر دیا۔ پس اے صاحبان
عقل دیکھو اور اے اہل بصیرت عبرت
حاصل کرو یہ تینوں ہمارے معتبر اصحاب
سے ہیں۔ اور امام صادق امام کاظم اور
امام رضا کے اصحاب سے ہیں ان میں
باہم کس طرح جھگڑا ہوا یہاں تک کہ قطع
تعلق ہوگیا۔ حالانکہ ان کو قدرت حاصل
تھی کہ ائمہ سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرا
لیتے اور علم و یقین حاصل کر لیتے۔

اسی کتاب کے ص۱۵ پر علامہ دلدار علی نے اختلاف کا صاف اقرار کیا ہے۔

وامتیاز المنافی بعضها عن بعض
فی باب کل حدیثین مختلفین بحیث
یحصل العلم والیقین بتعیین
المنشأ عسیر اجدا او فوق الطاقة
کما لا یخفی۔

دو مختلف حدیثوں میں امتیاز کرنا اور
سبب اختلاف اس طرح معلوم کرنا کہ علم
و یقین حاصل ہو جائے۔ نہایت دشوار
امر ہے بلکہ انسانی طاقت سے باہر ہے جیسا
کہ یہ حقیقت پوشیدہ نہیں۔

اور شیخ مرتضی نے فرائد الاصول میں اس پر مزید روشنی ڈالی ہے۔

ثم ان ما ذکره من تمکن اصحاب
الائمة من اهل الاصول والفروع
بطریق الیقین دعوی ممنوعة
واضح المنع واقل ما یشهد
علیها ما علم بالعین والاثر
من اختلاف اصحابهم صلوات

پھر اس شخص نے یہ ذکر کیا ہے کہ اصحاب
ائمہ اصول و فروع دین کو یقین کے ساتھ
حاصل کرنے پر قادر تھے۔ یہ ایک دعویٰ
ہے جو قابل تسلیم نہیں کم از کم اس کی شہادت
وہ ہے جو آنکھ کے مشاہدہ اور اثر سے معلوم
ہوئی ہے کہ اصحاب ائمہ اصول و فروع

الله علیهم فی الاصول والفروع
ولذا شکی غیر واحد من الاحادیث
المأثورة عن الائمة مختلفة
جدا لا یکاد یوجد حدیث
الا وفی مقابلته حدیث
ینافیه ولا یتفق خبرا الا و
بازاءه ما یضاده حتی صار
ذلک سببا لرجوع الناقصین عن
اعتقاد الحق کما صرح به
شیخ الطائفة فی اوائل التهذیب
والاستبصار ومنشأ هذه
الاختلافات کثیرة ..... من التقیة
والوضع واشتباه السامع والنسخ
والتخصیص والتقیید وغیر
هذه المذکورات من الامور
الکثیرة کما وقع التصریح علی
اکثرها الاخبار المأثورة عنهم
اصحاب الائمة الیهم اختلاف
اصحابه فاجابوهم تارة بانهم
قد القوا الاختلاف حقنا لدمائهم
کما فی روایة حریز و
زرارة وابی ایوب الجزار
واخری اجابوهم لان ذلک

دین میں باہم اختلاف رکھتے تھے اور اسی
وجہ سے بہت سے لوگوں نے ان حدیثوں میں
سخت اختلاف کیا ہے جو اماموں سے منقول
ہیں۔ ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس کے مقابل
اس کے مخالف حدیث موجود نہ ہو یہاں تک
کہ یہ اختلاف بعض کمزور عقیدہ لوگوں کیلئے مذہب
شیعہ ترک کر دینے کا سبب بنا جیسا کہ شیخ الطائفہ
نے تہذیب و استبصار کے آغاز میں بیان
کیا۔ اس اختلاف کے اسباب بہت ہیں
مثلاً ائمہ کا تقیہ کرنا، موضوع حدیثوں کا شامل
ہونا، سننے والوں سے غلطی کا ہو جانا،
معانی نہ سمجھنا منسوخ ہو جانا وغیرہ اور
ان کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں۔
چنانچہ ان میں سے اکثر کی تصریح احادیث
ائمہ میں موجود ہے۔ ائمہ سے شکایت کی
گئی کہ آپ کے اصحاب میں بہت اختلاف
ہے تو ائمہ نے جواب دیا کہ ہم نے خود
یہ اختلاف ڈالا ہے اور وہ صرف جان
بچانے کے لیے جیسا کہ حریز زرارہ اور
ایوب جزار کی روایتوں میں موجود ہے
اور کبھی یہ جواب دیا کہ اختلاف جھوٹ
بولنے والوں کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔
جیسا کہ فیض بن مختار کی روایت میں ہے وہ

من جهة الكذ ابين كما فى رواية الفيض بن المختار قال قلت لابى عبد الله جعلنى الله فداك ما هذا الاختلاف الذى بين شيعتهم قال فاى اختلاف يا فيض فقلت له انى اجلس فى حلقهم بالكوفة فاكاد اشك فى اختلافهم فى حديثهم حتى ارجع الى الفضل بن عمير فيوقفنى من ذلك على ما تستريح به نفسى

کہتے ہیں میں نے امام جعفر سے کہا قربان جاؤں آپکے شیعوں میں یہ کیا اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام نے فرمایا اے فیض! کونسا اختلاف؟ میں نے عرض کیا میں کوفہ میں تھا ان کے حلقۂ درس میں بیٹھتا ہوں تو ان کی احادیث میں اختلاف کی وجہ سے ایسا دھوکا ہوتا ہے کہ مجھے شک ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ میں فضل بن عمرو کی طرف رجوع کرتا ہوں تو مجھے ایسی بات بتاتے ہیں جس سے میرے دل کو تسلی ہو جاتی ہے

فقال عليه السلام اجل كما ذكرت يا فيض ان الناس قد اولعوا بالكذب علينا كان الله افترض عليهم ولا يريد منهم غيره انى احدث احدهم بحديث فلا يخرج من عندى يتاوله على غير تاويله وذلك لانهم لا يطلبون بحديثنا وبحبنا ما عند الله تعالى وكل يحب ان يدعى راسا۔

”امام نے فرمایا اے فیض! یہ درست ہے۔ لوگوں نے ہم پر افترا پردازی کی گویا خدا کا ان سے صرف یہی مطالبہ ہے کہ ہم پر جھوٹ بولیں۔ میں کسی سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں تو وہ میرے پاس سے اُٹھ جانے سے پہلے ہی اس کے مطلب میں تحریف شروع کر دیتا ہے۔ لوگ ہماری حدیث اور ہماری محبت سے آخرت کی نعمت نہیں چاہتے بلکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ سردار بن جائے“

پھر لکھتے ہیں :۔

وقريب منها رواية داؤد بن سرحان واستثناء القميين كثيرا من رجال نوادر الحكمة معروف وقصة ابن ابى العوجاء انه قال عند قتله قد دسست فى كتبكم اربعة الاف حديث مذكورة فى الرجال وكذا ما ذكر يونس بن عبد الرحمن من انه اخذ احاديث كثيرة من اصحاب الصادقين ثم عرضها على ابى الحسن الرضا عليه السلام فانكر منها احاديث كثيرة الى غير ذلك مما يشهد بخلاف ما ذكره ۔

”اور اس کے قریب داؤد بن سرحان کی روایت ہے اور اہل قم کا نوادر الحکمت کے بہت سے راویوں کو مستثنیٰ کر دینا مشہور ہے اور ابن ابی العوجاء کا قصہ کتب رجال میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے قتل کے وقت کہا کہ میں نے تمہاری کتابوں میں ۴ ہزار حدیثیں وضع کرکے درج کی ہیں اسی طرح وہ واقعہ جو یونس بن عبد الرحمٰن نے بیان کیا ہے کہ اس نے بہت سی حدیثیں اصحاب ائمہ سے حاصل کیں پھر انہیں امام رضا کے سامنے پیش کیا تو امام نے ان میں سے بہت سی حدیثوں کا انکار کیا ان کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جو اس شخص کے دعویٰ کے خلاف شہادت دیتے ہیں“

ان تین روایات سے کئی راز کھلے اور کئی عقدے حل ہوئے ہیں۔

(۱) اصحاب ائمہ پر فرض نہیں تھا کہ اصول و فروع دین کا یقینی علم حاصل کریں۔ باوجود اس امر کے کہ ان میں ایسا کرنے کی قدرت موجود تھی۔

اصول یہ ہے کہ ہر عاقل بالغ ذی ہوش انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو دین سے متعلق یقینی علم کے حصول کا مکلف ہے صرف ذی ہوش انسان ہونا شرط ہے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اصحاب ائمہ اس اصول سے کیونکر مستثنیٰ قرار پائے۔ جس دین کے اصول و فروع کا علم یقینی نہیں تو لازماً وہ دین تذبذب تردد اور شک کا مجموعہ ہوگا مشکوک دین اور تذبذب آدمی بھلا کس کام کا؟ ظاہر ہے کہ دین شیعہ کے اصول و فروع جو شاگردان ائمہ سے دوسروں تک پہنچے ان میں کوئی بات یقینی نہیں۔ عقائد عبادات معاملات سب مشکوک ثابت ہوئے

(۲) اصحاب ائمہ کیلئے ضروری تھا کیونکہ حکم انہیں ملا تھا کہ دین کے احکام معتبر اور غیر معتبر ہر قسم کے لوگوں سے حاصل کریں۔

یہ حکم اور بھی عجیب ہے۔ لفظ ”اصحاب ائمہ“ قابل غور ہے۔ ظاہر مفہوم یہی ہے کہ ائمہ کے صحبت یافتہ ائمہ کے تربیت یافتہ اور ائمہ سے تعلیم حاصل کرنے والے اور ائمہ کی صحبت اختیار کرنے کا مقصد اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) اصحاب ائمہ کو یہ حکم کس نے دیا تھا کہ معتبر اور غیر معتبر آدمی سے دین حاصل کریں۔

(ب) اگر خود ائمہ نے دیا تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا ائمہ کے پاس دین کا علم تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو کیا ناقص اور نامکمل تھا کہ اس کی کو پورا کرنے کے لیے ہر کہ ومہ سے دین حاصل کرنے کا حکم دیا۔ اگر وجہ یہی تھی تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ خود دین سے ناواقف تھے۔ اور اگر یہ وجہ نہیں تو یہ حکم کسی اور نے دیا۔ اگر ایسا ہے تو اصحاب ائمہ نے یہ غیر معقول بلکہ دین سے دور کرنے والا حکم کیوں سنا اور اس پر عمل کرنا کیسے برداشت کیا۔ انہوں نے کیوں نہ صاف کہہ دیا کہ ائمہ کے ہوتے ہوئے کسی اور سے دین حاصل کرنا ائمہ کی توہین بھی ہے اور دین کے ساتھ مذاق بھی۔

(۳) اگر غیر معتبر لوگوں سے دین کے اصول وفروع لینے کا حکم غلط قرار دیا جائے تو اصحاب ائمہ دوزخی قرار پائیں گے کیونکہ ان کی روایتوں میں اختلاف نہیں بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے۔ یعنی اصل کام یہ نہیں کہ دین کے احکام صحیح ماخذ سے لیے جائیں اور دین کے اصول و فروع کا یقینی علم حاصل کیا جائے بلکہ اصل کام یہ ہے کہ اصحاب ائمہ کو دوزخی قرار دئے جانے سے بچایا جائے۔ معلوم ہوتا ہے اس حکم میں اصحاب ائمہ کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اصحاب رسول میں اگر فروعی اور جزوی اختلاف بھی نظر آئے تو انہیں بے دریغ دوزخی کہہ دیا جائے مگر اصحاب ائمہ میں اصولی اختلاف بھی پایا جائے تو انہیں دوزخ سے بچانے کے لیے نیا اصول وضع کر لیا جائے۔ یعنی اصحاب ائمہ کا مرتبہ اصحاب رسول سے بلند ہے۔ مگر اصحاب رسول نے رسول کو چھوڑ کر کسی ایرے غیرے سے نہ تو دین کا علم سیکھا نہ اس پر اعتبار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کے اصولی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں اور دین شیعہ مجموعۂ اضداد ہے۔

(۴) امام باقر سے پہلے شیعہ اپنے مذہب کے حلال وحرام سے واقف ہی نہیں تھے اور امام کے بعد انہیں حکم ہوا کہ ہر فاسق وفاجر سے بھی دین سیکھو۔ تو اصحاب ائمہ سے جو دین منقول ہوا وہ ائمہ کا دین نہیں ہو سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے منافق و فجار کے بنائے ہوئے احکام ومسائل اس دین میں شامل ہیں۔

(۵) دو مختلف حدیثوں میں صحیح اور غلط کا امتیاز کرنا، اختلاف دور کرنا اور یقینی علم حاصل کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

جب ایک کام انسانی طاقت سے باہر ہے تو انسان کیا کرے؟ یہی کہ دونوں حدیثوں پر عمل کرے کبھی ایک پر کبھی دوسری پر۔ مگر اپنے کسی کام کے متعلق یقین نہیں ہونا چاہیے کہ یہ صحیح ہے یعنی ساری عمر بے یقینی کا شکار رہے۔ یا یہ کہ کسی ایک پر بھی عمل نہ کرے جب صحیح اور غلط میں تمیز نہیں ہو سکتی تو اس پر عمل کرنے کا فائدہ کیا ہوا۔ لہٰذا دین شیعہ میں اصول وفروع کے جتنے مسائل ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ اور حلال وحرام کے مسائل ان میں کوئی بھی یقینی بات نہیں ممکن ہے شیعہ کے بے عمل ہونے کی یہی وجہ ہو۔ ہاں متعہ تقیہ اور ماتم ایسے مسائل معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے متعلق نسبتاً یقینی علم حاصل ہے جبھی تو ان تین مسائل کا خاص اہتمام ہے۔

(۶) ان روایات میں چار اصحاب ائمہ کا ذکر ہے جو چوٹی کے اصحاب ہیں تین اماموں کے شاگرد ہیں اور انہی سے دین شیعہ منقول ہو کر آیا ہے۔ یونس، ہشام ابن ابی عمیر اور ابو مالک۔ شیعہ کتب رجال سے انکی ثقاہت اور عظمت کا کھوج لگانا چاہیئے۔

(۱) یونس ... کان یروی الاحادیث من غیر سماع۔ رجال کشی صفحہ ۳۰	ائمہ کی حدیثیں بغیر سنے بیان کرتا تھا یعنی خود گھڑ لیتا اور ائمہ کے ذمے لگا دیتا۔
عن عبداللہ بن محمد الحجال قال کنت عند الرضا ومعہ کتاب یقرئہ فی بابہ حتی ضرب بہ الارض فقال کتاب ولد الزنا فکان کتاب یونس۔ (رجال کشی ص ۳۰)	عبداللہ بن محمد الحجال کہتا ہے میں امام رضا کے پاس تھا آپ ایک کتاب پڑھ رہے تھے یہاں تک کہ امام نے وہ کتاب زمین پر دے ماری اور فرمایا حرامی کی کتاب ہے اور وہ کتاب یونس تھی۔

اس روایت سے یونس کی عظمت اور اس کی کتاب کا مقام ظاہر ہے جس پر شیعہ کو بڑا ناز ہے۔ یہ کہ یونس حرامی تھا اور اس کی کتاب زمین پر دے مارنے کے قابل ہے۔

اور یہ

ثم ضرب به الارض فقال هذا كتاب ابن زان لزانية هذا كتاب زنديق لغير رشدا۔ (رجال کشی ص۳۰۹)

امام نے وہ کتاب زمین پر دے ماری اور فرمایا یہ حرامی کی کتاب ہے یہ زندیق کی کتاب ہے جو ہدایت پر نہیں ہے۔

اور

عن ابن سنان قال قلت لابی الحسن ان یونس یقول ان الجنة والنار لم یخلقا فقال ماله لعن الله وای جنة آدم (رجال کشی ص۳۰۶)

ابن سنان کہتا ہے میں نے امام رضا سے عرض کیا یونس کہتا ہے کہ جنت اور دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ امام نے فرمایا اس پر خدا کی لعنت۔ آدم کی جنت کہاں ہے۔

پھر رجال کشی میں ہے کہ محمد بن ابادیہ نے امام رضا کو یونس کے متعلق لکھا تو

كتب الحسن فی یونس نکتب فلعن الله ولعن اصحابه۔ (ص۳۰۶)

امام نے جواب دیا یونس بھی ملعون اور اس کے شاگرد بھی ملعون ہیں۔

فن رجال کی اسی جرح سے معلوم ہوا کہ یونس حرامی ہے ملعون ہے اس کے شاگرد ملعون ہیں زندیق ہیں۔ ہدایت پر نہیں اور اس کی کتاب زمین پر دے مارنے کے لائق ہے۔

(۲) ہشام رہ اللہ تعالےٰ کے متعلق ہشام کا عقیدہ امام رضا کے سامنے بیان ہوا۔

ان هشام بن سالم وصاحب الطاق والمیثمی یقولون انه اجوف الی السرة والباقی صمد (اصول کافی ص۵۶)

ہشام، صاحب الطاق اور میثمی کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالےٰ ناف تک کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس مضبوط ہے۔

اور

ان محمدا رای ربه فی هیئة الشاب الموفق فی سن ابناء ثلثین سنة (ایضاً)

اللہ کی عمر تیس برس کے جوان کی سی تھی جب رسول کریم نے اسے دیکھا۔

اللہ تعالےٰ کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی دین کے متعلق جو روایت بیان کرے

اس کی قدر وقیمت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

رہے باقی دو حضرات تو ان کے متعلق اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ ابو مالک ہشام کا شاگرد تھا اور ابن ابی عمیر، ہشام کو بہت بڑا عالم تسلیم کرتا تھا۔ جب بڑے عالم کا یہ عالم ہے تو چھوٹوں کے متعلق کرید کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اصول کافی کے حوالے سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ پانچویں امام سے پہلے شیعہ مذہب گویا تھا ہی نہیں کیونکہ حلال وحرام کی تعیین تو پانچویں امام نے کی بعد کی حالت کا نقشہ رجال کشی میں یوں بیان ہوا ہے۔

جعفر بن موسیٰ نے امام رضا سے شکایت کی۔

قال له جعفر بن عیسی اشکوا الی الله والیك ما نحن فیه من اصحابنا فقال ما انتم فیه منهم فقال جعفر هم والله یزیدون فوتا ویکفروننا ویبرؤن منا فقال علیه السلام هکذا کان اصحاب علی بن الحسین ومحمد بن علی واصحاب جعفر وموسی علیه السلام ولقد کان اصحاب زرارة یکفرون غیرهم وکذلك غیرهم یکفرونهم فقلت له یا سیدی نستعین بك علی هذین الشیخین یونس وهشام وهما حاضران وهما ادبانا وعلمانا۔ (رجال کشی ص۳۱۰)

امام رضا سے جعفر بن عیسیٰ نے کہا کہ میں اللہ سے اور آپ سے شکایت کرتا ہوں اس تکلیف کی جو ہمیں شیعہ کی طرف سے پہنچی ہے امام نے فرمایا تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ جعفر نے کہا خدا کی قسم وہ ہم سے قوی ہیں۔ ہمیں کافر کہتے ہیں اور تبرا کرتے ہیں امام نے کہا یہی حال امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر اور موسیٰ کاظم کے اصحاب کا ہے اور شاگردان زرارہ دوسرے اصحاب ائمہ کو کافر کہتے ہیں اور وہ زرارہ کے شاگردوں کو کافر کہتے ہیں پھر میں نے کہا اے میرے سردار ہم آپ سے ان دو بزرگوں کے متعلق مدد مانگتے ہیں جو یونس اور ہشام ہیں ان دونوں نے ہمیں ادب سکھایا اور تعلیم دی۔

اس روایت سے یہ نتیجہ نکلا کہ:-

(۱) امام کے زمانہ کی تعلیم آنے والے امام کے عہد میں تکفیر کا نشانہ بنی ظاہر ہے کہ کفر کو کون دین مانے

محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ عہد بہ عہد ضائع ہوتی چلی گئی۔

(۲) ہر امام کی تعلیم پہلے امام کی تعلیم سے متضاد ہوتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ کفر کی تعلیم ہوتی تھی جبھی تو اس کے متعلق کفر کا فتویٰ دیا جاتا تھا کفر کی تعلیم پر ہی کفر کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

(۳) ہر امام کے شاگرد سابقہ امام کی تعلیم کی اقتدا تو کیا کرتے الٹا اسے کفر کی تعلیم قرار دینے چلے آئے اور امام کی تعلیم پر کفر کے فتوے دراصل سابقہ امام کی حدیثوں پر کفر کے فتوے تھے تو اقتدا کیسے کرتے۔

(۴) یہ کفر کے فتوے دو حال سے خالی نہیں اوّل ان عقائد اور اعمال کی تعلیم خود امام نے دی اس کا مطلب یہ ہؤا کہ معاذ اللہ کفریہ عقائد اماموں نے ایجاد کئے۔ پھر وہ ہادی کیونکر ٹھہرے اور امام کیسے بنے۔ دوم یہ عقائد اصحاب ائمہ نے خود گھڑ لیے اس کا مطلب یہ ہؤا کہ دین شیعہ اصحاب ائمہ نے ایجاد کیا۔ اور وہ بھی ہوائے نفس اور القائے شیطانی کے تحت۔

(۵) محدثین شیعہ نے تمام ائمہ کے شاگردوں کی حدیثیں درج کی ہیں۔ رجال کشی کے متذکرہ بالا اصول کے پیش نظر صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ حدیثیں ہرگز درج نہ کرتے جن پر کسی دور میں کفر کا فتویٰ صادر ہو چکا تھا اسی طرح ان کے لیے لازم تھا کہ امام تقی سے پہلے ائمہ کے شاگردوں کی روایت کردہ حدیثیں نقل نہ کرتے کیونکہ کفر کے فتووں سے تو صرف امام تقی، نقی اور حسن عسکری کے شاگرد ہی بچے ہیں۔ جن لوگوں پر متقدمین شیعہ نے کفر کا فتویٰ دیا تھا ان کی حدیث متاخرین کیلئے کیونکر قابل عمل قرار دی جا سکتی ہے۔

(۶) روایت مذکورہ میں جن "شیخین" کو محسن قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک کے متعلق امام رضا نے ملعون حرامی اور زندیق فرمایا اور دوسرا توحید خالص کا منکر تو ان کی بیان کردہ حدیثوں سے جو علم حاصل ہؤا اس کی قدر و قیمت معلوم۔

رجال کشی کی مذکورہ روایت اصول کافی میں دوسرے رنگ میں بیان ہوئی ہے۔

قلت لابی عبد اللہ اذا جاء حدیث عن اولکم وحدیث عن اخرکم بایھما ناخذ۔ فقال خذوا بہ حتی یبلغکم عن الحی۔ (اصول کافی ص۳۲)

معلی کہتا ہے میں نے امام جعفر سے پوچھا کہ جب پہلے اور پچھلے امام کی حدیث میں اختلاف ہو تو ہم کس پر عمل کریں۔ امام نے فرمایا جب زندہ امام کی حدیث مل جائے اس پر عمل کرو۔

اس روایت کو رجال کشی کی روایت کے ساتھ ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ:۔

امام باقر کے شاگردوں کے فتویٰ کے مطابق امام زین العابدین کی حدیثیں قابل عمل نہ رہیں ان پر کفر کا فتویٰ جو لگ گیا۔ اور امام جعفر کے زمانے میں امام باقر کی تعلیمات نا قابل عمل قرار پائیں یہ سلسلہ امام رضا تک چلا آیا تو ساتویں امام تک تمام ائمہ کی حدیثیں قابل عمل نہ رہیں تو انہیں سینے سے لگائے رکھنا کیا مطلب؟

خلاصہ یہ ہؤا کہ دین رسول پہلے تو ارتداد کی نذر ہو گیا پھر شہادت حسین کی وجہ سے دنیا سے نابود ہو گیا امام زین العابدین سے لے کر امام رضا تک جو دین پیش کیا جاتا رہا وہ عہد بہ عہد صحابہ ائمہ کے کفر کے فتووں کی وجہ سے نا قابل تسلیم اور نا قابل عمل قرار پایا۔ لہٰذا مذہب شیعہ امام تقی سے شروع ہؤا۔ رسول کریمؐ سے اس دین کا سلسلہ یا ربط قائم نہیں ہو سکتا۔

ائمہ کو جو صحابہ، شاگرد یا حواری ملے ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح فرماتے رہے۔

(۱) اصول کافی ص۴۹۶: امام جعفر کا بیان ہے کہ:۔

"اے ابو بصیر اگر تم میں سے (جو شیعہ ہو) تین مومن مجھے مل جاتے جو میری حدیث ظاہر نہ کرتے تو میں ان سے اپنی حدیثیں نہ چھپاتا"

اس افسوسناک بیان سے ظاہر ہے کہ:۔

(ا) امام جعفر کو عمر بھر تین ایسے مومن شاگرد نہ مل سکے جن پر وہ اعتماد کر سکتے۔

(ب) امام جعفر کو اپنی حدیثیں بیان کرنے کی خواہش تو تھی مگر اس لیے نہیں کہ امام کا علم پھیلے بلکہ اس لیے کہ انہیں چھپا کے رکھا جائے۔ یعنی دین شیعہ چھپا رکھنے کی چیز ہے ظاہر کرنے کی نہیں۔

(ج) امام کو حدیثیں بیان کرنے کی حسرت ہی رہی مگر بیان کر نہ سکے۔

پھر یہ تو ایک معمہ بن گیا کہ اصول کافی، استبصار، تہذیب اور من لا یحضرہ الفقیہ

جیسی ضخیم کتابیں امام جعفر کی حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ کہاں سے آگئیں۔

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کے امام جعفر دردناک انداز میں فرماتے ہیں۔

(۴) "میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں پایا جو میری وصیت قبول کرتا اور میری اطاعت کرتا سوائے عبداللہ بن یعفور کے" (رجال کشی ص۱۶۱)

گویا امام جعفر کو صحیح شیعہ صرف ایک ہی ملا۔ لہٰذا اسی ثقہ شخص سے دین شیعہ آگے چلا ظاہر ہے متواتر نہ رہا۔ پھر رجال کشی ص۲۴۶ پر ایک روایت سے عبداللہ بن یعفور کا مقام اور اس کی ثقاہت کا راز بھی کھل جاتا ہے۔

ائمہ کا طریقہ تبلیغ وتعلیم دین

گو ائمہ کرام کو یہ شکایت رہی کہ اگر کوئی صحیح شیعہ مل جاتا تو ہم اس سے اپنی احادیث بیان کرتے۔ مگر جن راویوں کی روایتوں سے شیعہ کتب بھری پڑی ہیں ان کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ قابل اعتماد ہیں۔ اسی بنا پر قریباً سارے دین شیعہ کا مدار ان حضرات کی روایت پر ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ کرام ان مقتدر حضرات کو دین کی تعلیم کیسے دیتے تھے۔

(۱) اصول کافی میں ہے کہ امام سے ایک آدمی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ امام نے بتا دیا پھر ایک اور آدمی نے آکر وہی مسئلہ پوچھا امام نے اسے اور طرح بتایا پھر زرارہ کی باری آئی۔ زرارہ بیان کرتا ہے۔

فلما خرج الرجلان قلت یا ابن رسول اللہ رجلان من اهل العراق من شیعتکم قدما یسألان فاجبت کل واحد منهما بغیر ما اجبت به صاحبه فقال یا زرارة ان هذا خیر لنا وابقی لنا ولکم ولو اجتمعتم علی امر واحد صدقکم الناس علینا ولکان اقل لبقائنا وبقائکم (اصول کافی ص۳۷)

"جب وہ دونوں چلے گئے تو میں (زرارہ) نے کہا اے فرزند رسول یہ دونوں آدمی عراقی اور آپ کے پرانے شیعوں میں سے تھے انہوں نے ایک ہی سوال کیا اور آپ نے دونوں کو مختلف جواب دئے فرمایا اے زرارہ! ایسا جواب دینا ہمارے لیے اچھا ہے اور اسی میں ہماری تمہاری بقا ہے اگر تم ایک بات پر متفق ہو جاؤ گے تو لوگ تمہیں سچا کہیں گے اور یہ بات ہماری تمہاری بقا کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی"

"... ابو بصیر کے بعد زرارہ ہے جس کا نام شیعہ راویوں میں سرفہرست آتا ہے اور اس

کتاب میں درج ہے جس کے متعلق امام کا فتویٰ ہے کہ هو اکاف لشیعتنا ایسے ثقہ راوی کے سامنے امام اپنی تعلیم کی خصوصیات بیان کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) امام اپنے پرانے شیعوں کو بھی دین کی صحیح بات نہیں بتاتے تھے۔

(ب) امام چاہتے تھے کہ لوگ شیعوں کو جھوٹا سمجھیں اور کہیں۔ کوئی شخص انہیں سچا نہ سمجھ بیٹھے۔

(ج) شیعوں کے وجود کی بقا کی ضرورت ہے خواہ وہ نام کے شیعہ ہوں۔ ان کے ایمان کی ضرورت نہیں۔

(د) دین کی کسی بات پر متفق ہونا نقصان دہ ہے۔

(۲) دوسرا راوی اور زرارہ کے بعد ثقہ ترین راوی ابو بصیر آپ بیتی بیان کرتا ہے۔

عن ابی بصیر قال قلت لابی عبد اللہ علیه السلام متی اصلی رکعتی الفجر قال فقال لی بعد طلوع الفجر قلت له ان ابا جعفر علیه السلام امرنی ان اصلیهما قبل طلوع الفجر فقال یا ابا محمد ان الشیعة اتوا ابی مسترشدین فافتاهم بالحق واتونی شکاکا فافتیتهم بالتقیة (استبصار ص۱۴۵)

"ابو بصیر کہتا ہے میں نے امام جعفر سے پوچھا فجر کی سنتیں کب پڑھوں امام نے فرمایا طلوع فجر کے بعد میں نے عرض کیا امام باقر نے مجھے فرمایا تھا طلوع فجر سے پہلے پڑھو۔ امام جعفر نے فرمایا اے ابا محمد! شیعہ میرے باپ کے پاس طالب ہدایت ہو کر آتے تھے وہ انہیں صحیح مسئلہ بتاتے تھے۔ اور میرے پاس وہ شک لے کر آتے ہیں میں تقیہ کر کے بتاتا ہوں"

مطلب یہ ہوا کہ:

(۱) امام جعفر نے ابو بصیر کو دین میں شک کرنے والا سمجھا۔ اور امام غلط تو نہیں سمجھا کرتا۔ اس لیے اس کو غلط مسئلہ بتایا۔ اور اسی شک میں گرفتار ابو بصیر کی روایات سے شیعہ کتب حدیث بھری پڑی ہیں۔

(۲) یہی شخص امام باقر کے پاس گیا تھا تو امام نے اسے طالب ہدایت سمجھا اور صحیح مسئلہ بتایا۔

(۳) شیعہ کا طلب ہدایت کا معاملہ امام باقر تک رہا۔ ان کے بعد لوگ طلب ہدایت

کیلئے امام کے پاس نہیں جاتے تھے۔ خدا جانے انہیں دین میں شک ہوتا تھا یا امام کے متعلق شک تھا۔

(۴) وقت بدلنے سے ابوبصیر جیسے ثقہ شاگرد کی سیرت بدل گئی امام جعفر کا زمانہ آیا تو ابوبصیر ہدایت سے مستغنی ہوکر دین میں شک کرنے لگا اور امام جعفر تاڑ گئے اس لیے تقیہ کرکے اسے غلط مسئلہ بتایا۔

۳۔ علامہ دلدار علی مجتہد اعظم شیعہ نے اپنی کتاب اساس الاصول میں امام جعفر کے متعلق عجیب انکشاف کیا ہے۔

عن ابی عبد اللہ انہ قال انی أتکلم علی سبعین وجہ لی فی کلها المخرج، وایضا عن ابی بصیر قال سمعت ابا عبد اللہ یقول انی اتکلم بالکلمة الواحدة لها سبعون وجها ان شئت اخذت کذا وان شئت اخذت کذا (اساس الاصول ص۶۵)

"امام جعفر فرماتے ہیں میں ستر پہلوؤں پر کلام کرتا ہوں اور میرے لیے تمام پہلوؤں سے نکلنے کا راستہ ہوتا ہے۔ ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں نے امام جعفر سے سنا فرماتے تھے میری کلام کے ہر کلمہ میں ستر پہلو ہوتے ہیں چاہوں تو اس پہلو کو اختیار کروں چاہوں تو دوسرے کو"

معلوم ہوا کہ:-

(۱) امام کو اعتراف ہے کہ صحیح اور واضح بات کبھی نہ کرتے بلکہ بات جب کرتے پہلو دار بات ہوتی۔

(۲) ان کے ہر کلمہ کے ستر پہلو ہوسکتے ہیں اور امام جب چاہتے ہر پہلو کا انکار کرسکتے تھے مثلاً امام نے کہا کہ زرارہ ملعون ہے تو اس میں صدق وکذب کے ستر پہلو ہوئے اور اگر کوئی شخص اس کلام سے وہی سمجھے جو الفاظ کے معنی بتاتے ہیں تو امام اس کا انکار کرسکتے تھے۔ اس لیے زرارہ کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح اگر امام کہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو اس کے بھی ستر پہلو ہوسکتے ہیں پھر کوئی کیا سمجھے کہ امام کا مذہب کیا ہے جب اس کے ستر پہلو ہوسکتے ہیں اور امام ہر پہلو کا انکار کرسکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ سنی شیعہ تو درکنار امام کا کوئی مذہب ہی ثابت نہیں ہوسکتا۔ جب امام نے کوئی حتمی

بات کہی نہیں ہمیشہ پہلو دار بات کی تو امام کا مذہب ثابت کیسے ہوسکتا ہے۔

۴۔ اصول کافی میں بیان ہوا ہے کہ امام اپنی امامت کا انکار کرتے تھے۔

عن سعید السمان قال کنت عند ابی عبد اللہ اذ ادخل علیه رجلان من الزیدیة فقالا له افیکم امام مفترض الطاعة قال فقال لا فقالا له قد اخبرنا عنك الثقات انك تفتی وتقر وتقول به ونسمیهم لك فلان وفلان وهم اصحاب ورع وتشمیر وهم ممن لا یکذب فغضب ابو عبد اللہ وقال ما امرتهم بهذا فلما رأیا الغضب فی وجهه خرجا (اصول کافی ص۱۲۲)

"سعید سمان کہتا ہے کہ میں امام جعفر کے پاس بیٹھا تھا کہ زیدیہ فرقے کے دو آدمی آئے اور پوچھا کیا تم میں کوئی امام ہے جس کی اطاعت فرض ہو، سعید کہتا ہے امام نے کہا کوئی نہیں۔ وہ کہنے لگے ہمیں بڑے معتبر لوگوں نے آپ کے متعلق خبر دی ہے کہ آپ فتویٰ دیتے ہیں اور امامت کا اقرار کرتے ہیں اور ہم ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہیں۔ فلاں فلاں ہیں وہ حد درجے کے نیک آدمی ہیں جھوٹ بالکل نہیں بولتے یہ سن کر امام کو غصہ آگیا اور کہا میں نے انہیں کوئی ایسا حکم نہیں دیا۔ جب انہوں نے امام کو غضبناک دیکھا تو اٹھ کر چلے گئے"

اسی مضمون کی ایک روایت رجال کشی ص۲۶۸ پر موجود ہے۔

عن سعید الاعرج قال کنا عند ابی عبد اللہ فاستاذن لنا رجلان فاذن لهما فقال احدهما افیکم امام مفترض الطاعة قال ما اعرف ذلك فینا قال بالکوفة قوم یزعمون ان فیکم اماما مفترض الطاعة وهم لا یکذبون، اصحاب ورع واجتهاد وتشمیر منهم عبد اللہ بن ابی یعفور الی ان قال فما ذنبی واحمر وجهه ما امرتهم۔

"سعید اعرج بیان کرتا ہے کہ ہم امام جعفر کے پاس موجود تھے کہ دو آدمی زیدیہ فرقہ کے آئے انہوں نے اجازت طلب کی امام نے اجازت دی۔ انہوں نے پوچھا کیا تم میں کوئی امام مفترض الطاعۃ ہے۔ امام نے کہا ہم میں کوئی ایسا آدمی میں نہیں جانتا۔ کہا کوفہ میں کچھ لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ تم میں کوئی امام مفترض الطاعۃ ہے۔ اور وہ جھوٹ بولنے والے نہیں صاحب ورع وتقویٰ ہیں۔ ان میں سے ایک عبد اللہ بن یعفور ہے۔ امام نے فرمایا میرا کیا گناہ ہے۔ اور امام

کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ فرمایا میں نے ان کو یہ حکم نہیں دیا اور نہ کہا ہے"

مجالس المؤمنین کے صفحہ ۱۶۶ پر اسی مضمون کی ایک روایت موجود ہے۔

اس روایت میں "صاحب ورع و تقویٰ" عبداللہ بن یعفور کا ذکر ہے۔ پھر اس کے کارنامہ کا ذکر ہے۔ وہ یہ کہ امام نے امامت کا دعویٰ نہیں کیا مگر کوفہ کے اس عبداللہ بن یعفور نے امام پر بہتان باندھا اور انہیں امام مفترض الطاعۃ کہا اور لوگوں کو بتایا اور امام اس کی اس حرکت پر ناراض ہوئے۔ اور جس نے امام کو غضبناک کیا وہ مسلمان کیسے رہ سکتا ہے۔ یہی ایک شخص تھا جس کو صحیح شیعہ قرار دیا گیا۔ امام تو دعویٰ امامت کو ذنب کہہ رہے ہیں اور یہ شخص انہیں امام مفترض الطاعۃ کہہ رہا ہے۔

امام کے متعلق حق الیقین میں یہ عبارت ملتی ہے:-

"ائمہ طاہرین کے زمانہ میں شیعوں کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جو ان بزرگوں کی عصمت کا اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کو نیک علماء کے مرتبہ میں شمار کرتے تھے جیسا کہ کتاب رجال کشی سے واضح ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے ائمہ طاہرین ان کو صاحب ایمان سمجھتے تھے بلکہ ان کی عدالت کو معتبر فرماتے تھے" صفحہ ۲۱۷

ثابت ہوا کہ نہ اماموں نے امامت کا دعویٰ کیا۔ نہ اماموں کی امامت کا عقیدہ اور اقرار ایمان تھا ورنہ عدم اقرار کی وجہ سے کوئی ایماندار اور عادل نہ رہتا اور معلوم ہوا کہ یہ امامت کا من گھڑت عقیدہ زرارہ ابوبصیر اور عبداللہ بن یعفور جیسے لوگوں کا دعویٰ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات امامت کا دعویٰ کیسے کر سکتے تھے جبکہ امامت کا مسئلہ تو ایک راز تھا جس کا علم سوائے جبرئیل کے کسی فرشتہ کو بھی نہ تھا۔ پھر جبرئیل نے رسول کریمؐ کو بتایا اور رسول کریمؐ نے حضرت علی کے بغیر کسی کو نہ بتایا جیسے:- قال ابو جعفر علیہ السلام ولایۃ اللہ اسرّھا الی جبرئیل واسرّھا جبرئیل الی محمد واسرّھا محمد الی علی واسرّھا علی الی من شاء ثم انتم تذیعون ذلک (اصول کافی صفحہ ۴۷۷)

"امام باقر نے فرمایا امامت ایک راز تھا جو اللہ نے جبرئیل کو پوشیدہ طور پر بتایا۔ جبرئیل نے رسولؐ کو اور رسولؐ نے علی کو راز کے طور پر بتایا اور علی نے جسے چاہا راز کے طور پر بتایا اب تم شیعہ اس راز کو افشا کرتے ہو"

یہی مضمون رجال کشی صفحہ ۳۷۷ پر بھی ملتا ہے۔

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ امامت کا ذکر قرآن و حدیث میں تو کیا کسی انسان کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ ایک راز تھا تو قرآن میں ذکر کیسے ہوتا۔ جب وہ سِر تھا تو رسول کریمؐ لوگوں کے سامنے بیان کیسے کرتے کہ وہ حدیث بن جاتی اور پھیل جاتی۔ اس لیے قرآن و سنت سے امامت کا ثبوت تلاش کرنا تکلف محض ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ امامت کا عقیدہ قرآن میں نہیں حدیث میں نہیں خود ان لوگوں نے اپنی امامت کا انکار کیا جنہیں آج امام تسلیم کیا جاتا ہے جب امامت کا علم کسی کو نہیں تھا تو مذہب شیعہ کا علم کیسے ہو گیا۔ پس زمانہ اول میں نہ امامت تھی نہ مذہب شیعہ تھا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ عقیدۂ امامت کا موجد کون ہے؟ اس سلسلے میں صاحب رجال کشی نے کچھ رہبری کی ہے۔

ذکر بعض اہل العلم ان عبد اللہ بن سبا کان یہودیا فاسلم و والی علیا علیہ السلام وکان یقول وھو علی یہودیتہ فی یوشع بن نون وصی موسیٰ بالغلو فقال فی اسلامہ بعد وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی علیؑ فی ذلک وکان اول من اشتھر بالقول بفرض امامۃ علی والبراءۃ من اعدائہ وکاشف مخالفیہ واکفرھم فمن ھٰذا قال من خالف الشیعۃ اصل التشیع والرفض ماخوذ من الیہودیۃ (رجال کشی صفحہ ۷۱)

"بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا پھر وہ اسلام لایا اور اس نے حضرت علی سے محبت کی اور اپنی یہودیت کے زمانہ میں یوشع بن نون وصی موسیٰ کے بارہ میں غلو کرتا تھا پھر اسلام لایا تو رسول کریمؐ کی وفات کے بعد حضرت علی کے بارہ میں غلو کرنے لگا۔ یہ ابن سبا پہلا شخص تھا جس نے مسئلہ امامت علی مشہور کیا۔ ان کے دشمنوں پر تبرا کیا اور انہیں کافر کہا اس وجہ سے جو لوگ شیعوں کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں شیعہ مذہب یہودیت سے ماخوذ ہے"

ثابت ہوا کہ شیعہ مذہب کے دونوں اعظم رکن امامت اور تبرا بازی کا عقیدہ اسی دشمن اسلام کی اختراع ہے۔ اور یہی شخص ان عقائد کا بانی ہے۔

ایک لڑکا تھا عرشیین، بکیر کے پانچ لڑکے تھے عبداللہ، جہم، عبدالحمید، عبدالاعلیٰ اور عمران تمام کو ملا کر آل امین کہا جاتا ہے۔ رجال کشی صفحہ ۱۰۲ پر ان تمام کو یہود کی مثل لکھا ہے۔

ہم نے ان تمام راویوں کے حالات شیعہ کتب رجال سے صرف اس لیے پیش کر دئے کہ معلوم ہو جائے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است ورنہ اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا کہ امام جعفر کے زمانے تک امام کو ایک مومن بھی نہ ملا سوائے عبداللہ بن یعفور کے۔ اس لیے اگر صرف اسی کی سیرت کا ملاحظہ کر لیا جاتا تو کافی تھا۔

اب ذرا تین عظیم محدثین جابر یزید اور جعفی کا حال بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

عن جابر بن یزید الجعفی قال حدثنی ابو جعفر بسبعین الف حدیث (رجال کشی صفحہ ۱۲۸)

"جابر جعفی کہتا ہے کہ میں نے امام باقر سے ستر ہزار حدیث تعلیم پائی"

یہ ہے اس کا علمی مرتبہ اب اس کی دیانت کا حال سنئے۔

عن زرارہ قال سئلت اباعبد اللہ عن احادیث جابر فقال ما رأیتہ عند ابی قط الا مرۃ واحدۃ وما دخل علی قط۔ (رجال کشی صفحہ ۱۲۶)

"زرارہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر سے جابر کی احادیث کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ یہ میرے باپ سے صرف ایک دفعہ ملا اور میرے پاس تو کبھی نہیں آیا"

نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ایک ملاقات میں ستر ہزار حدیثیں امام سے سن لیں اگر یہ ممکن نہیں تو معلوم ہوا خود گھڑ لی تھیں اور امام سے منسوب کر دی تھیں۔

علامہ مجلسی کے اس اصول کے پیش نظر جو حق الیقین کے صفحہ ۳۷ سے نقل کیا جا چکا ہے "کہ راویوں کی یہ جماعت کاذب ثابت ہو جائے تو شیعہ مذہب باطل ہے" راویوں کی یہ ساری جماعت کاذب بچوڑ امام کی زبانی ملعون، کافر اور یہودی ثابت ہو چکے ہیں تو بقول مجلسی شیعہ مذہب باطل ٹھیرا۔

اگر ان راویوں کو صادق تسلیم کریں تو ائمہ کا اپنا کوئی مذہب ہی ثابت نہیں ہو سکتا اور اگر کاذب سمجھیں اور یہ سمجھے بغیر چارہ نہیں کیونکہ ان کی کتب رجال یہی بتاتی ہیں تو شیعہ مذہب باطل ثابت ہوا۔ ان کی کتب رجال سے صرف ایک راوی بھی ثقہ اور صادق ثابت نہیں ہوتا۔ اور دین کے ماخذ یہی راوی ہیں نہ یہ ائمہ سے چلا نہ رسول کریم سے ماخوذ ہے۔